کتاب زندگی

مولانا وحید الدین خان

زندگی گزارنے کے رہنما اصول

دنیا میں جب بھی کسی کو کچھ ملتا ہے تو صلاحیت کی بنا پر ملتا ہے اسی طرح جب بھی کسی سے کچھ چھنتا ہے تو خود اپنی کوتاہی کی بنا پر چھنتا ہے۔ اس دنیا میں اگر کچھ لوگ محرومی کا شکار ہو جائیں تو انہیں چاہیے کہ وہ دوسروں کی شکایت کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کریں، بلکہ خود اپنے اندر اس کے اسباب تلاش کریں اور اس کے مطابق اپنی عملی جدوجہد کا نقشہ بنائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان کے سوا جو کائنات ہے وہ نہایت محکم قوانین پر چل رہی ہے۔ کائنات کی ہر چیز کا ایک ضابطہ ہے۔ وہ ہمیشہ اسی ضابطہ کی پیروی کرتی ہے۔ ہر چیز اس ضابطہ پر عمل کرتے ہوئے اپنی تکمیل کے مرحلہ تک پہنچتی ہے۔

اسی طرح انسانی زندگی کے لئے بھی قدرت کا مقرر کیا ہوا ضابطہ ہے۔ جو آدمی اس ضابطہ کی پیروی کرتا ہے۔ وہ اس دنیا میں کامیاب ہوتا ہے۔ جو آدمی اس مقرر ضابطہ سے انحراف کرتا ہے۔ وہ یہاں ناکام و نامراد ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس ضابطہ کی بنیادی دفعہ یہ ہے کہ انسانی دنیا کے نظام کو مقابلہ اور مسابقت کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو دوسرے کا لحاظ کرنا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو دوسرے آدمیوں سے مقابلہ کر کے اپنا ضروری حق وصول کرنا ہے۔

اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جب بھی کسی شخص یا قوم کو کچھ ملتا ہے تو وہ اپنی صلاحیت کی بنا پر ملتا ہے۔ اور اگر کسی سے کچھ چھنتا ہے تو اپنی کوتاہی کی بنا پر چھنتا ہے۔ اس لئے یہاں زندگی کی دوڑ میں اگر کوئی طبقہ محروم رہ جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ دوسروں کی شکایت کرنے کی بجائے خود اپنے اندر اس سبب کو تلاش کرے۔ جس نے اسے محرومی میں ڈال دیا۔

زیر نظر مجموعہ مختلف پہلوؤں سے اسی اصول فطرت کی تشریح ہے۔ اس کی ترتیب سادہ طور پر کمیت کے قاعدہ پر کی گئی ہے۔ پہلے ایک صفحہ والے مضامین، اس کے بعد دو صفحہ والے مضامین، اس کے بعد کئی صفحہ والے مضامین۔ اسی نسبت سے اس کو حسب ذیل تین ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے

صفحات حکمت — اوراق حکمت — مضامین حکمت

وحید الدین

۱۹ مارچ ۱۹۹۴

باب اول

صفحات حکمت

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

پختہ انسان

این الینڈرس (ann landers) نے پختگی کے بارہ میں ایک مضمون لکھا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: پختگی یہ ہے کہ آدمی غصہ پر قابو پالے، اور اختلافات کو تشدد اور تخریب کے بغیر حل کر سکے۔ پختگی برداشت کا نام ہے۔ یہ آمادگی کہ دیر طلب فائدہ کے لئے وقتی خوشی کو ترک کر دیا جائے۔

پختگی دراصل ثابت قدمی ہے۔ رکاوٹوں کے باوجود منصوبہ کی تکمیل کے لئے اپنی محنت جاری رکھنا۔ پختگی بے غرضی ہے۔ دوسروں کی ضرورتوں میں ان کے کام آنا۔ پختگی اس استعداد کا نام ہے کہ ناخوش گواری اور مایوسی کا سامنا کسی تلخی کے بغیر کیا جائے۔ پختگی انکساری ہے۔ ایک پختہ انسان یہ کہنے کے قابل ہوتا ہے کہ میں غلطی پر تھا۔ اور جب وہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔

تو وہ یہ نہیں کہتا کہ یہ بات میں نے تمہیں بتا دی تھی۔ پختگی کا مطلب ہے قابل اعتماد اور ایمان دار ہونا۔ اپنے وعدے کو ہر حال میں پورا کرنا۔ پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ ہم ان چیزوں کے ساتھ پر امن طور پر رہ سکیں۔ جن کو ہم بدل نہیں سکتے۔

پختہ انسان وہ ہے، جس میں مردانہ اوصاف پائے جائیں۔ جو حقیقت واقعہ کا اعتراف کرے۔ جو ردعمل سے اوپر اٹھ کر معاملہ کرے۔ جو اپنے جذبات کو قابو میں رکھ سکے۔ جس کے اندر ناخوشگواری کو تحمل کے ساتھ عبور کرنے کی صلاحیت ہو۔ جو لوہے کی طرح قابل اعتماد کردار کا حامل ہو۔

یہی پختگی انسانیت کا کمال ہے۔ جس انسان کے اندر یہ خصوصیات ہوں۔ وہی کامل انسان ہے۔ وہی انسانیت کے اعلیٰ درجے تک پہنچا ہوا ہے۔ ایسے ہی افراد زندگی میں کوئی حقیقی کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ اور یہی افراد ہیں جو کسی قوم کو ترقی اور کامیابی

کی طرف لے جاتے ہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

برتر حل

سوچنا(thinking)ہماری دنیا کا نا قابل فہم حد تک عجیب عمل ہے۔موجودہ زمانے میں اس پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ان تحقیقات نے انسان کے علم میں اضافہ کرنے سے زیادہ انسان کی حیرانگی میں اضافہ کیا ہے۔چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔

Dr Rapaport Toward a Theory of Thinking 1951

W.E.Vinacke,The PSYchology of Thinking,1952

F,C.Bartlett,Thinking,1958

Max Wertheimer,Productive Thinking,1959

ان تحقیقات کے ذریعے بے شمار معلومات سامنے آئی ہیں۔ایک بات یہ ہے کہ انسانی ذہن کے اندر ایک نہایت اہم عمل جاری رہتا ہے۔علمانفسیات اس کو ذہنی طوفان سے تعبیر کرتے ہیں۔یہ عمل اس وقت پیدا ہوتا ہے۔جب کہ ذہن کسی نئے چیلنج سے دوچار ہوتا ہے۔ایسے وقت میں وہ خود اپنی فطرت کے زور پر مسائل کے نئے حل تلاش کرنے لگتا ہے۔یہ عمل اس امکان کو بڑھا دیتا ہے۔کہ پیش آمدہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کچھ برتر حل آدمی کے سامنے آجائیں۔

A process called brainstorming has been offered as a method of facilitating the production of new solutions to problems...These unrestricted suggestions increase the probability that at least some superior solutions will emerge (18/357)

یہ ریسرچ بتاتی ہے کہ آدمی جب کسی بحرانی حالت سے دوچار ہوتا ہے۔ تو اس کے اندر چھپی ہوئی فطری صلاحیت کے تحت اس کے اندر ذہنی طوفان (brain storming) کی ایک کیفیت جاگ اٹھتی ہے۔ یہ طوفان اس کو اس قابل بنا دیتا ہے۔ کہ وہ پیش آمدہ مسئلہ کا ایک برتر حل (superior solution) دریافت کر لے۔ اور مسئلہ کا برتر حل معلوم ہو جانے کے بعد کامیابی اتنی ہی ممکن ہو جاتی ہے۔ جتنا شام کے بعد صبح کا آنا۔

اللہ کا یہ معاملہ کیسا عجیب ہے کہ اس نے مشکلات کو ہماری ترقی کا زینہ بنا دیا۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

تخلیقی صلاحیت

یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک تعلیم یافتہ ہونے کی پہچان کیا ہے۔ پروفیسر نے جواب دیا۔۔۔ جونہیں سے ہیں کی تخلیق کر سکے (The prsonwho can create thing out of nothing)

یہ تعریف نہایت صحیح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی آدمی کے تعلیم یافتہ اور باشعور ہونے کی سب سے زیادہ خاص پہچان یہ ہی ہے۔ کہ وہ کوئی نئی چیز دریافت کر سکے۔ بظاہر نہیں کے حالات میں وہ، ہے، کا واقعہ ظاہر کر سکے۔

اس خصوصیت کا تعلق زندگی کے ہر میدان سے ہے۔ خواہ علم کا میدان ہو یا تجارت کا۔ سماجی معاملات کی بات ہو یا قومی معاملات کی۔ غرض زندگی کے ہر شعبے میں وہ ہی شخص بڑی ترقی حاصل کرسکتا ہے۔ جو اس انسانی صلاحیت کا ثبوت دے سکے۔

اس دنیا میں آدمی کو خام معلومات سے اعلیٰ معرفت کی دریافت تک پہنچنا ہے۔ اس کو ناموافق حالات میں موافق پہلو کو دریافت کرنا ہے۔ اس کو دشمنوں کے اندر اپنے دوست کا پتہ لگانا ہے۔ اس کو ناکامیوں کے طوفان میں کامیابی کا سفر طے کرنا ہے۔ اس کو یہ ثبوت دینا ہے کہ وہ زندگی کے کھنڈر سے اپنے لئے ایک نیا شاندار محل تیار کر سکتا ہے۔

جو لوگ اس تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دیں۔ وہ ہی صحیح معنوں میں انسان کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اور جو لوگ اس تخلیقی صلاحیت کا ثبوت نہ دے سکیں۔ وہ باعتبار حقیقت حیوان ہیں، خواہ وہ بظاہر انسانوں جیسا لباس پہنے ہوئے ہوں۔

یہ تخلیق ہی کسی شخص یا قوم کا سب سے بڑا سرمایا ہے۔ یہ ہی چیز اس کو موجودہ دنیا میں اعلیٰ مقام عطا کرتی ہے۔ جو لوگ تخلیق کی صلاحیت کھو دیں۔ وہ کسی اور چیز کے ذریعے یہاں اپنا مقام نہیں پا سکتے۔ خواہ وہ کتنا ہی شور و غل کریں۔ خواہ ان کی فریاد وا

www.urdukitabain.blogspot.com

حتجاج کے الفاظ سے تمام زمین و آسمان گونج اٹھیں۔ وہ لاؤڈ سپیکروں کا شور تو برپا کر سکتے ہیں۔ مگر وہ استحکام کا خاموش قلعہ کبھی کھڑا نہیں کر سکتے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

محنت کے ذریعہ

باپسی سدھوا (Bapsi Sidhwa) ایک پارسی خاتون ہیں۔ وہ پاکستان (لاہور) کی رہنے والی ہیں۔ آج کل وہ ٹکساس (امریکہ) کی یونیورسٹی آف ہاسٹن میں استاد ہیں۔ انگریزی زبان میں ان کی لکھی ہوئی کتابیں (ناولیں) انٹرنیشنل سطح کے پبلشنگ اداروں میں چھپتی ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ باپسی سدھوا کی رسمی تعلیم بالکل نہیں ہوئی۔ وہ اپنے وطن لاہور کے ایک سکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ کہ ان کو پولیو کی بیماری ہو گئی۔ ان کے والدین نے ان کے لئے باضابطہ تعلیم کو ناممکن سمجھ کر ان کو سکول سے اٹھا لیا۔ اس کے بعد وہ ٹیوٹر کے ذریعے اپنے گھر پر پڑھنے لگیں۔ مگر ٹیوٹر کا سلسلہ بھی بہت زیادہ دن تک باقی نہ رہا۔

اب باپسی سدھوا کا شوق ان کا رہنما تھا۔ وہ خود سے پڑھنے لگیں۔ وہ ہر وقت انگریزی کتابیں پڑھتی رہتیں۔ اپنے الفاظ میں وہ کبھی نہ سیر ہونے والی قاری بن گئیں۔ آخر انھوں نے اپنی محنت سے یہ درجہ حاصل کر لیا کہ وہ انگریزی مضامین لکھنے لگیں۔ مگر دو سال تک یہ حال تھا کہ انہیں اپنے بھیجے ہوئے مضمون کے جواب میں صرف انکاری تحریریں (rejection slips) ملتی تھیں۔ ان کی پہلی کتاب کا مسودہ آٹھ سال تک ان کی الماری میں پڑا ہوا گرد آلود ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ان پر مایوسی کے دورے پڑنے لگے۔

آخر کار حالات بدلے۔ ان کے مضامین باہر کے میگزینوں میں چھپنے لگے۔ اب وہ عالمی سطح پر پڑھی جانے والی انگریزی رائٹر بن چکی ہیں۔ رسمی ڈگری نہ ہونے کے باوجود وہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں تخلیقی تحریر (creative writing) کا مضمون پڑھا رہی ہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲۵ فروری ۱۹۹۰)

حقیقت یہ ہے کہ تمام علوم محنت کی درس گاہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ تمام ترقیاں محنت کی قیمت دے کر حاصل ہوتی ہیں۔ اور محنت وہ چیز ہے جو ہر آدمی کو حاصل رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اس آدمی کو بھی جس کو بیماری نے معذور بنا دیا ہو۔ جو کالج اور یونیورسٹی کی ڈگری لینے میں ناکام ثابت ہوا ہو۔

محنت ایک ایسا سرمایا ہے جو کبھی کسی کے لئے ختم نہیں ہوتا۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

مقصدیت

دہلی میں ایک مسلم نوجوان تھا۔وہ غریب گھر میں پیدا ہوا۔اس کی باقاعدہ تعلیم بھی نہ ہوسکی ۔تاہم وہ تندرست اور باصلاحیت تھا۔جب وہ بڑا ہوا تو اس کو محسوس ہوا کہ ماحول میں اس کے لئے کوئی باعزت کام نہیں ہے۔آخر کار وہ دادا گیری کی راہ پر لگ گیا۔جھگڑا فساد اور لوٹ مار اس کا پیشہ بن گیا۔لوگ اس کو دادا کہنے لگے۔

چند سالوں بعد ایک شخص کو اس سے ہمدردی ہوئی۔اس نے اپنے پاس سے کچھ رقم قرض دے کر اس کو دوکان داری کرا دی۔جب وہ دکان میں بیٹھا اور اس کو نفع ملنے لگا تو اس کی تمام دلچسپیاں دکان کی طرف مائل ہوگئیں۔اس نے دادا گیری چھوڑ دی اور پوری طرح دکان کے کام میں مصروف ہوگیا۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔انھوں نے مقصدیت کھودی ہے۔جدید دنیا میں وہ ایک بے مقصد گروہ بن کر رہ گئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس آج منفی باتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔وہ شکایت اور احتجاج کا مجسمہ بن گئے ہیں۔چھوٹی ،چھوٹی باتوں پر وہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ان کی ہر نشست مجلس شکایت ہوتی ہے۔اور ان کا ہر جلسہ یوم احتجاج۔

اس صورت حال کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک با مقصد گروہ بنایا جائے اور یہ مقصد ایک ہی ہوسکتا ہے۔اور وہ دعوت ہے۔مسلمانوں کے اندر اگر داعیانہ مقصد پیدا کردیا جائے تو ان کی تمام کمزوریاں اپنے آپ دور ہو جائیں گی۔

وہ اپنے کرنے کا ایک اعلیٰ اور ربا مقصد کام پالیں گے ان کی بے مقصدیت اپنے آپ مقصدیت میں تبدیل ہو جائے گی۔اس کے بعد ان کے اندر کردار بھی آئے گا اور صبرو برداشت بھی۔وہ دوسروں سے نفرت کرنے کی بجائے محبت کرنے لگیں گے۔اس کے بعد ان کو وہ نظر حاصل ہو جائے گی۔جو تاریکی میں روشنی کا پہلو دیکھ لیتی ہے۔جو

www.urdukitabain.blogspot.com

کھونے میں پانے کا راز دریافت کرلیتی ہے۔

مقصدیت ہر قسم کی اصلاح کی جڑ ہے۔ بے مقصد آدمی کا دماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ آدمی کو با مقصد بنا دیں۔ اور اس کے بعد اپنے آپ اس کی ہر چیز درست ہو جائے گی۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بچ کر چلیے

ایک راستہ ہے اس میں کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ایک آدمی بے احتیاطی کے ساتھ اس راستہ میں گھس جاتا ہے۔اس کے جسم میں کانٹے چبھ جاتے ہیں۔کپڑا پھٹ جاتا ہے۔اپنی منزل پر پہنچنے میں اس کو تاخیر ہو جاتی ہے۔اس کا ذہنی سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔

اب وہ آدمی کیا کرے گا۔کیا وہ کانٹے کے خلاف ایک کانفرنس کرے گا۔کانٹے کے بارے میں دھواں دھار بیانات شائع کرے گا۔وہ اقوام متحدہ سے مطالبہ کرے گا کہ دنیا کے تمام درختوں سے کانٹے کا وجود ختم کر دیا جائے۔تاکہ آئندہ کوئی مسافر کانٹے کے مسئلہ سے دوچار نہ ہو۔

کوئی سنجیدہ اور باہوش انسان کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔اس کے برعکس وہ صرف یہ کرے گا۔کہ وہ اپنی نادانی کا احساس کرے گا۔وہ اپنے آپ سے کہے گا کہ تم کو اللہ تعالی نے جب دو آنکھیں دی تھیں۔تو تم نے کیوں ایسا نہ کیا کہ تم کانٹوں سے بچ کر چلتے۔تم اپنا دامن سمیٹ کر کانٹوں والے راستے سے نکل جاتے۔اس طرح تمہارا جسم بھی محفوظ رہتا اور تم کو اپنی منزل تک پہنچنے میں دیر بھی نہ لگتی۔

اللہ تعالی نے درختوں کی دنیا میں یہ مثال رکھی تھی۔تاکہ انسانوں کی دنیا میں سفر کرتے ہوئے اس سے سبق لیا جائے۔مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی اس آیت کو کبھی کسی نے نہیں پڑھا۔خدا کے اس پیغام کو سن کر کسی نے اس سے سبق نہیں لیا۔

آج کی دنیا میں آپ کو بے شمار ایسے لوگ ملیں گے۔جو انسانی کانٹوں کے درمیان بے احتیاطی کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔اور جب کانٹے ان کے جسم کے ساتھ لگ کر انہیں تکلیف پہنچاتے ہیں۔تو وہ ایک لمحہ سوچے بغیر خود کانٹوں کو برا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔وہ اپنی نادانی کو دوسروں کے خانہ میں ڈالنے کی بے فائدہ کوشش کرنے لگتے

ہیں۔

ایسے تمام لوگوں کو جاننا چاہیے کہ جس طرح درختوں کی دنیا سے کانٹے دار جھاڑیاں ختم نہیں کی جاسکتیں۔اسی طرح سماجی دنیا سے کانٹے دار انسان کبھی ختم نہیں ہونگے۔یہاں تک کہ قیامت آجائے۔اس دنیا میں محفوظ اور کامیاب زندگی کا راز کانٹے دار انسانوں سے بچ کر چلنا ہے۔اس کے سوا ہر دوسرا طریقہ صرف بربادی میں اضافہ کرنے والا ہے،اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

حکیمانہ طریقہ

زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو یہ فیصلہ لینا پڑتا ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے ۔ایسے مواقع پر فیصلہ لینے کی دو بنیادیں ہیں ۔ایک یہ کہ کیا درست ہے ،دوسرے یہ کہ کیا یہ ممکن ہے ۔:

1.what is right.

2.what is possible.

حکیمانہ طریقہ یہ ہے کہ ذاتی معاملہ میں آدمی یہ دیکھے کہ کیا درست ہے ۔اور جو طریقہ درست ہو اس کو اختیار کرے ۔مگر اجتماعی معاملہ کے لئے صحیح بات یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ممکن کیا ہے ۔اور جو چیز ممکن ہو اس کو اپنا لیا جائے ۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ذاتی معاملہ میں سارا مسئلہ صرف اپنی ذات کا ہوتا ہے ۔آپ کو اپنی ذات پر پورا اختیار رہے ۔اپنی ذات کو آپ جس طرف چاہیں موڑیں ۔اور اپنے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں ۔اس لئے آپ کو اپنی ذات کے معاملہ میں معیار پسند ہونا چاہیے ۔اور حتیٰ الامکان وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے ۔جو مذہب اور اخلاق کی رو سے مطلوب ہے ۔

مگر اجتماعی معاملہ میں آپ کی ذات کے ساتھ ایک اور فریق شامل ہو جاتا ہے ۔اس خارجی فریق پر آپ کو کوئی اختیار نہیں ۔آپ اس سے کہہ سکتے ہیں ۔مگر اس کو کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے ۔ایسی حالت میں عقلمندی کی بات یہ ہے کہ اجتماعی معاملہ میں ممکن کو دیکھا جائے ۔دو صورتوں میں سے جو صورت عملاً ممکن ہو اس پر اپنے آپ کو راضی کر لیا جائے ۔

ذاتی معاملہ میں درست پر چلنے سے زندگی کا سفر رکتا نہیں ۔وہ برابر جاری رہتا ہے ۔مگر اجتماعی معاملہ میں ایسا کیا جائے تو فریق ثانی کی مخالفت فوراً آپ کے سفر کو روک دیتی

ہے۔اب سفر کو ملتوی کر کے ساری طاقت نزاع کے محاذ پر خرچ ہونے لگتی ہے۔اس لئے مفید اور نتیجہ خیز طریقہ یہ ہے کہ فریق ثانی کے مطالبہ کی رعایت کرتے ہوئے عمل کی جو ممکن صورت مل رہی ہے۔اس کو اختیار کر لیا جائے۔حال کو مستقبل کے حوالے کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا جائے۔

یہ ہی اس دنیا میں زندگی گزارنے کا حکیمانہ طریقہ ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

تعمیر شعور

دوسری جنگ عظیم تک امریکہ ساری دنیا میں موٹر کار کا سب سے بڑا تاجر تھا۔ ہر آدمی کے ذہن پر رولس رائس کار کی عظمت چھائی ہوئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی کی ووکس ویگن کا زمانہ آیا۔ ۱۹۷۰ تک ۴۰ ملکوں میں ۱۶ ملین سے زیادہ ووکس ویگن گاڑیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ مگر اب جاپانی کاروں کا زمانہ ہے۔ آج ٹویوٹا (نہ کہ جنرل موٹرس) کاروں کی دنیا کی بادشاہ ہے۔ امریکہ کی سڑکوں پر آج جو کاریں دوڑتی ہیں۔ ان میں ۳۵ فی صد کاریں جاپان کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔

آج دنیا بھر میں استعمال ہونے والا الیکٹرانک کا سامان ۸۰ فی صد جاپان کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ امریکہ کا اپالو دوئم جب چاند پر گیا تو اس کے اندر رکھنے کے لئے ایک بہت چھوٹے ٹیپ ریکارڈر (کیسٹ ریکارڈر) کی ضرورت تھی۔ اتنا چھوٹا اور بالکل صحیح کام کرنے والا ریکارڈر صرف جاپان فراہم کر سکتا تھا۔ چنانچہ اپالو دوم کے ساتھ جاپانی ساخت کا ریکارڈر رکھ کر اسے چاند پر روانہ کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم تک جاپان کا یہ حال تھا کہ (Made in japan) کا لفظ جس سامان پر لکھا ہوا ہو اس کے متعلق پیشگی طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ سستا اور ناقابل اعتماد ہوگا۔ جاپانی سامان کی تصویر اتنی گھٹیا تھی کہ مغربی ملکوں کے تاجر جاپانی ساخت کا سامان اپنی دکان پر رکھنا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ پھر صرف چالیس سال کے اندر جاپان نے کس طرح اتنی انقلابی ترقی حاصل کر لی۔ ایک امریکی عالم ولیم اویوچی (William o ,o uchi) کے الفاظ میں اس کا راز اپنے کارکنوں کے اندر اس کا داعیہ پیدا کرنا ہے۔ (Motivation of The employees) پیدا کرنا ہے جاپانیوں نے اپنے یہاں ابتدائی تعلیم کا انتہائی اعلیٰ معیار قائم کیا۔ انھوں نے ابتدائی معلموں کو اعلیٰ تنخواہ اور پروفیسروں والا اعزاز دینا شروع کیا۔ اور اس

طرح اعلیٰ ترین صلاحیت کے اساتذہ کو اپنی نئی نسل کی تعلیم وتربیت پر لگا دیا۔انھوں نے اپنے افراد میں نہایت گہرائی کے ساتھ یہ شعور پیدا کیا کہ صنعت میں اصل چیز معیار (quailty) ہے جدید جاپان میں ہر جگہ کوالٹی کنٹرول سرکل قائم ہیں۔۱۹۸۰ تک ایک لاکھ کوالٹی کنٹرول رجسٹرڈ سرکل ہو چکے تھے۔اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ ایک ملین غیر رجسٹرڈ کوالٹی سرکل بھی جاپان میں موجود ہیں۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کامیابی کیسے

فروری ۱۹۹۲ میں دہلی میں بڑے پیانہ پر کتابوں کی نمائش (بک فیر) لگائی گئی۔ ۷ فروری کو میں بھی اس کو دیکھنے کے لئے گیا۔ مختلف سٹال دیکھتے ہوئے ایک جگہ پہنچا تو اس کے بورڈ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ بورڈ کے الفاظ یہ تھے: تھنک انکارپورٹیڈ (think incorported)

یہ اس بک فیر میں نیا اسٹال تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو سوچنے کا آرٹ بتایا جائے۔ کیونکہ غلط سوچ آدمی کو ناکامی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور صحیح سوچ کامیابی کی طرف۔

یہاں مسٹر پرمود کمار تبرا کی ایک خوبصورت چھپی ہوئی انگریزی کتاب تھی۔ اس کا نام مینجمنٹ تھاٹس تھا (managment Thoughts) اس کے ۳۱۵ صفحات تھے۔ اور اس میں ۱۳۶۰ مفید اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک قول یہ تھا کہ ہمارا ذہنی رویہ ہماری بلندی کا تعین کرتا ہے۔ اسی طرح اس سٹال پر کئی تعمیری کتبے تھے۔ ایک کتبے میں اوپر ماچس کی ایک تیلی دکھائی گئی تھی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا ماچس کی تیلی کا ایک سر ہوتا ہے۔ مگر اس میں دماغ نہیں ہوتا۔ اس لئے جب بھی کوئی رگڑ ہوتی ہے وہ فوراً جل اٹھتی ہے۔ آیئے ہم ماچس کی ایک چھوٹی تیلی سے سبق لیں۔ ہم اور آپ سر رکھتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ دماغ بھی۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم اشتعال پر بھڑک نہ اٹھیں۔:

ایک انسان وہ ہے جو بھڑ کنے والی بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ فوری جذبہ کے تحت عمل کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ایسا آدمی ہمیشہ ناکام رہے گا۔ دوسرا انسان وہ ہے جو بھڑ کنے والی بات پر بھی نہیں بھڑکتا۔ وہ ٹھنڈے دماغ سے سوچتا ہے۔ پھر اپنا عمل کرتا ہے۔ ایسا آدمی ہمیشہ کامیاب رہے گا۔ دوسرا انسان انسان ہے اور پہلا صرف

ماچس کی ایک تیلی۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ایک نصیحت

بنجمین فرینکلن ایک امریکی مفکر تھا۔وہ ۱۷۰۶ میں پیدا ہوا۔اور ۱۷۹۰ میں اسکی وفات ہوئی۔اس کا ایک قول ہے کہ۔۔۔نکاح سے پہلے اپنی آنکھیں خوب کھلی رکھو مگر نکاح کے بعد اپنی آدھی آنکھ بند کرلو۔

یعنی نکاح کرنے سے پہلے اپنے جوڑہ کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرو۔مگر جب نکاح ہو جائے تو اجمال پر اکتفا کرو۔اسی بات کو کسی نے سادہ طور پر ان الفاظ میں کہا ہے کہ نکاح سے پہلے جانچو،اور نکاح کے بعد نبھاؤ۔

کوئی مرد یا عورت پرفیکٹ نہیں۔کوئی بھی کامل یا معیاری نہیں۔اس لئے رشتہ سے پہلے تحقیق تو ضرور کرنی چاہیے۔مگر رشتہ کے بعد یہ کرنا چاہیے کہ اپنے رفیق حیات کی خوبیوں کو دیکھا جائے اور خامیوں سے صرف نظر کرلیا جائے۔

معیار کا حصول موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔مزید یہ کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ جس چیز کو ایک فریق معیاری سمجھے۔وہ دوسرے فریق کے نزدیک بھی معیاری ہو۔اس بنا پر خواہ کوئی کتنا ہی صحیح ہو،وہ دوسرے فریق کو آخری حد تک مطمئن نہیں کر سکے گا۔دونوں فریقوں کو ایک دوسرے میں کچھ نہ کچھ کوتاہیاں نظر آئیں گی۔

اب ایک شکل یہ ہے کہ دورسے فریق کی کوتاہی سے لڑکر اس سے علحدگی اختیار کرلی جائے۔مگر مشکل یہ ہے کہ ایک تعلق کی علحدگی کے بعد دوسرا تعلق جو قائم کیا جائے گا۔اس میں بھی جلد ہی وہی یا کوئی دوسری خامی ظاہر ہو جائے گی۔اور اگر دوسرے رشتہ کو ختم کرکے تیسرا یا چوتھا رشتہ قائم کیا جائے تو اس میں بھی۔ایسی حالت میں موافقت کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ہر مرد یا عورت میں خوبی بھی ہوتی ہے اور کوتاہی بھی۔ضرورت ہے کہ خوبی کو دیکھا جائے اور کوتاہی کو برداشت کیا جائے۔عملی طور پر یہی ایک ممکن طریقہ ہے۔اس کے سوا کوئی اور طریقہ اس دنیا میں قابل عمل نہیں۔

www.urdukitabain.blogspot.com

قیمت کا مسئلہ

مولانا فرید الوحیدی جدہ میں رہتے ہیں۔انھوں نے کیم نومبر ۱۹۹۱ کی ملاقات میں ایک بہت بامعنی مقولہ سنایا۔انھوں نے کہا کہ ایک شخص جو مونٹ ایورسٹ کو فتح کرنا چاہتا ہے۔وہ کبھی جوتوں کی قیمت کی گنتی نہیں کرتا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے چھوٹا مقصد ہو تو معمولی کوشش سے آپ اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔لیکن اگر آپ کوئی بڑا مقصد اپنے لئے منتخب کریں تو آپ کو یہ جاننا ہوگا۔کہ بڑا مقصد بڑی قیمت بھی مانگتا ہے۔جو شخص بڑا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہو۔اس کو بڑی قیمت دینے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیے۔

بڑی کامیابی کسی کی اجارہ داری نہیں۔ہر آدمی بڑی کامیابی تک پہنچ سکتا ہے۔اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں۔کہ بہت کم لوگ بڑی کامیابی تک پہنچ پاتے ہیں۔اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ بڑی کامیابی کی قیمت ادا نہیں کرتے

بازار میں کم قیمت پر کم چیز ملتی ہے۔اور زیادہ قیمت پر زیادہ چیز۔۔یہی زندگی کا اصول بھی ہے۔زندگی کا قانون ایک لفظ میں یہ ہے کہ۔۔جتنا دینا اتنا ہی پانا،نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔

قیمت کا مطلب لڑنا یا خون بہانا نہیں ہے۔اس کا تعلق مال سے بھی نہیں ہے۔اس کا تعلق سب سے زیادہ نفسیات سے ہے۔اس دنیا میں سب سے بڑی قیمت وہ ہے۔جو نفسیات کی سطح پر دی جاتی ہے۔نفسیاتی قیمت سے مراد ہے: ناگواریوں کو برداشت کرنا۔اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہونا۔لوگوں کے ناروا سلوک کے باوجود اپنی طرف سے بدسلوکی نہ کرنا۔مایوسی کے حالات میں بھی حوصلہ نہ کھونا۔نقصان پیش آنے کے باوجود اپنی امید قائم رکھنا۔تاریک حالات میں بھی روشنی کی کرن دیکھ لینا۔

سب سے بڑی قربانی یہ ہے کہ آدمی کے سینہ میں غصہ اور انتقام کی آگ بھڑکے۔مگر وہ

www.urdukitabain.blogspot.com

سینہ کے اندر ہی اس کو بجھا دے۔آدمی کو کسی سے تکلیف پہنچے مگر وہ پھر بھی اس کے بارے میں بدگمان نہ ہو۔آدمی کو منفی حالات سے سابقہ پیش آئے۔اس کے باوجود وہ مثبت نفسیات پر قائم رہے۔وہ حالات سے اوپر اٹھ کر جیے نہ کہ حالات کے اندر۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ناکامی، کامیابی

امریکہ کی ترقی کا راز سادہ سے الفاظ میں چھپا ہوا ہے، وہ لفظ ریسرچ (تحقیق) ہے ۔وہاں ہر چیز پر ریسرچ ہوتی رہتی ہے۔مثلاً بہت سے لوگوں نے اس پر ریسرچ کی ہے کہ کامیابی اور ناکامی کیا ہے۔اور ناکامی کو کس طرح دوبارہ کامیابی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔اس سلسلہ میں چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔

carole hyatt,when ,smart,people fail

Rabbi harold Kushner.when bad things Happen to good people

Charles Garfield peak Performers:The new Heroesof american business

harveyMackay.Swim with sharks without Being Eaten Alive

ان کتابوں میں اپنے موضوع پر قیمتی مواد جمع کیا گیا ہے۔یہاں ہم صرف دو باتیں نقل کر رہے ہیں۔ایک بات یہ کہ اس دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی آدمی ہمیشہ کے لئے ناکامی سے محفوظ (failer proof) زندگی حاصل کر سکے۔یہاں بہر حال آدمی کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔آدمی کو چاہیے کہ وہ ہر ناکامی کو اپنے لئے سبق کے طور پر استعمال کرے۔اکثر کامیاب لوگوں کی کامیابی کا راز یہ ملتا ہے کہ جب وہ ناکام ہوئے تو انھوں نے اپنی ناکامی کو آخری لفظ نہیں سمجھا:

دوسری بات یہ کہ ناکامی کی طرح کامیابی بھی ایک مسئلہ ہے۔مسلسل کامیابی آدمی کے اندر گھمنڈ پیدا کر دیتی ہے۔جو خود ناکامی کا ایک مہلک سبب ہے۔ایک کامیاب تاجر گلن ارلی نے کہا کہ میں کامیابی پر مغرور بننے کا تحمل نہیں کر سکتا۔اس لئے میں ہمیشہ

www.urdukitabain.blogspot.com

اپنی تجارت کو بڑھانے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔

کامیابی اور ناکامی کوئی پر اسرار چیز نہیں۔ دونوں معلوم اسباب کے تحت پیش آنے والے واقعات ہیں۔ ان اسباب کو جانیے۔ اور اس کے بعد آپ کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کاروباری استقلال

خوش حال طبقہ ناشتہ میں یا چائے کے ساتھ اناج کی بنی ہوئی ہلکی چیزیں لینا پسند کرتا ہے۔اسی کی ایک صورت وہ ہلکی خوراک ہے جس کو کارن فلیک کہا جاتا ہے۔اس کی مختلف قسمیں بازار میں فروخت ہوتی ہیں۔

بہت سی فرموں نے مختلف ناموں سے کارن فلیک بنائے۔ان کے مزہ میں طرح طرح کا تنوع پیدا کیا۔مگر ہندوستانی مارکیٹ میں وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔حالاں کہ انھوں نے اشتہار پر کافی رقمیں خرچ کیں۔

اس وقت ہندوستان کے بازار میں صرف دو فرموں کے بنائے ہوئے کارن فلیک زیادہ چل رہے ہیں۔ایک ہندوستان ویجیٹیبلس آئلس کارپوریشن (Hvoc) کا اور دوسرے موہن میکنس لمیٹڈ کا۔یہ دونوں فرمیں سالانہ ایک ہزار ٹن کارن فلیک فروخت کرتی ہیں۔جن کی قیمت تین کروڑ پچاس لاکھ ہوتی ہے۔حالانکہ یہ دونوں فرمیں اشتہار پر سرے سے کوئی رقم خرچ نہیں کرتیں۔ان کا تیار کیا ہوا کارن فلیک بغیر کسی اشتہار کے فروخت ہوتا ہے۔(ٹائمس اف انڈیا ۹ جون ۱۹۹۰)

اس فرق کی وجہ کیا ہے۔اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دوسری فرموں کی کوئی تاریخ نہیں۔انھوں نے کسی نام سے کارن فلیک کی ایک قسم بنائی۔وہ بازار میں نہیں چلی تو انھوں نے دوسری قسم بنا ڈالی۔یا سرے سے اس کو بنانے کا کام چھوڑ کر کوئی دوسرا کام شروع کر دیا۔اس کے برعکس مذکورہ دونوں کامیاب فرموں کی صنعت کے پیچھے ۲۰ سال کی تاریخ ہے۔وہ بیس سال سے متواتر ایک ہی قسم کا کارن فلیک بنا رہی ہے۔۲۰ سالہ تاریخ نے ان کو لوگوں کی نظروں میں معلوم اور مسلم بنا دیا ہے۔کسی آدمی کو کارن فلیک لینا ہوتا ہے۔تو ان کے ذہن میں پہلے سے اس کا نام موجود ہوتا ہے۔اور وہ بازار جا کر اپنے اس معلوم کارن فلیک کو خرید لیتے ہیں۔

www.urdukitabain.blogspot.com

یہ ہی کاروبار میں ترقی کا راز ہے۔کاروبار میں استقلال کی حیثیت لازمی شرط ہے ۔آپ کاروبار کر کے اس کو چھوڑتے یا بدلتے رہیں۔تو آپ کاروبار میں کبھی کامیاب نہیں ہونگے۔اور اگر آپ کاروبار کر کے اس پر جمے رہیں۔کسی بھی دشواری کی وجہ سے اس کو نہ چھوڑیں۔تو ۲۰ سال گزرنے کے بعد آپ لازماً کامیابی کی اگلی منزل تک پہنچ چکے ہونگے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

عمل نہ کہ ردعمل

امریکہ کی کمپنی آئی، بی، ایم (I.B.M) کمپوٹر کے میدان میں اتنی آگے تھی۔ کہ اس کو کمپیوٹر دیو کہا جاتا تھا (Computer gaint) کہا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ چند سال پہلے اس کے افسروں نے جاپان کی کمپوٹر بنانے والی کمپنیوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ کہ آئی۔ بی۔ ایم اگر چھینک دے تو جاپان کے کمپوٹر بنانے والے ہوا میں اڑ جائیں گے۔

اگر ہندوستان میں کوئی ہندو مسلمانوں کے خلاف ایسی بات کہہ دیتو مسلمانوں کے تمام سطحی لیڈر اور ان کے تیسرے درجے کے اخبارات فوراً احتجاج کریں گے۔ کہ مسلمانوں کے جذبات مجروح کیے جا رہے ہیں۔ مگر انتظامیہ اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکارہ ثابت ہوئی ہے۔ مسلم عوام اس اشتعال انگیزی پر مشتعل ہو کر آمادہ پیکار ہو جائیں گے۔ اور اس کے بعد فرقہ وارنہ فساد ہوگا۔ جس کے بعد اس ملک کے مسلمان کچھ اور پیچھے چلے جائیں گے۔

مگر جاپانی صنعت کاروں نے اس اشتعال انگیزی پر کسی غصہ کا اظہار نہیں کیا۔ وہ ہمہ تن صرف اپنے کمپیوٹر کا معیار اونچا کرنے میں لگ گئے۔ یہاں تک کہ (ٹائم ۷ ستمبر ۱۹۹۰ کے مطابق) جاپان کمپیوٹر انڈسٹری میں ساری دنیا سے آگے بڑھ گئے۔ جاپان اس معاملہ میں آج اس پوزیشن میں ہے کہ جاپانی کمپنی فوجسٹی نے کہا ہے کہ اس کے نئے زیادہ بڑے کمپوٹر ایک سیکنڈ میں ۶۰۰ ملین ہدایات کی تعمیل کر سکتے ہیں۔ جب کہ امریکی کمپنی آئی۔ بی، ایم کا اچھے سے اچھا کمپوٹر صرف ۲۱۰ ملین فی سیکنڈ کی رفتار سے تعمیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اشتعال انگیزی پر مشتعل ہو جانے کا نام ردعمل ہے۔ اور اشتعال انگیزی کو نظر انداز کر کے اپنے تعمیر و استحکام کے منصوبہ میں لگنے کا نام عمل ہے۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ

www.urdukitabain.blogspot.com

عمل کا ثبوت دینے والے لوگ ترقی کریں۔ اور ردعمل میں مصروف لوگ برباد ہو کر رہ جائیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

غصہ نہ دلاؤ

۲۹ مئی ۱۹۹۰ کو دہلی کے اخبارات میں ایک سبق آموز خبر تھی ۔سدرشن پارک (موتی نگر) کی جھگیوں میں ایک شخص رہتا ہے اس کا نام اننت رام ہے ۔عمر ۳۵ سال ہے ۔وہ شراب کا عادی ہے ۔اس کے پاس شراب کے لئے پیسہ نہیں تھا۔اس نے اپنی بیوی سے پیسہ مانگا۔بیوی نے شراب کے لئے پیسہ دینے سے انکار کر دیا۔اس پر میاں اور بیوی میں تکرار ہوئی ۔

اس کے بعد ٹمس آف انڈیا (۲۹ مئی ۱۹۹۰) کے الفاظ میں جو کچھ ہوا وہ یہ تھا۔مجرم جو کہ شراب کا عادی تھا۔اس وقت غصہ ہو گیا جب اس کی بیوی نے اسے مطلوبہ رقم نہ دی ۔غصہ سے بے قابو ہو کر اس نے اپنے دو سال کے بچے ارجن کو لیا۔اور اس کو اٹھا، اٹھا کر کئی بار زمین پر پٹکا۔اس کے نتیجے میں اس کا بچہ اسی وقت مر گیا۔

جب آدمی غصہ میں ہو تو اس قت وہ شیطان کے قبضہ میں ہوتا ہے ۔اس وقت وہ کوئی بھی غیر انسانی حرکت کر سکتا ہے ۔حتیٰ کہ خود اپنے بیٹے کو بے رحمانہ طور پر ہلاک کر سکتا ہے۔

یہ ایک ایسی کمزوری ہے ۔جو ہر آدمی کے اندر موجود ہے ۔ایسی حالت میں سماج کے اندر محفوظ اور کامیاب زندگی حاصل کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو غصہ دلانے سے بچے ۔وہ خوش تدبیری کے ذریعہ اس بات کی کوشش کرے ۔کہ وہ دوسرے کو اس حالت تک نہ پہنچنے دے ۔

جب کہ وہ شیطان کا معمول بن جائے ۔اور اس مجنونانہ کاروائی پر اتر آئے ۔جس کی ایک مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے ۔

غصہ اور انتقام کی برائی کا تعلق کسی قوم سے نہیں ۔وہ ہر انسان کے مزاج میں شامل ہے ۔خواہ وہ کسی بھی قوم یا کسی بھی ملک سے تعلق رکھتا ہو۔غصہ اور انتقام کو انسانی مسئلہ کے

طور پر لینا چاہیے۔ نہ کہ فرقہ یا قوم کے مسئلہ کے طور پر۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

اختیار اور بے اختیاری

مشہور سائنسدان آئن سٹائن نے طبیعاتی دنیا کے اصول کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا ہے۔ توانائی نہ پیدا کی جاسکتی ہے۔ اور نہ ختم کی جاسکتی ہے۔:

یہ واقعہ خالق کی قدرت کاملہ کا ثبوت ہے۔ انسان موجودہ دنیا کو صرف استعمال کر سکتا ہے۔ وہ اس کو بدلنے یا مٹانے پر قادر نہیں۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے۔ کہ موجودہ دنیا میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ انسان اس دنیا میں مالک کی حیثیت سے نہیں ہے۔ بلکہ صرف تابع کی حیثیت سے ہے۔ اسی صورت حال کو مذہب کی اصطلاح میں امتحان کہا جاتا ہے۔ انسان دنیا میں صرف اس لئے آتا ہے۔ تاکہ وہ محدود مدت میں یہاں رہ کر اپنے امتحان کا پرچہ پورا کرے۔ اس کے بعد وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ اس سے زیادہ اور کسی چیز کا اس کو مطلق اختیار نہیں۔

بعض انسان دنیا کے حالات سے مایوس ہوکر خودکشی کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں اس طرح وہ خود کو ختم یا معدوم کر رہے ہیں۔ مگر ایسا ہونا ممکن نہیں۔ جس طرح دنیا کی اس توانائی کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ جو مادہ کے روپ میں ظاہر ہوئی ہے۔ اسی طرح یہاں اس توانائی کو مٹانا بھی ممکن نہیں۔ جو انسان کی صورت میں متشکل ہوتی ہے۔ انسان کے اختیار میں خودکشی ہے۔ مگر انسان کے اختیار میں معدومیت نہیں۔ یہ صورت حال علامتی طور پر بتاتی ہے۔ کہ انسان کا معاملہ اس دنیا میں کیا ہے۔

انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حقیقت واقعہ کا انکار کردے۔ مگر حقیقت واقع کو بدلنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ انسان کو یہ اختیار ہے کہ وہ سرکشی کرے۔ مگر سرکشی کے انجام سے اپنے آپ کو بچانا اس کے لئے ممکن نہیں۔ انسان کو اختیار ہے کہ وہ اخلاقی پابندی کو قبول نہ کرے۔ مگر اخلاق کی مطلوبیت کو کائنات سے حذف کرنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ انسان کو یہ اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے مگر اس کو یہ اختیار نہیں کہ اپنے چاہنے

ہی کو وہ اس معیار یا صول کی حیثیت دے دے ۔ جس کے مطابق بالآخر تمام انسانوں کا فیصلہ کیا جانے والا ہے ۔

انسان اس دنیا میں آزاد ہے ۔ مگر اس کی آزادی محدود ہے نہ کہ لامحدود ۔

اپنی کمزوری

رابرٹ امیان (Robert emmiyan) روس کا مشہور کھلاڑی ہے۔وہ لمبی کود کا چمپین (Top long .jumper) سمجھا جاتا ہے۔وہ ۱۵ فروری ۱۹۶۵ کو پیدا ہوا۔اور عالمی مقابلوں میں گولڈ میڈل جیت کر غیر معمولی شہرت حاصل کی۔

ایک ہندوستانی جرنلسٹ مسٹر دی کرشنا سوامی نے رابرٹ امیان کا مفصل انٹرویو لیا۔یہ انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (۵ اپریل ۱۹۸۸) میں شائع ہوا۔مسٹر کرشنا سوامی نے روسی چمپین سے پوچھا کہ بین الاقوامی کھیل میں جب آپ شرکت کرتے ہیں۔تو اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے آپ کیا کرتے ہیں۔رابرٹ امیان نے جواب دیا:

سب سے اہم بات اپنی کمزوریوں کو دور کرنا ہے۔جو کہ میری کارکردگی کو اچھا بنانے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔میں اور میرے استاد دونوں جانتے ہیں کہ میرے اندر محفوظ صلاحیتیں ہیں۔جن کو ہمیں استعمال میں لانا ہے۔

رابرٹ امیان نے کھیل میں جو کامیابی کا راز بتایا ہے۔وہی وسیع تر زندگی میں بھی کامیابی کا راز ہے۔زندگی کے مقابلے میں جب بھی کوئی شخص ناکام ہوتا ہے تو وہ خود اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ناکام ہوتا ہے۔اپنی داخلی کمزوریوں کو جاننا اور ان کو دور کرتے ہوئے زیادہ بہتر تیاری کے ساتھ میدان عمل میں داخل ہونا۔یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔موجودہ دنیا میں جو شخص بھی کامیاب ہوتا ہے۔وہ اسی شرط کو پورا کر کے کامیاب ہوتا ہے۔اور جو شخص ناکام ہوتا ہے۔وہ اسی لئے ناکام ہوتا ہے۔کہ وہ اس شرط کو پورا کرنے میں کوتاہ ثابت ہوا تھا۔

ناکام وہ ہے جو اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال میں ناکام رہے۔اور کامیاب وہ ہے جو اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال میں کامیاب ثابت ہو۔

سارا خون

پروفیسر پال ڈیراک (paul Dirac) ۱۹۰۲ میں پیدا ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۸۴ میں انھوں نے ۸۲ سال کی عمر میں فلوریڈا میں وفات پائی۔ وہ جدید دور میں نیوٹن اور آئن سٹائن کے بعد سب سے زیادہ ممتاز سائنسدان سمجھے جاتے ہیں۔ ان کو نوبل انعام اور دوسرے بہت سے اعزازات حاصل ہوئے۔

پال ڈیراک کے نام کے ساتھ کوانٹم میکانیکل تھیوری منسوب ہے۔ یہ سائنسی نظریہ ایٹم کے انتہائی چھوٹے ذرات سے بحث کرتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے انٹی میٹر کی پیشین گوئی کی۔ جو بعد کو مزید تحقیقات سے ثابت ہو گیا۔ چنانچہ گارڈین (۴ نومبر ۱۹۸۴) نے پال ڈیراک پر مضمون شائع کرتے ہوئے اس کی سرخی حسب ذیل الفاظ میں قائم کی ہے۔

(prorpht of the Anti universe)

پال ڈیراک نے ایٹم میں پہلا انٹی پارٹیکل دریافت کیا۔ جس کو پازیٹران کہا جاتا ہے۔ اس دریافت نے نیوکلیر فزکس میں ایک انقلاب برپا کر دیا

لوگ جب پال ڈیراک سے پوچھتے کہ آپ نے تحت ایٹم مادہ کی نوعیت کے بارے میں اپنا چونکا دینے والا نظریہ کیسے دریافت کیا تو وہ بتاتے کہ وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں اس طرح فرش پر لیٹ جاتے تھے کہ ان کا پاؤں اوپر رہتا۔ تا کہ خون ان کے دماغ کی طرف دوڑے، بظاہر یہ ایک لطیفہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بڑا فکری کام وہ ہی شخص کر پاتا ہے۔ جو اپنے سارے جسم کا خون اپنے دماغ میں سمیٹ دے

بیشتر لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوت کو تقسیم کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک مرکز پر یکسو نہیں کرتے۔ اسی لئے وہ ادھوری زندگی گزار کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ ہر کام آدمی سے اس کی پوری قوت مانگتا ہے۔ وہ ہی شخص بڑی

کامیابی حاصل کرتا ہے، جو اپنی پوری قوت کو ایک کام میں لگا دے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سبب اپنے اندر

مارٹن لوتھر کنگ(Martin luher king,j.r) کا قول ہے کہ کوئی شخص تمہاری پیٹھ پر سواری نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ جھکی ہوئی نہ ہو۔

یہ قول تمثیل کی زبان میں زندگی کی ایک حقیقت بیان کر رہا ہے۔ آپ بالکل سیدھے کھڑے ہوئے ہوں۔ تو کسی شخص کو یہ موقع نہیں ملے گا۔ کہ وہ کود کر آپ کی پیٹھ پر بیٹھ جائے۔ کسی شخص کو یہ موقع صرف اس وقت ملتا ہے۔ جب کہ آپ کی پیٹھ جھک جائے۔ جھکی ہوئی پیٹھ پر سواری ممکن ہے نہ کہ سیدھی تنی ہوئی پیٹھ پر۔

یہی معاملہ زندگی کا ہے۔ اس دنیا میں مغلوبیت دراصل اپنی کمزوری کی قیمت ہے۔ کوئی شخص آپ پر قابو صرف اس وقت پاتا ہے۔ جب کہ آپ کمزور ہو کر اس کو اپنے اوپر قابو پانے کا موقع دیدیں۔ اس لئے عقل اور حقیقت پسندی کا تقاضہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص آپ پر غالب ہوتا ہوا نظر آئے تو سب سے پہلے اپنے آپ پر غور کر کے اپنی اس کمزوری کو دور کیجیے۔ جس نے دوسرے شخص کو یہ موقع دیا کہ وہ اس کو استعمال کر کے آپ کے اوپر غلبہ حاصل کرے۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں احد کی جو لڑائی ہوئی اس میں مسلمان ابتداً جیت رہے تھے۔ مگر ان کی جیت ہار میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی وجہ خود مسلمانوں کے ایک گروہ کی غلطی تھی۔ چنانچہ قرآن میں جب اس واقعہ پر تبصرہ نازل ہوا تو فریق ثانی کے ظلم و سرکشی پر کچھ نہیں کہا گیا۔ قرآن کے تبصرہ (آل عمران ۱۵۲) میں ساری تنبیہہ صرف مسلمانوں کو کی گئی۔ تاکہ مسلمانوں کے اندر اپنی کوتاہی کا شدید احساس پیدا ہو۔ وہ اپنی کوتاہی کی اصلاح کے ذریعہ اس بات کو ناممکن بنا دیں۔ کہ آئندہ کوئی شخص ان کے خلاف کاروائی کر کے۔ ان کے اوپر کامیابی کی امید کر سکے۔ آدمی جب بھی کسی دوسرے کے مقابلے میں ہارتا ہے تو وہ اپنی ذاتی کمی کی بنا پر ہارتا ہے۔ اپنی ذاتی کمی کو جان کر اسے دور

www.urdukitabain.blogspot.com

کیجیے۔اوراس کے بعد آپ کو نہ کسی کے خلاف فریاد کی ضرورت ہوگی اور نہ احتجاج کی

۔

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

اپنی غلطی

ایک صاحب کا حال مجھے معلوم ہے ۔وہ نہایت تندرست تھے ۔اللہ تعالیٰ نے انھیں اچھا ذہن عطا کیا تھا۔وہ اپنی زندگی میں کامیاب نہ ہو سکے ۔انھوں نے جو کام بھی کیا وہ ناکامی پر ختم ہوتا رہا۔یہاں تک کہ ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔اسی حال میں وہ سڑک پر ایک جیپ سے ٹکرا گئے ۔اس حادثہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی ناکامی کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو کامیابی کے راستے میں استعمال نہیں کیا۔اپنی ناکامی کا ذمہ دار وہ ہمیشہ دوسروں کو قرار دیا کرتے تھے ۔مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی اپنی ذات کے سوا کوئی بھی شخص نہیں ۔جس کو واقعی طور پر ان کی ناکامی کا ذمہ دار بتایا جا سکے ۔

انھوں نے تعلیم کے لئے سکول میں داخلہ لیا ۔مگر وہ میٹرک تک پہنچے تھے کہ انھیں پالیٹکس سے دل چسپی ہو گئی ۔چنانچہ وہ دسویں درجہ کے امتحان میں فیل ہو گئے ۔اس کے بعد ان کی تعلیم آگے جاری نہ رہ سکی ۔انھوں نے ایک دکان شروع کی ۔مگر اس کا کوئی مقرر وقت نہ تھا۔جس وقت چاہتے وہ اپنی دکان کھولتے اور جب چاہتے اس کو بند کر دیتے ۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی دکان ختم ہو گئی ۔انھوں نے ایک ملازمت کی وہ ملازمت ان کے مفروضہ معیار سے کم تھی ۔چنانچہ وہ مستقل جھنجھلاہٹ میں مبتلا رہتے ۔اور اکثر اپنے مالک سے لڑ جاتے ۔آخر کار ان کے مالک نے عاجز آ کر ان کو ملازمت سے نکال دیا۔وغیرہ ۔

اسی طرح وہ مختلف کام کرتے رہے ۔اور ہر کام بے انجامی پر ختم ہوتا رہا۔وہ ہمیشہ دوسروں کی شکایت کرتے رہتے ۔۔فلاں متعصب ہے،فلاں نے عناد کی وجہ سے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے ۔۔فلاں مجھ کو ترقی کرتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا ۔اسی طرح وہ اپنی ہر ناکامی کو دوسروں کے اوپر ڈالتے رہے ۔وہ ساری زندگی

www.urdukitabain.blogspot.com

دوسروں کو غلط ثابت کرتے رہے۔ مگر آخری نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود غلط ہو کر رہ گئے۔

دوسروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرانا بظاہر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ اس کی قیمت بہت مہنگی دینا پڑتی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کی بربادی ہمیشہ باقی رہے۔ اس عالم اسباب میں وہ کبھی ختم ہی نہ ہو

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بچت سے اضافہ

کچھ مادے ایسے ہیں جو بجلی کی متحرک کرنٹ کو اپنے اندر سے گزرنے دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے تانبا، لوہا، اور المونیم وغیرہ اسی قسم کے کنڈکٹر ہیں۔ چنانچہ بجلی کو پاور ہاوس سے دوسرے مقامات پر بھیجنے کے لئے انھیں مادوں کے تار بنائے جاتے ہیں۔ ان تاروں پر بجلی ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجی جاتی ہے۔

اس روانگی کے دوران یہ مادے گرم ہو کر بجلی کی ترسیل میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں تقریباً پچاس فی صد بجلی ضائع ہو جاتی ہے۔ یعنی پاور ہاؤس میں جتنی بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ عملاً اس کا آدھا حصہ استعمال ہوتا ہے۔ بقیہ آدھا حصہ غیر استعمال شدہ طور پر ضائع ہو جاتا ہے

۱۹۱۱ میں ایک ڈچ سائنس دان ایچ کے اونز (H.K.Onnes) نے ایک تجربہ کے طور پر پایا کہ بعض مادے ایسے ہیں۔ جن میں یہ قدرتی صفت ہے کہ ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچنے کے بعد وہ مطلق صفر کے (Absolute Zero) کی سطح پر آجاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی قوت مدافعت کو مکمل طور پر ختم کر کے اس قابل ہو جاتے ہیں۔ کہ وہ بجلی کی روانی میں رکاوٹ ڈالے بغیر اس کی ترسیل کر سکیں۔

ایسے مادے کو سپر کنڈکٹر اور اس طریقہ کو سپر کنڈکٹویٹی کا نام دیا گیا ہے۔ اور اس پر ریسرچ شروع کر دی گئی ہے۔ اب تقریباً ۸۰ برس بعد یہ تحقیق اپنی آخری منزل تک پہنچ گئی ہے۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ سپر کنڈکٹر مادے کو استعمال کر کے بجلی کی ترسیل کی جائے اور اس کے نتیجہ میں پیدا شدہ بجلی کی ۱۰۰ فی صد مقدار استعمال ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ بجلی پیدا کرنے کے کارخانوں میں مزید اضافہ کئے بغیر قابل استعمال بجلی کی مقدار دوگنی ہو جائے۔ اس نئی دریافت نے اس قدیم مقولہ کو واقعہ بنا دیا ہے کہ۔

(Electricity saved is electricity generated)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچت بھی ایک قسم کی آمدنی ہے۔آپ اگر اپنی آمدنی میں اضافہ نہ کر سکتے ہوں تو اپنے خرچ میں کمی کیجیے۔اپنے خرچ میں کمی کر کے آپ اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکتے ہیں۔آمدنی بڑھانے کا یہ ایک ایسا نسخہ ہے۔جو ہر آدمی کے اختیار میں ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

فتح بغیر جنگ

امریکی ہفتہ وار ٹائم (۴ جولائی ۱۹۸۸) کی کور سٹوری جاپان سے متعلق ہے۔اس کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے کہ کیا ایک اقتصادی دیو ایک عالمی طاقت بن سکتا ہے۔

Super Japan:can an economic gaint becomea global power)

(

۱۹۴۵ میں امریکہ نے جاپان کے اوپر فتح کی خوشی منائی تھی۔آج مفتوح جاپان خود امریکہ کے اوپر فتح حاصل کر رہا ہے۔ابتدا یہ فتح صرف اقتصادی معنی میں تھی۔مگر اب وہ دوسرے دائروں میں وسیع ہوتی جا رہی ہے۔امریکہ آج سب سے بڑا قرضدار ملک ہے۔جس کے اوپر ۴۰۰ بلین ڈالر کا خارجی قرضہ ہے۔اس کے برعکس جاپان سب سے بڑا دائن ملک ہے۔جس نے دنیا کو ۲۴۰ بلین قرض دے رکھا ہے۔

امریکہ میں آج کل کثرت سے ایسی کتابیں چھپ رہی ہیں۔اور ایسے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔جن میں بتایا جاتا ہے کہ امریکہ تیزی سے زوال کی طرف جا رہا ہے۔اور اس کے مقابلہ میں جاپان تیزی سے ترقی کی طرف سفر طے کر رہا ہے۔ان میں سے ایک کتاب کا نام یہ ہے:

ٹائم کے مذکورہ شمارہ کو پڑھنے کے بعد اس کے قارئین نے اس کو بہت سے خطوط لکھے ان میں سے کچھ خط اس کی اگلی اشاعت میں شائع ہونے ہیں۔ان میں سے ایک خط پرسٹن کے برائن مرکی نے لکھا ہے۔انھوں نے اپنے مختصر خط میں لکھا ہے کہ جاپان کی اقتصادی کامیابی پر آپ کا مضمون اس کو بالکل واضح کر رہا ہے کہ اگرچہ امریکہ نے جنگ جیتی تھی۔مگر جاپان نے امن کو جیت لیا۔

جاپان کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ خدا کی دنیا میں امکانات کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔یہاں ایک مفتوح اپنے فاتح کے اوپر غالب آ سکتا ہے۔بغیر اس کے کہ اس نے فاتح سے جنگ

کی ہو۔ بغیر اس کے کہ اس کا اپنے فاتح سے کبھی ٹکراؤ پیش آیا ہو۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

حکمت کی بات

مشہور صنعت کار، کار جی ڈی برلا، آزادی کی تحریک میں سرگرمی کے ساتھ شریک تھے انھوں نے انڈین نیشنل کانگرس کو مجموعی طور پر ایک کروڑ سے زیادہ کی رقم دی تھی ۔وہ مہاتما گاندھی کے قریبی ساتھیوں میں تھے ۔۱۹۴۷ سے پہلے برلا ہاوس (دہلی) کانگرسی لیڈروں کا مستقل مرکز بنا ہوا تھا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ساڑھے دس بجے وائسرائے کی تقریر آنے والی تھی ۔جس میں انھیں آزادی ہند کے بارہ میں اپنا آخری سرکاری اعلان نشر کرنا تھا۔تمام بڑے ،بڑے کانگرسی لیڈر برلا ہاوس میں بیٹھے ہوئے گھڑی کی سوئی دیکھ رہے تھے ۔کہ کب ساڑھے دس بجیں اور وہ ریڈیو پر وائسرائے کی تقریر سنیں ۔جی ڈی برلا بھی ان لیڈروں کے ساتھ وہاں موجود تھے ۔برلا کی عادت تھی ۔کہ وہ ٹھیک آٹھ بجے سونے کے کمرے میں چلے جاتے تھے ۔جیسے ہی ان کی گھڑی نے آٹھ بجائے ۔وہ مجلس سے اٹھ گئے ۔انھوں نے کہا: اب تو میرے سونے کا وقت ہو گیا ہے ۔وائسرائے کی تقریر میں کل صبح اخبار میں پڑھ لوں گا۔

یہ ہی کامیاب زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ ہے ۔آدمی کو چاہیے کہ وہ مقصد اور مسئلہ میں فرق کرے ۔وہ مسئلہ کی رعایت صرف اس وقت تک کرے ۔جب تک اس کا مقصد سے ٹکراؤ نہ پیش آیا ہو ۔جب مقصد اور مسئلہ میں ٹکراؤ ہو جائے ۔تو وہ مسئلہ کو حالات کے حوالے کر کے مقصد کی طرف چلا جائے ۔

بیشتر لوگ مسائل میں پریشان رہتے ہیں ۔اس کے نتیجہ میں وہ ذہنی سکون کھو دیتے ہیں ۔اعلیٰ مشاغل میں وہ اپنا وقت نہیں دے پاتے ۔یہاں تک کہ وہ ایک روز افسردگی کے ساتھ مر جاتے ہیں ۔مگر یہ عقل مندی کی بات نہیں ۔مسائل کو حل کرنے میں اپنی قوت صرف کیجیے ۔مگر اس کی ایک حد رکھیے ۔حد آتے ہی مسائل کو چھوڑ کر مقصد کو پکڑ

www.urdukitabain.blogspot.com

لیجیے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسائل کے حل کے سلسلہ میں زیادہ فیصلہ کن چیز حالات ہیں۔ آدمی خواہ کتنا ہی پریشان ہو۔ آخر کار وہی ہوتا ہے جو حالات کا تقاضا ہو۔ اس لئے بہترین عقلمندی یہ ہے کہ ایک حد تک مسائل پر ذہن لگانے کے بعد ان کو حالات کے اوپر چھوڑ دیا جائے۔

گھڑی میں آٹھ بجنے تک مسئلہ پر توجہ دیجیے۔ آٹھ بجے مسئلہ کو حالات کے حوالہ کر کے سونے کے لئے چلے جائیے۔ اس کے بعد اس پر راضی ہو جائیے کہ حالات کا جو فیصلہ ہے وہ مجھے منظور ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سادہ اصول

میریا ٹالچیف (Maria Tallchief) امریکہ کی ایک خاتون آرٹسٹ ہیں۔وہ ۱۹۲۵ میں پیدا ہوئی۔اس نے کامیاب آرٹسٹ بننے کا ایک سادہ اصول بتایا ہے۔تاہم یہ اصول صرف ایک آرٹسٹ کے لئے نہیں۔وہ ہر میدان میں کام کرنے والے آدمی کے لئے ہے۔وہ سادہ اصول یہ ہے کہ۔۔۔زیادہ دیکھو زیادہ بن جاؤ۔(see more...be more)

تجسس تمام ترقیوں کی جان ہے۔آدمی کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ کچھ اور جاننے کی کوشش کرے۔وہ زیادہ دیکھے زیادہ سنے،اور سوالات پیدا کرکے اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔آدمی کی جتنی زیادہ معلومات ہوں اتنی ہی زیادہ ترقی اس کے حصے میں آتی ہے۔اور زیادہ معلومات اسی آدمی کو ملتی ہیں۔جو ہمیشہ زیادہ جاننے کی کوشش میں لگا ہوا ہو۔

بیشتر لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے۔کہ وہ اپنی لاعلمی سے بے خبر رہتے ہیں۔وہ نہ جانتے ہوئے بھی یہ سمجھتے رہتے ہیں۔کہ ہم جانتے ہیں۔یہ ذہنیت کسی آدمی کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ایسا آدمی جاہل ہوتا ہے مگر وہ اپنے کو عالم سمجھتا ہے۔وہ نادان ہوتا ہے مگر یقین کرلیتا ہے کہ وہ ایک دانا انسان ہے۔ایسا انسان خود اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی زیادہ قیمتی سمجھے۔مگر خارجی دنیا کے اعتبار سے اس کی کوئی قیمت نہیں۔

سب سے بہتر بات یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو طالب علم سمجھے۔اور ہمیشہ طالب علم سمجھتا رہے۔علم کی تلاش سے وہ کبھی نہ تھکتا ہو۔اس کے لئے سب سے زیادہ خوشی کا وہ لمحہ ہو جب کہ وہ کوئی نئی چیز دریافت کرے۔جب کہ اس کے علم کے ذخیرہ میں کسی نئی بات کا اضافہ ہو جائے۔

جو شخص زیادہ جانے گا وہ اس دنیا میں زیادہ بنے گا۔فکری اضافہ انسان کے عمل میں

اضافہ کرتا ہے۔فکری اضافہ آدمی کو معمولی انسان سے اٹھا کر غیر معمولی انسان بنا دیتا ہے۔

اس دنیا میں معلومات کی کوئی حد نہیں، اس لئے معلومات میں اضافہ کی بھی کوئی حد نہیں ہو سکتی۔آدمی کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو نہ جاننے والا سمجھے تاکہ اس کے جاننے کی خواہش کبھی ختم نہ ہونے پائے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

خطرہ نہیں

ایک مفکر کا قول ہے کہ ۔۔واحد چیز جس سے ہمیں ڈرنا چاہیے وہ خود ڈر ہے:(The only thing ,we have to fear is fear it self:)

زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جو بظاہر خطرہ والے ہوتے ہیں۔جن کو دیکھ کر آدمی ڈر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔مگر زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی خطرہ کو خطرہ نہ سمجھے ۔بلکہ سادہ طور پر اس کو ایک مسئلہ سمجھے۔مسئلہ سمجھنے سے آدمی کا ذہن اس کا حل تلاش کرنے میں لگ جاتا ہے۔اس کے برعکس جب مسئلہ کو خطرہ سمجھ لیا جائے تو اس سے ڈر والی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔آدمی مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔وہ جو کچھ کر سکتا ہے اس کو کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

جو شخص زندگی کی جدو جہد کے میدان میں داخل ہو اس کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ وہ اس میدان میں اکیلا نہیں ہے۔یہاں اس کی مانند دوسرے لوگ بھی ہیں۔جو اپنے حوصلے کے مطابق زندگی کی جد جہد میں مشغول ہے۔اس کے ساتھ فطرت کا نظام ہے جو وسیع تر پیانے پر قائم ہے۔اس نظام میں سردی بھی ہے اور گرمی بھی۔خشکی بھی ہے اور پانی بھی۔میدان بھی ہے اور پہاڑ بھی۔یہاں کانٹا بھی ہے اور پھول بھی ۔

ان دوطرفہ اسباب سے لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے۔کہ آدمی کے سامنے مختلف قسم کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔بار بار ایسا ہوتا ہے کہ اس کی گاڑی رکتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے ۔اس قسم کے واقعات ہر آدمی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔اور وہ بہر حال پیش آئیں گے خواہ ان کو ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔

مگر ہمارے لئے اطمینان کی بات یہ ہے کہ دنیا کا نظام اسی طرح بنایا گیا ہے۔کہ یہاں اگر مخالف انسان ہیں تو اسی کے ساتھ ہمارے موافق انسان بھی موجود

www.urdukitabain.blogspot.com

ہیں۔ جہاں رکاوٹیں کھڑی ہوئی ہیں۔ وہاں گنجائش کے دروازے بھی ہر طرف کھلے ہوئے ہیں۔

جو آدمی مخالفتوں یا رکاوٹوں میں الجھ جائے۔ وہ اس دنیا میں اپنا سفر پورا نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس جو شخص ایسا کرے کہ وہ مخالفت یا رکاوٹ پیش آنے کی صورت میں اپنے ذہن کو تدبیر ڈھونڈنے کی طرف لگا دے۔ وہ لازماً اپنے لئے آگے بڑھنے کا راستہ پا لے گا۔ اس کو کوئی طاقت منزل پر پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

جوش بغیر ہوش

میکی ٹامسن (Mickey Thompson) امریکہ میں پیدا ہوا۔اس نے کار کی ریس میں عالمی شہرت حاصل کی۔حتیٰ کہ وہ شاہ رفتار (Speed King) کہا جانے لگا۔مگر مارچ ۱۹۸۸ میں اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔بوقت وفات اس کی عمر ۵۹ سال تھی۔میکی ٹامسن بے حد جرات مند آدمی تھا۔نومبر ۱۹۸۷ میں اس نے اپنے دوستوں کو لاس اینجلیز میں بتایا تھا کہ کچھ بیہودہ لوگ اسکو ٹیلی فون پر مار ڈالنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔اس کے دوست ارنی الوراڈو نے کہا کہ میکی نے مجھ کو بتایا تھا کہ وہ جانتا ہے کہ کون شخص مجھ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔دوست نے پوچھا کیا تم نے اس کی اطلاع پولیس کو کی ہے۔میکی نے جواب دیا: اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

مگر میکی غلطی پر تھا۔شروع مارچ ۱۹۸۸ کی ایک صبح وہ اپنی ۴۱ سالہ بیوی ٹروڈی کے ساتھ بریڈ بری (کیلی فورنیا) میں اپنے گھر سے اپنے آفس جا رہا تھا کہ دو آدمی بائیسیکل پر آئے۔اور اس پر بندوق سے حملہ کر دیا۔ٹروڈی مایوسانہ طور پر کہتی رہی ۔۔کہ نہ مارو۔نہ مارو۔مگر گولیوں کی بوچھاڑ نے چند منٹ کے اندر دونوں کا خاتمہ کر دیا ۔میکی نے ۱۹۶۰ میں ۴۰۰ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کار چلا کر پہلا امریکی ٹائٹل حاصل کیا تھا۔یہ سفر اس نے ایک خاص موٹر کار کے ذریعہ طے کیا تھا۔جس میں چار انجن لگے ہوئے تھے۔ہفتہ وار ٹائم (۲۸ مارچ ۱۹۸۸) نے اس حادثہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ خطرہ کی پرواہ نہ کرنا جس نے میکی ٹامسن کو تیز رفتاری کا بادشاہ بنایا۔خود ہی اس کے لئے موت کا پیغام بن گیا۔

بہادری اور بے خوفی بہت اچھی چیز ہے۔مگر انسان بہر حال کمزور ہے۔وہ مطلق بہادری یا لامحدود بے خوفی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔اس لئے بہادری اور بے خوفی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی محتاط ہو۔وہ حکمت اور مصلحت کا لحاظ کرنا بھی جانے

۔غیر حکیمانہ چھلانگیں بھی اتنا ہی غلط ہے۔جتنا کہ بزدلانہ پسپائی۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

رواجی ذہن

الیس ہووے (Elias Howe) امریکہ کے مشہور شہر مساچوسٹس کا ایک معمولی کاریگر تھا۔ وہ ۱۸۱۹ میں پیدا ہوا۔ اور صرف ۴۸ سال کی عمر میں ۱۸۶۷ میں اس کا انتقال ہوگیا۔ مگر اس نے دنیا کو ایک ایسی چیز دی۔ جس نے کپڑے کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ یہ سلائی کی مشین رھی جو اس نے ۱۸۴۵ میں ایجاد کی۔

الیس ہووے نے جو مشین بنائی اس کی سوئی میں دھاگہ ڈالنے کے لئے ابتداً سوئی کی جڑ کی طرف چھید ہوتا۔ جیسا کہ عام طور پر ہاتھ کی سوئیوں میں ہوتا ہے۔ ہزاروں برس سے انسان سوئی کی جڑ میں چھد کرتا آرہا تھا۔ اسلئے الیس ہووے نے جو سلائی کی مشین تیار کی تو اس مین بھی رواج کے مطابق اس نے جڑ کی طرف چھید بنایا۔ اس کی وجہ سے اس کی مشین ٹھیک کام نہیں کرتی تھی۔ شروع میں وہ اپنی مشین سے صرف جوتا سی سکتا تھا۔ کپڑے کی سلائی اس مشین پر ممکن نہ تھی۔

الیس ہووے ایک عرصہ تک اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ مگر اس کی سمجھ میں اس کا کوئی حل نہیں آتا تھا۔ آخر کار اس نے ایک خواب دیکھا۔ اس خواب نے اس کا مسئلہ حل کر دیا

۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ کسی وحشی قبیلہ کے آدمیوں نے اس کو پکڑ لیا ہے۔ اور اس کو حکم دیا ہے کہ وہ چوبیس گھنٹہ کے اندر سلائی کی مشین بنا کر تیار کرے۔ ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ اس نے کوشش کی مگر مقررہ مدت کے اندر وہ مشین تیار نہ کر سکا۔ جب وقت پورا ہوگیا تو قبیلے کے لوگ اسے مارنے کو دوڑے۔ ان کے ہاتھ میں برچھا تھا ہووے نے غور سے دیکھا تو ہر برچھے کی نوک پر ایک سوراخ تھا۔ یہ ہی دیکھتے ہوئے اس کی آنکھ کھل گئی۔

ہووے کو آغاز مل گیا۔ اس نے برچھے کی طرح اپنی سوئی میں بھی نوک کی طرف چھید

بنایا۔اس میں دھاگا ڈالا۔اب مسئلہ حل تھا۔دھاگے کا چھید اوپر ہونے کی وجہ سے جو مشین کام نہیں کر رہی تھی۔وہ نیچے کی طرف چھید بنانے سے بخوبی کام کرنے لگی۔

ہووے کی مشکل یہ تھی کہ وہ رواجی ذہن سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتا تھا۔وہ سمجھ رہا تھا کہ جو چیز ہزاروں سال سے چلی آرہی ہے وہ صحیح ہے۔جب اس کے لاشعور نے اس کو تصویر کا دوسرا رخ دکھایا۔اس وقت وہ معاملہ کو سمجھا۔اور اس کو فوراً حل کر لیا۔جب آدمی اپنے آپ کو ہمہ تن کسی کام میں لگا دے تو وہ اسی طرح اس کے رازوں کو پالیتا ہے جس طرح مذکورہ شخص نے پالیا۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

کامیابی کی شرط

جاپان آج متفقہ طور پر اقتصادی سپر پاور (Economic Super power) کی حیثیت رکھتا ہے۔ روایتی طور پر فوجی طاقت کسی قوم کو سپر پاور بناتی تھی۔ مگر جاپان نے اپنی مثال سے ثابت کیا کہ اقتصادی ترقی کے ذریعے بھی ایک قوم سپر پاور بن سکتی ہے۔ مزید یہ کہ فوجی طاقت کے بل پر سپر پاور بننے والی قوم ایک حد کے بعد اپنی طاقت کھو دیتی ہے۔ کب کہ اقتصادی سپر پاور کے لئے اس قسم کی کوئی حد نہیں۔

جاپان سپر پاور کیسے بنا۔ وہ نعروں کی سیاست یا مطالبات کے ہنگاموں کے ذریعہ سپر پاور نہیں بنا۔ بلکہ خاموش عمل کے ذریعہ سپر پاور بنا۔ اس خاموش عمل کا اہم ترین جزیہ تھا کہ پہلے اس نے اپنے لئے چھوٹی حیثیت کو تسلیم کیا۔ اس کے بعد اس کو بڑی حیثیت ملی۔ ٹوکیو کے ایک مشہور صحافی مسٹر سجاش چکرورتی کا ایک جائزہ ٹائمس آف انڈیا (۲۷ اپریل ۱۹۹۰) میں شائع ہوا۔ اس کا ایک جزیہاں قابل نقل ہے۔

جاپان لمبی مدت تک امریکہ کی یہ حیثیت تسلیم کرتا رہا۔ کہ وہ ایشیا میں سب سے زیادہ اہم خارجی عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد اب وہ وقت آیا کہ جاپان اپنے مفادات یا اپنے حوصلوں کے معاملہ میں مصالحت کئے بغیر امریکہ کے ساتھ طاقت اور اثر میں حصہ دار بننے کی کوشش کرے۔

(صفحہ آٹھ)

یہی موجودہ دنیا میں ترقی کا اصول ہے۔ یہاں بڑا بننے کے لئے پہلے چھوٹا بننا پڑتا ہے۔ غلبہ حاصل کرنے کے لئے پہلے مغلوبیت پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ یہاں آگے بڑھنا اس کے لئے مقدر ہے۔ جو آگے بڑھنے سے پہلے پیچھے ہٹنے کے مرحلہ کو برداشت کرے۔

اس دنیا میں کھونا پہلے ہے۔ اور پانا اس کے بعد۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

زندگی کا سفر

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک وہ جن کی تربیت مصائب کی درس گاہ میں ہوتی ہے ۔اور دوسرے وہ جن کی تربیت آسانیوں کی درس گاہ میں ہوتی ہے۔بظاہر آسانیوں میں پرورش پانا اچھی بات ہے۔مگر وہ چیز جس کو انسان سازی کہتے ہیں۔اس کی حقیقی جگہ صرف مصائب کی درس گاہ ہے۔نہ کہ آسانیوں کی درس گاہ۔کسی کا یہ قول نہایت درست ہے۔کہ سہولت نہیں بلکہ جدوجہد آسانی نہیں۔بلکہ مشکل وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے۔

زندگی کے سیلاب میں بے شمار لوگ مصیبتوں کی زد میں آتے ہیں۔مگر مشاہدہ بتاتا ہے ۔کہ عام طور پر لوگوں کا انجام دو قسم کا ہوتا ہے۔ایک وہ لوگ جو مصیبتوں کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں پاتے ۔اور مایوسی اور دل شکستگی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔دوسرے وہ جو مضبوط اعصاب والے ثابت ہوتے ہیں۔وہ مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں۔اور آخر کار اپنے لئے ایک زندگی بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

تاہم دوسرے گروہ کو یہ کامیابی ہمیشہ ایک محرومی کی قیمت پر ملتی ہے۔مادی تجربات انھیں فکر کے اعتبار سے بھی مادی بنا دیتے ہیں۔وہ دیکھتے ہیں کہ مادی چیزوں سے محرومی نے انھیں ماحول میں بے قیمت کر دیا تھا۔اور جب انھوں نے مادی چیزوں کو پالیا۔تو اسی ماحول میں وہ دوبارہ قیمت والے ہو گئے۔اس تجربہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔کہ وہ سراسر مادہ پرست انسان بن جاتے ہیں۔وہ مادی چیزوں کے کھونے کو کھونا سمجھنے لگتے ہیں۔اور مادی چیزوں کے پانے کو پانا۔

مصیبتوں میں پڑنے کا اصل فائدہ سبق اور نصیحت ہے۔مگر یہ فائدہ صرف اس وقت ملتا ہے۔جب کہ آدمی مصیبتوں کی زد میں آئے مگر وہ ہلاک نہ ہو۔وہ زندگی کی تلخیوں سے دوچار ہو مگر وہ ان سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔مصیبتیں اور تلخیاں اس کے

www.urdukitabain.blogspot.com

لئے تجربہ ثابت ہوں۔ نہ کہ وہ اس کے ذہن کی معمار بن جائیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

دشمن سے سیکھنا

۱۹۴۹ میں جاپانیوں نے اپنے یہاں صنعتی سیمینار کیا۔ اس سیمینار میں انھوں نے امریکہ کے ایک ڈاکٹر ایڈورڈ ڈیمنگ (Dr.Edward.Deming) کو ایک خصوصی دعوت نامہ بھیج کر بلایا۔ ڈاکٹر ڈیمنگ نے اپنے لیکچر میں اعلیٰ صنعتی پیداوار کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ یہ کوالٹی کنٹرول کا نظریہ تھا۔ (ہندوستان ٹائمس ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶)

جاپان کے لئے امریکہ کے لوگ دشمن قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے جاپان کو بدترین شکست اور ذلت سے دوچار کیا تھا۔ اس اعتبار سے ہونا یہ چاہئے تھا کہ جاپانیوں کے دل میں امریکہ کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکے۔ مگر جاپانیوں نے اپنے آپ کو اس قسم کے منفی جذبات سے اوپر اٹھا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ امریکی پروفیسر کو اپنے سیمینار میں بلائیں۔ اور اس کے بتائے ہوئے نسخہ پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے اس کو دل و جان سے قبول کر لیں۔

جاپانیوں نے امریکی پروفیسر کی بات کو پوری طرح پکڑ لیا۔ انھوں نے اپنے پورے صنعتی نظام کو کوالٹی کنٹرول کے رخ پر چلانا شروع کیا۔ انھوں نے اپنے صنعتکاروں کے سامنے بے نقص کا نشانہ رکھا۔ یعنی ایسی پیداوار مارکیٹ میں لانا۔ جس میں کسی بھی قسم کا کوئی نقص نہ پایا جائے۔ جاپانیوں کی سنجدگی اور ان کا ڈیڈیکیشن (Dedication) اس بات کا ضامن بن گیا کہ یہ مقصد پوری طرح حاصل ہو۔

جلد ہی ایسا ہوا کہ جاپانیوں کے کارخانے بے نقص سامان بنانے لگ گئے۔ یہاں تک کہ یہ حال ہوا کہ برطانیہ کے ایک دکان دار نے کہا کہ جاپان سے اگر میں ایک ملین کی تعداد میں کوئی سامان منگاؤں تو مجھ کو یقین ہوتا ہے کہ ان میں کوئی ایک چیز بھی نقص

www.urdukitabain.blogspot.com

والی نہیں ہوگی۔ چنانچہ تمام دنیا میں جاپان کی پیداوار پر صد فی صد بھروسہ کیا جانے لگا

۔

اب جاپان کی تجارت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ حتی کہ وہ خود امریکہ کے بازار پر چھا گیا ۔جس کے ایک ماہر کی تحقیق سے اس نے کوالٹی کنٹرول کا مذکورہ نسخہ حاصل کیا تھا۔

اس دنیا میں بڑی کامیابی وہ لوگ حاصل کرتے ہیں۔ جو ہر ایک سے سبق سیکھنے کی کوشش کریں، خواہ وہ ان کا دوست ہو یا دشمن۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بند ذہن

یونانی فلسفی ارسطو (۳۲۲۔۳۸۴ ق ۔م) نے لکھا ہے کہ گول دائرہ معیاری دائرہ ہے ۔اور وہ جیومیٹری کی کامل صورت ہے ۔اس مفروضہ کی بنیاد پر ارسطو نے کہا کہ چونکہ فطرت (نیچر) کا ہر کام معیاری ہوتا ہے اس لئے فطرت آسمانی اجرام کو جن دائروں میں گھما رہی ہے وہ صرف گول دائرہ ہی ہو سکتا ہے ۔

ارسطو کا یہ نظریہ قدیم زمانے میں تمام لوگوں کے دماغوں پر چھایا ہوا تھا ۔قدین زمانے میں ہیت کے جو نظام بنائے گئے مثلاً بطلیموس کا نظام، کوپرنیکس کا نظام، ٹائیکو براہے کا نظام، سب میں یہ فرض کیا گیا تھا کہ آسمانی اجرام فلکی (نظام شمسی کے سیارے) سب کے سب خلا کے اندر گول دائروں میں گھومتے ہیں ۔

کپلر غالباً پہلا شخص ہے جس نے اس کے خلاف سوچا ۔اس نے حساب لگا کر ۱۶۰۹ میں بتایا کہ مریخ کی گردش گول دائرہ میں نہیں ہے ۔ بلکہ وہ بیضوی مدار میں گھومتا ہے ۔اس نے پیشین گوئی کی کہ دوسرے تمام سیارےجو سورج کے گرد گھومتے ہیں ۔وہ بھی بیضوی شکل ہی میں گھومتے ہیں ۔کپلر کا یہ نظریہ آج ایک ثابت شدہ حقیقت بن گیا ہے ۔

قدیم ہیت دان دو ہزار سال تک گول دائرہ کے تصور میں گم رہے ۔وہ سیاروں کی گردش کے بارہ میں دوسرے نہج پر نہ سوچ سکے ۔اس کی وجہ ارسطو کے نظریہ کی عظمت تھی ۔اس نظریہ کو انھوں نے بلا بحث ایک مسلمہ حقیقت مان لیا ۔اس بنا پر ان کا ذہن کسی اور انداز میں کام نہیں کر پاتا تھا ۔

یہ صرف قدیم زمانہ کی بات نہیں ۔ یہ ہر دور کی بات ہے ۔ہر زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ بعض خیالات آدمی کے دماغ پر اتنے چھا جاتے ہیں ۔کہ ان سے نکل کر آدمی کے لئے سوچنا ناممکن ہو جاتا ہے ۔یہ مذہبی دائرہ میں بھی ہوتا ہے ۔اور غیر مذہبی دائرہ میں بھی

www.urdukitabain.blogspot.com

۔یہ بند ذہن ہر قسم کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بلند پروازی

جاپان ایرلائنز کا ایک جہاز (بوئنگ ۷۴۷) ۱۲، اگست ۱۹۵۸ کو ٹوکیو سے اڑا۔ اسے ایک گھنٹہ میں اوسا کا پہنچنا تھا۔ مگر اڑان کے صرف دس منٹ بعد پائلٹ نے محسوس کیا کہ اس نے جہاز پر اپنا کنٹرول کھو دیا ہے۔ جہاز کو ۲۴ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑنا تھا۔ مگر وہ اترتے، اترتے ۹۸۰۰ فٹ کی بلندی پر آ گیا۔ اور بالآخر وہ پہاڑ سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا

۔

اس جہاز کے ۵۲۰ مسافر مر گئے۔ ان مرنے والوں میں ہندوستان کے ایک انجینیر مسٹر کلیان مکرجی اور ان کی بیوی بھی تھے۔ مسٹر مکرجی کی عمر بوقت حادثہ ۴۱ برس تھی۔ وہ ایک تجاتی مہم پر حال میں جاپان گئے تھے۔ جاپان سے انھوں نے اپنے لڑکے زنجن مکر جی (۱۳ سال) کے نام خط لکھا، کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ۱۲، اگست کو ایک تفریحی سفر پر ٹوکیو سے اوسا کا جا رہے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمس ۱۴، اگست ۱۹۵۸)

جہاز کو بلندی پر اڑانے کا ایک مقصد یہ ہے کہ وہ پہاڑوں یا اونچی عمارتوں سے نہ ٹکرائے۔ مذکورہ جہاز کے لئے ۲۴ ہزار فٹ کی بلندی ایک محفوظ بلندی تھی۔ مگر جب اس کے انجن میں خرابی آ گئی تو وہ اس محفوظ بلندی پر قائم نہ رہ سکا۔ وہ اترتے، اترتے ۹۸۰۰ فٹ کی بلندی پر آ گیا اب وہ محفوظ بلندی کی سطح پر نہ رہا چنانچہ وہ پہاڑ سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ ہماری زندگی کا سفر بے شمار انسانوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے فکر و خیال کے اعتبار سے نچلی سطح پر سفر کریں تو بار بار دوسروں سے ٹکراؤ ہوتا رہے گا۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ ذہنی فکر و خیال کے اعتبار سے اپنے آپ کو اتنی بلندی پر پہنچا دے کہ دوسروں سے ٹکراو کا امکان ہی اس کے لئے ختم ہو جائے۔

اعراض کا اسلامی اصول آدمی کو یہی بلندی عطا کرتا ہے۔ اعراض اپنی حقیقت کے

www.urdukitabain.blogspot.com

اعتبار سے عین وہ ہی چیز ہے جس کو بعض مفکرین نے مسئلہ کا برتر حل کہا ہے۔ برابر کی سطح پر سفر کرنے والے کو دوسروں س ٹکراو کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے دانش مند آدمی اپنے سفر کی سطح کو بلند کر لیتا ہے۔ تاکہ دوسروں کے ساتھ اس کا ٹکراو نہ پیش آئے۔ اسی برتر حکمت کو اختیار کرنے کا نام اعراض ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بے دانشی

ایک شخص کا قول ہے کہ بیشتر حالات میں آدمی کے لئے سیکنڈ بسٹ (Second best) ممکن ہوتا ہے۔ مگر وہ فرسٹ بسٹ کو حاصل کرنے کی طرف دوڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ناممکن کو حاصل کرنے کی حرص میں ممکن کو بھی کھو دیتا ہے۔

ایک صاحب نے عربی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ مدرسہ سے فراغت کے بعد وہ گاؤں کی مسجد میں معمولی تنخواہ پر امام ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی ملاقات ایک بڑے ادارے کے ناظم صاحب سے ہوئی۔ ناظم صاحب نے محسوس کیا کہ ان کے اندر صلاحیت ہے۔ چنانچہ انھوں نے امام صاحب کو اپنے یہاں بلا لیا۔ جلد ہی ان کی مزید ترقی ہوئی اور وہ ناظم صاحب کے اسٹنٹ مقرر ہو گئے۔

اب ادارہ کے وسیع احاطہ میں ان کو رہائش کے لئے ایک صاف ستھرا مکان مل گیا۔ ایک جیپ ان کے استعمال میں رہنے لگی۔ معقول تنخواہ اور دوسری سہولتیں اس کے علاوہ تھیں۔ امام صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ اللہ کا شکر کرکے اس پر قانع رہتے۔ مگر اسٹنٹ کا عہدہ انھیں سیکنڈ بیسٹ نظر آیا۔

انھوں نے چاہا کہ میں فرسٹ بیسٹ حاصل کرلوں۔ یعنی خود ناظم صاحب کی سیٹ پر قبضہ کرلوں۔

اس مقصد کے لئے انھوں نے ناظم کے خلاف مختلف قسم کے تخریبی منصوبے بنائے۔ جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ خلاصہ یہ کہ جب ناظم کو ان کے منصوبے کا علم ہو اتو انھوں نے اپنے اثرات سے کام لے کر انھیں ادارہ سے نکلوا دیا۔ ان کا سامان باہر سڑک پر پھینک دیا گیا۔ جیپ چھین لی گئی۔ مجبور ہو کر انھیں شہر چھوڑنا پڑا۔ اب وہ دوبارہ گاؤں کی مسجد میں امام بن کر زندگی گزار رہے ہیں۔ مزید یہ کہ مذکورہ معاملہ کی وجہ سے ان کی جو بدنامی ہوئی۔ اس کے بعد کوئی ادارہ انھیں قبول کرنے کے لئے تیار

www.urdukitabain.blogspot.com

نہیں۔

اس دنیا میں کامیابی کا راز قناعت اور شکر گزاری ہے۔ یہ ہی وہ قول ہے جس کو سیکنڈ بیسٹ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سیکنڈ بیسٹ اپنے کو پیچھے ڈالنا نہیں۔ یہ دراصل قابل عمل سے آغاز کرنا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جو آدمی سیکنڈ بیسٹ پر راضی ہو جائے۔ وہ بعد کے مرحلے میں فرسٹ بیسٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور جو شخص اس طرح راضی نہ ہو وہ سیکنڈ بیسٹ بھی کھو دیتا ہے اور فرسٹ بیسٹ بھی۔

ہار مان کر

دوسری جنگ عظیم میں جاپان کو امریکہ کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۴۵ میں امریکی فوجیں جاپان میں اتر گئیں۔ جنرل ڈگلس میک آرتھر (Douglas MackArthour) امریکہ کی طرف سے جاپان کے سپریم کمانڈر مقرر ہوئے۔ جو 1951 تک وہاں رہے۔ اس کے بعد جنرل میک آرتھر کی مرضی کے مطابق جاپان کا نیا دستور بنایا گیا۔ جو ۳ نومبر ۱۹۴۶ کو جاپانی اسمبلی میں منظور کر لیا گیا۔ اس دستور کے تحت شہنشاہ جاپان کی حیثیت گھٹا کر اس کو علامتی حکمران کا درجہ دے دیا گیا۔ دستور کی دفعہ ۹ کے تحت جاپانی قوم نے عہد کیا کہ وہ کبھی زمینی، بری، یا ہوائی فوج نہیں رکھے گی۔ اور نہ کسی قسم کی اور جنگی تیاری کرے گی۔

یہ دستور بظاہر جاپان کی مستقل قومی موت کے ہم معنی تھا۔ مگر جاپان کے لیڈروں نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس کو منظور کر لیا۔

کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ یہ دستور اگر چہ فوجی اور سیاسی اعتبار سے جاپان کے لئے اقدام کا راستہ بند کر رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود سائنس اور صنعت میں اقدام کا راستہ پوری طرح کھلا ہوا ہے۔ جاپان کی قوم جنگی اور سیاسی ٹکراؤ کے میدان سے واپس آ کر علم اور صنعت کے میدان میں باقی ماندہ مواقع کو استعمال کرنے لگی۔ یہاں تک کہ صرف چالیس سال بعد مورخ کو جاپان کے بارے میں یہ الفاظ لکھنے پڑے۔ ۱۹۴۵ کی دوسری عالمی جنگ میں شکست کھایا ہوا جاپان دوبارہ جنگ کے کھنڈروں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور دنیا کی ایک عظیم اقتصادی طاقت بن گیا۔

حال کو مان لینا آدمی کے لئے مستقبل کا راستہ کھول دیتا ہے۔ جو لوگ حال کو نہ مانیں وہ مستقبل کے عظیم تر امکانات کو پانے سے بھی محروم رہیں گے۔

کامیابی کا راز

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ جو چیز مجھ کو نہیں مارتی۔وہ مجھ کو پہلے سے زیادہ طاقتور بنا دیتی ہے:

جب آدمی کسی سخت مشکل سے دوچار ہو۔اور اس سے دل شکستہ نہ ہو۔بلکہ غور و فکر کے ذریعہ اس کا حل تلاش کرے۔تو اس نے اپنے اندر نئی طاقت پیدا کی۔اس نے اپنے اندر اس صلاحیت کو جگایا۔کہ وہ ناموافق حالات کا مقابلہ کر سکے۔وہ رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھتا رہے۔مشکل نادان آدمی کو برباد کرتی ہے۔مگر مشکل عقلمند آدمی کے لئے ترقی کا زینہ بن جاتی ہے۔

زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے سب سے اہم چیز بلندی فکر ہے۔ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان سوالات سے اوپر اٹھ جائیں۔جو ماضی پر یا پیش آنے والے دکھ پر مبنی ہوتے ہیں۔ایسا کیوں کر میرے ساتھ پیش آیا۔اس سوال کی بجائے آدمی کو ایسی باتوں پر سوچنا چاہیے جو مستقبل کے دروازے کھولنے والے ہوں۔۔اب جب کہ یہ پیش آچکا ہے مجھے اس کے لئے کیا کرنا چاہیے۔

موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں لازمی طور پر ناخوش گوار واقعات پیش آتے ہیں۔آدمی بار بار مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے۔ایسی حالت میں موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی حاصل کرنے کا راز صرف ایک ہے۔وہ ماضی کو بھول کر مستقبل کو سوچے۔وہ کھوئے امکانات پر غم نہ کرے۔بلکہ اپنی ساری توجہ ان امکانات پر لگا دے جواب بھی اسے حاصل ہیں۔جو ابھی تک برباد نہیں ہوئے۔

حال کو ماننا آدمی کے لئے مستقبل کے دروازے کھول دیتا ہے۔اور حال کو نہ ماننا آدمی کو حال سے بھی محروم کر دیتا ہے۔اور آنے والے مستقبل سے بھی۔

مجرم کون

ایک آدمی کو گلاب کا پھول توڑنا تھا۔وہ شوق کے تحت تیزی سے لپک کر اس کے پاس پہنچا۔اور جھٹکے کے ساتھ ایک پھول توڑ لیا۔پھول تو اس کے ہاتھ میں آ گیا مگر تیزی کے نتیجے میں کئی کانٹے اس کے ہاتھ میں چبھ چکے تھے۔اس کے ساتھی نے کہا کہ تم نے بڑی حماقت کی۔تم کو چاہیے تھا کہ کانٹوں سے بچتے ہوئے احتیاط کے ساتھ پھول توڑو۔تم نے احتیاط والا کام بے احتیاطی سے کیا۔اس کا یہ نتیجہ ہے کہ تمہارا ہاتھ زخمی ہو گیا۔

اب پھول توڑنے والا غصہ ہو گیا۔اس نے کہا کہ سارا قصور تو ان کانٹوں کا ہے۔انھوں نے میری ہتھیلی اور میری انگلیوں کو خون آلود کیا۔اور تم الٹا مجھ کو مجرم ٹھہرا رہے ہو۔اس کا ساتھی بولا میرے دوست، یہ درخت کے کانٹوں کا معاملہ نہیں۔یہ نظام قدرت کا معاملہ ہے۔قدرت نے دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے۔کہ یہاں پھول کے ساتھ کانٹے ہوں۔میری اور تمہاری چیخ وپکار ایسا نہیں کر سکتی کہ اس نظام کو بدل دے۔پھول کے ساتھ کانٹے کا نظام تو بہر حال اسی طرح دنیا میں رہے گا۔اب میری اور تمہاری کامیابی اسی میں ہے کہ ہم اس حقیقت کا اعتارف کرتے ہوئے اس سے بچنے کی تدبیر تلاش کریں۔اور وہ تدبیر یہ ہے کہ کانٹوں سے بچ کر پھول کو حاصل کریں۔کانٹوں میں نہ الجھتے ہوئے پھول تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

پھول کے ساتھ کانٹے کا ہونا کوئی سادہ بات نہیں۔یہ فطرت کی زبان میں انسان کے لئے سبق ہے۔یہ نباتاتی واقعہ کی زبان میں انسانی حقیقت کا اعلان ہے۔یہ اس تخلیقی منصوبہ کا تعارف ہے۔جس کے مطابق موجودہ دنیا کو بنایا گیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں وہی اقدام کامیاب ہوتا ہے جو اعراض کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے بنایا گیا ہو۔

www.urdukitabain.blogspot.com

جہاں بچنے کی صورت ہو وہاں الجھنا، جہاں تدبیر کی ضرورت ہو وہاں ایجی ٹیشن کرنا صرف اپنی نالائقی کا اعلان کرنا ہے۔خدا نے جس موقع پر اعراض کا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہو، وہاں الجھنے کا طریقہ اختیار کرنا خود اپنے آپ کو مجرم بنانا ہے۔خواہ آدمی نے دوسروں کو مجرم ثابت کرنے کے لئے ڈکشنری کے تمام الفاظ دہرا ڈالے ہوں۔

مشکل میں آسانی

روایتی طرز کے کولھو میں جب گنا ڈالا جاتا ہے۔تو اس میں دباؤ کم ہوتا ہے۔اور اسکے بیلن کے درمیان سے گنا صرف ایک بار گزارا جاتا ہے۔چنانچہ گنے کا رس تقریباً ۲۵ فی صد نکلے بغیر اس کے اندر رہ جاتا ہے۔بجلی سے چلنے والے کرشر (Crusher) میں نسبتاً زیادہ دباؤ ہوتا ہے۔اور گنے کو بیلن کے درمیان سے دو بار گزارا جاتا ہے۔تاہم یہاں بھی تقریباً ۱۵ فی صد رس اس سے نہیں نکل پاتا۔بڑی بڑی ملوں میں بہت زیادہ دباؤ ہوتا ہے۔

اور گنے کو تقریباً چار بار مشینی بیلن سے گزارا جاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گنے کا تقریباً تمام رس اس سے باہر آ جاتا ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دباؤ کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔اللہ تعالی نے اس دنیا میں جو چیزیں پیدا کی ہیں۔ان کے اندر تخلیقی طور پر بے حساب امکانات رکھ دیئے ہیں۔مگر کسی چیز کے اندر چھپا ہوا امکان صرف اس وقت باہر آتا ہے۔جب کہ اس چیز پر دباؤ پڑے۔دباؤ جتنا زیادہ شدید ہوگا۔اتنا ہی زیادہ اس کے اندرونی امکانات باہر آئیں گے۔

یہ ہی حال انسان کا بھی ہے۔انسان کے اندر پیدائشی طور پر بے حساب امکانات موجود ہیں۔ہر انسان امکانات کا ایک لامحدود خزانہ ہے۔معمول کے حالات میں یہ امکانات انسان کے اندر چھپے ہوئے پڑے رہتے ہیں۔وہ صرف اسوقت ظاہر ہوتے ہیں۔جب کہ انسان دباؤ کا شکار ہو۔جب اس کی شخصیت کو نچوڑنے والے عمل سے گزارا جائے۔

تاریخ میں جن لوگوں نے کوئی بڑی ترقی کی ہے۔وہ وہ ہی لوگ تھے جو اپنے ماحول میں دباؤ کا شکار ہوئے جنھوں نے انّ مع العسر یسراً کے تخلیقی راز کا جانا۔جنھوں نے

زندگی کے میدان میں اس حوصلہ کے ساتھ قدم رکھا کہ وہ عسر کی زمین سے یسر کی فصل اگائیں گے۔

انسانی نگاہ مشکل کو مشکل کے روپ میں دیکھتی ہے۔ ربانی نگاہ وہ ہے جو مشکل کو آسانی کے روپ میں دیکھے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

دکان داری

دکاندار وہ ہے جو دکاندار بننے کے ساتھ گاہک بھی بن جائے۔ جو صرف بیچنے والا نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ وہ خریدنے والا بھی ہو۔ وہ اپنے آپ کو بھی جانے اور اسی کے ساتھ اپنی دکان پر آنے والے متوقع خریدار کو بھی۔

دکاندار اور گاہک دونوں بالکل الگ، الگ نوعیت کے انسان ہیں۔ دکاندار کا ذہن پیسہ کے رخ پر چلتا ہے۔ اور گاہک کا ذہن سامان کے رخ پر۔ دکاندار کی نظر گاہک کی جیب پر ہوتی ہے۔ اور گاہک کی نظر دکان دار کے سامان پر۔ مگر جو دکاندار صرف اتنا ہی جانتا ہو کہ اس کو گاہک کی جیب سے پیسہ نکالنا ہے۔ وہ کبھی بڑا دکاندار نہیں بن سکتا۔

کامیاب دکاندار وہ ہی ہے جو گاہک کو ایک کتاب کی طرح پڑھے۔ جو گاہک کی ضرورت کو اپنی ضرورت بنائے۔ جو گاہک کے دل کی دھڑکن کو اپنے سینے میں محسوس کرنے لگے۔ جو یہ جانے کہ گاہک اس سے کیا چاہتا ہے۔ جو یہ جانے کہ گاہک خود اپنی چاہت کے اعتبار سے کس چیز سے مطمئن ہوگا۔

ایک دکاندار وہ ہے جو سڑک پر دکان کھول کر بیٹھ جائے۔ کوئی گاہک آئے تو نرخ نامہ دیکھ کر اس کو دام بتادے۔ گاہک اگر سامان طلب کرے تو اس کو دے دے۔ اور اگر وہ سامان دیکھ کر رکھ دے تو دکاندار دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ جائے یا اطمینان کے ساتھ اخبار پڑھنے لگ جائے۔

دوسرا دکاندار وہ ہے جس کا جسم دکان میں ہو مگر اس کا دماغ سڑکوں اور بازاروں میں گھوم رہا ہو۔ ذہنی اعتبار سے وہ گاہک کے درمیان چلنے پھرنے لگے۔ گاہک کے بتانے سے پہلے وہ گاہک کی ضرورت اور اس کی طلب کو جانتا ہو۔ وہ گاہک کو یک طرفہ طور پر خوش کرنے کی کوشش کرے۔

خواہ گاہک نے اسے اپنی کسی بات سے ناراض کر دیا ہو۔ وہ آخری حد تک گاہک کا

www.urdukitabain.blogspot.com

ہمدرد بن جائے۔خواہ گاہک اس کے ہاں پہلی بار آیا ہو۔اور یہ بھی اندیشہ ہو کہ وہ دوبارہ نہیں آئے گا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

موجودہ سماج

انڈین ایکسپریس (۲۴ نومبر ۱۹۸۸) میرے سامنے ہے۔ اس کے صفحہ اوّل پر بتایا گیا ہے کہ دہلی کی ایک ۲۶ سالہ عورت پردیش کو اس کی ساس برسا رانی نے مار ڈالا۔ اس نے اپنی بہو کے اوپر تیل انڈیل دیا اور پھر آگ لگادی۔ صرف اس لئے کہ پردیش نے سسرال والوں کا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے میکے سے دس ہزار روپیہ لا کر انھیں دے، اگلے دن دوبارہ انڈین ایکسپریس (۲۵ نومبر ۱۹۸۸) کے صفحہ اوّل پر یہ سرخی تھی۔ خبر کے مطابق دہلی کی ۲۶ سالہ عورت اروین رانا کو اس کے سسرال والوں نے مار ڈالا۔ دوبارہ وجہ یہ تھی کہ سسرال والوں کے جہیز کے مطالبہ کو اس نے پورا نہیں کیا تھا۔ اس قسم کی خبریں ہر روز اخبار میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ پولیس ان اموات کو جہیز کی موت (Dowry death) کہتی ہے۔ جہیز کی خاطر موت کے بڑھتے ہوئے واقعات کی بنا پر راجیہ سبھا میں اس کی بابت سوال اٹھایا گیا۔ وزارت داخلہ کے منسٹر آف سٹیٹ مسٹر پی چدمبر منے ہندوستان ٹائمس (۲۵ نومبر ۱۹۸۸) کے مطابق جو اعداد وشمار بتائے وہ یہ ہیں۔

۱۹۸۵ میں ـــــ ۹۹۹ موتیں

۱۹۸۶ میں ـــــ ۱۳۱۹

۱۹۸۷ میں ـــــ ۱۷۸۶

ہندوستان کا موجودہ سماج جس وحشت وبربریت کو پہنچ چکا ہے۔ یہ اس کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس قسم کے واقعات بتاتے ہیں۔ کہ آج ہم جس سماج میں رہ رہے ہیں۔ وہ خونخوار بھیڑیوں کا سماج ہے نہ کہ شریف انسانوں کا سماج۔ ایسی حالت میں فرقہ وارانہ فسادات پر چیخ وپکار کرنا، یا ان کے خلاف مذمت کے بیانات دینا ایک ایسا فعل ہے۔ جو احمقانہ ردعمل کے سوا کسی اور خانہ میں جانے والا نہیں۔ ایسی حالت میں کسی سمجھدار

آدمی کے لئے بچاؤ کا راستہ صرف ایک ہے ۔ وہ انسان نما حیوانوں کے ساتھ اعراض کرے ۔ ان کی طرف سے اشتعال انگیز واقعہ پیش آئے ۔ تب بھی وہ مشتعل نہ ہو ۔ کوئی آدمی حیوان سے نہیں لڑتا ۔ حیوان سے اعراض کیا جاتا ہے نہ کہ جنگ ۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

خواب میں

مسٹر رام رتن کپلا ریفریجریٹر اور ائر کنڈیشنز کا بزنس کرتے ہیں۔ان کی فرم کا نام کیپسنس ہے۔نئی دہلی میں آصف علی روڈ پر اس کا صدر دفتر ہے۔

مسٹر رام رتن کپلا کو اپنے فرم کے لئے ایک سلوگن کی ضرورت تھی۔انھوں نے اخبار میں اعلان کیا کہ جو شخص کم لفظوں میں ایک اچھا سلوگن بنا کر دے گا۔اس کو معقول انعام دیا جائے گا۔بار بار کے اعلان کے باوجود کوئی ایسا شخص نہ ملا۔جو انھیں اچھا سلوگن دے سکے۔بعض لوگوں نے کچھ فقرے لکھ بھیجے۔مگر مسٹر کپلا کو وہ فقرے پسند نہ آئے۔سلوگن کو (P e n e r a t i n g) ہونا چاہئے مگر یہ سلوگن (Penerating) نہ تھے۔انھوں نے ۴ دسمبر ۱۹۸۳ کی ایک ملاقات میں کہا۔

مسٹر کپلا اسی ادھیڑ بن میں دن رات لگے رہے۔وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچتے رہے۔ان کا دماغ برابر سلوگن کی تلاش میں لگا ہوا تھا۔مگر کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔اسی فکر میں تقریباً چھ سال گزر گئے۔اس کے بعد ایسا ہوا کہ مسٹر کپلا نے ایک روز رات کو ایک خواب دیکھا۔کہ وہ ایک باغ میں ہیں۔نہایت سہانا موسم ہے۔طرح،طرح کی چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔یہ منظر دیکھ کر وہ بہت خوش ہو گئے۔ان کی زبان سے نکلا:

ویدر(Weather)ہو تو ایسا۔

یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھ کھل گئی۔اچانک انہیں معلوم ہوا کہ انھوں نے وہ سلوگن دریافت کرلیا ہے۔جس کی تلاش میں وہ برسوں سے سرگرداں تھے۔فوراً ان کے ذہن میں یہ انگریزی جملہ مرتب ہو گیا۔

(KAPSONS : the Weather master)

خواب انسانی دماغ کی وہ سرگرمی ہے۔جس کو وہ نیند کی حالت میں جاری رکھتا ہے۔اگر آپ اپنے ذہن کو سارے دن کسی چیز میں مشغول رکھیں۔تو رات کے وقت وہ ہی

www.urdukitabain.blogspot.com

چیز خواب میں آپ کے سامنے آئے گی۔تاریخ کی بہت سی ایجادات خواب کے ذریعہ ظہور میں آئی ہیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ موجد اپنی ایجاد میں اتنا مشغول ہوا۔کہ وہ سوتے میں بھی اسی کا خواب دیکھنے لگا۔خواب دراصل کسی چیز میں کامل ذہنی وابستگی کا نتیجہ ہے۔ایسے آدمی کے عمل کی مدت ۱۲ گھنٹے کی بجائے چوبیس گھنٹے ہو جاتی ہے۔یہ ہی کسی مقصد میں کامیاب ہونے کا راز ہے۔اس قسم کی گہری وابستگی کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں لیا جاسکتا۔دنیا کا اور نہ آخرت کا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

کامیاب سفر

۲۰ جنوری ۱۹۸۴ کی صبح کو تھائی ایرویز کا جہاز (بوئنگ 747) کراچی سے پچھم کی طرف اڑا۔ یہ ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑان کر رہا تھا۔ عین اسی وقت انڈین ایرلائنز کا ایک جہاز بمبئی سے دہلی کی طرف جانے والا تھا۔ انڈین ایرلائنز کے جہاز کو بھی ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑنا تھا۔

اس کی روانگی ہونے ہی والی تھی۔ کہ عین وقت پر معلوم ہوا۔ کہ تھائی ایرویز کا جہاز اسی سمت میں آرہا ہے۔ اگر انڈین ایرلائنز کا پائلٹ اپنے پروگرام کے مطابق اپنا جہاز اڑاتا تو مدھیہ پردیش کے اوپر دونوں کا ٹکراؤ ہو جاتا۔

تھائی ایرویز کا جہاز بھی اپنے تمام مسافروں کے ساتھ برباد ہو جاتا۔ اور انڈین ایرویز کا جہاز بھی (ٹائمس آف انڈیا ۲۵ جنوری ۱۹۸۴)

ایرٹرافک کنٹرول کو بالکل آخری وقت میں اس کی اطلاع مل سکی۔ اس نے فوراً انڈین ایرلائنز کے کپتان سے کہا کہ تم یا تھائی ایرویز جہاز سے نیچے (پچیس ہزار فٹ) کی بلندی پر اڑان کرو۔ یا اگر تم ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اپنا جہاز اڑانا چاہتے ہو تو پچیس منٹ دیر سے اڑان شروع کرو۔ انڈین ایرلائنز کے کیپٹن نے دوسری تجویز کو پسند کیا۔ اور پچیس منٹ کی دیر کے بعد اپنا جہاز اڑایا۔ اس طرح دو جہاز بین فضائی ٹکراؤ سے بچ گئے۔ انڈین ایرلائنز کا جہاز اپنے ابتدائی پروگرام کے مطابق مدھیہ پردیش کے اوپر سے صبح ساڑھے سات بجے گزرا۔

انڈین ایرلائنز کے ایک افسر نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ کہ یہ ایک معجزہ تھا۔ جس نے دونوں جہازوں کے مسافروں کو بچا لیا۔

یہی وسیع تر اعتبار سے زندگی کا معاملہ بھی ہے۔ اگر آپ ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑنا چاہتے ہیں۔ تو اس کو نہ بھولئے کہ یہاں دوسرے لوگ بھی ہیں۔ اور وہ بھی ۲۹ ہزار

www.urdukitabain.blogspot.com

فٹ کی بلندی پر اڑان کر رہے ہیں۔ایسی حالت میں آپ کے لئے دو ہی صورتیں ہیں۔یا تو دوسروں کا لحاظ کئے بغیر اپنی اڑان شروع کردیں۔اور پھر تباہ ہو کر قربانی کی جھوٹی مثال قائم کریں۔یا، پھر یہ معجزہ دکھائیں کہ دوسرے سے نیچے اڑ کر آگے نکل جائیں۔یا آدھ گھنٹہ کی تاخیر سے اپنی اڑان شروع کریں۔دونوں صورتوں میں آپ کامیاب رہیں گے۔اور حفاظت کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچیں گے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ممکن اور ناممکن

سابق وزیر اعظم ہندلال بہادر شاستری جنوری ۱۹۶۶ میں انتقال کر گئے۔اس کے بعد کانگریس پارٹی نے مسز اندرا گاندھی کو وزیر اعظم بنایا۔تاہم مرار جی ڈیسائی سے ان کی کشمکش جاری رہی۔کیونکہ وہ خود وزیر اعظم بنناچاہتے تھے۔۱۹۶۷ کے الیکشن کے بعد مرار جی ڈیسائی کو نائب وزیر اعظم بنایا گیا۔

مگر مرار جی ڈیسائی نائب وزیر اعظم کے عہدہ کو اپنے لئے کم تر سمجھتے تھے۔چنانچہ کشمکش بدستور جاری رہی۔سابق وزیر اطلاعات مسٹر اندر کمار گجرال نے لکھا ہے کہ ۱۹۶۹ میں مسز اندرا گاندھی نے ان کے ذریعے مرار جی ڈیسائی کو یہ پیش کش کی کہ ان کو مزید اعزاز دے کر راشٹر پتی (پریسیڈنٹ) کا عہدہ دے دیا جائے۔مسٹر گجرال کا بیان ہے کہ جب انھوں نے یہ پیش کش مرار جی ڈیسائی کے سامنے رکھی تو بلاتاخیر ان کا جواب یہ تھا۔(Why not she her self)

اندرا گاندھی خود کیوں نہیں (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ جولائی ۱۹۷۸) یعنی اندرا گاندھی خود پریسیڈنٹ بن جائیں۔اور مجھے وزیر اعظم بنا دیں۔واقعات بتاتے ہیں۔کہ مرار جی ڈیسائی کانگریس سے الگ ہو گئے۔انھوں نے وزیر اعظم بننے کے لئے سارے ملک کو اُلٹ پلٹ ڈالا۔مارچ ۱۹۷۷ کے الیکشن میں جنتا پارٹی کی جیت کے بعد وہ مختصر مدت کے لئے وزیر اعظم بن بھی گئے۔مگر جلد ہی وہ سیاسی زوال سے دوچار ہوئے اور پھر کبھی نہ ابھر سکے۔

مرار جی ڈیسائی کی سیاسی ناکامی کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ ممکن کو چھوڑ کر ناممکن کی طرف دوڑے۔اگر وہ اس راز کو جانتے کہ موجودہ حالات میں ان کے لئے جو آخری ممکن چیز ہے وہ صدارت ہے۔نہ کہ وزارت عظمیٰ تو یقیناً وہ ذلت اور ناکامی سے بچ جاتے۔مگر ناممکن کے پیچھے دوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممکن سے بھی محروم ہو کر رہ گئے۔

ناممکن کے پیچھے دوڑنا آدمی کو ممکن سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ جب کہ ممکن پر قانع ہونے والا ممکن کو بھی پاتا ہے۔ اور بالآخر ناممکن کو بھی

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ہر قسم کے مواقع

۲۶ فروری ۱۹۸۸ کی صبح کو دہلی کے تمام اخبارات کے پہلے صفحہ کی نمایاں سرخی یہ تھی :- ہندوستان کے پہلے میزائل کا کامیاب تجربہ۔ ۲۵ فروری کو پارلیمنٹ میں تالیوں کی گونج کے درمیان وزیراعظم راجیو گاندھی نے اعلان کیا۔ کہ ہندوستان نے زمین سے زمین پر مار کرنے والا میزائل (پرتھوی) تیار کر لیا ہے۔ اور اس کا کامیاب تجربہ بھی کیا جا چکا ہے۔

یہ میزائل مکمل طور پر ہندوستانی ٹیکنالوجی سے تیار کیا گیا ہے۔ اور خالص دفاعی نوعیت کا ہے۔ اور اس کا رینج ۲۵۰ کلومیٹر ہے۔ اس طرح اب ہندوستان ان چار ملکوں (امریکہ، روس، فرانس، چین) میں شامل ہو گیا ہے۔ جو خشکی پر مار کرنے والے میزائل بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس میزائل کے بارے میں جو خبر آئی ہے، ان میں سے ایک خبر (ہندوستان ٹائمس ۲۶ فروری ۱۹۸۸) یہ ہے کہ پرتھوی میز الحید رآباد کے دفاعی تحقیقی ادارہ کی لیبارٹری میں تیار کیا گیا ہے۔ یہ کام سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے انجام دیا ہے جو ڈاکٹر ابو کلام کی ماتحتی میں کام کر رہی ہے۔

دفاعی ریسرچ کا کام بے حد نازک کام ہے۔ اس شعبہ میں کام کرنے کے لئے ایسے افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جو بیک وقت دو صلاحیتیں رکھتے ہوں۔ اعلیٰ فنی مہارت اور قابل اعتماد شخصیت۔

اس قسم کے ایک ممتاز عہدہ کے لئے ڈاکٹر ابوالکلام کا انتخاب بہت بڑا سبق دیتا ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ہندوستان میں اقلیتوں کے لئے ہر قسم کی ترقی کے مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اپنے اندر لیاقت پیدا کریں۔ تو وہ ملک کے انتہائی اعلیٰ شعبوں میں بھی اونچے مناصب حاصل کر سکتے ہیں۔

www.urdukitabain.blogspot.com

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں اصل قیمت لیاقت کی ہے۔ لیاقت کا ثبوت دینے کے بعد آدمی ہر جگہ عزت پالیتا ہے۔ اور لیاقت کا ثبوت نہ دینے کی صورت میں ہر جگہ بے عزت ہو کر رہ جاتا ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

معذوری کے باوجود

میں نے ۱۹۸۲ میں اپنا پاؤں کھو دیا تھا۔ اور اسی وقت سے میں دنیا کے گرد سمندری سفر کرتا رہا ہوں۔ یہ بات ٹرسٹن جونز نے تھائی لینڈ کے معذور بچوں کے ایک گروپ سے بینکاک میں کہی۔ وہ ایک ملاح اور منصف اور مہم جو ہیں۔ ان کا پیغام بہت واضع تھا۔ آپ یہ انتظار نہ کریں کہ دوسرے لوگ آپ کی مدد کریں۔

آپ کو اپنی مدد آپ کرنے کا فن سیکھنا چاہیے۔ اور خود اپنے طریقے پر کام کرنا چاہیے، بارٹش کیپٹن نے کہا۔ ۵۳ سالہ جونز ۱۹۵۲ سے اپنے طریقے پر غیر معمولی کام کرتے رہے ہیں۔ جب کہ وہ برطانیہ کے شاہی بیڑے سے یہ کہہ کر الگ کر دیئے گئے تھے۔ کہ وہ جسمانی طور پر سمندر کے لئے غیر موزوں ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران فوجی ڈیوٹی کرتے ہوئے ان کے ایک پاؤں کو زخم لگا تھا۔ یہ حادثہ بالآخر انہیں معذور قرار دینے تک پہنچا۔ اور ۱۹۸۲ میں ان کا بایاں پاؤں گھٹنے کے اوپر سے کاٹ دیا گیا۔ ۱۹۵۳ سے مسٹر جونز دنیا کے سامنے یہ ثابت کرتے رہے ہیں۔ کہ وہ کچھ اور ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ جسمانی طور پر سمندر کے لئے غیر موزوں ہرگز نہیں۔ پچھلے ۳۴ سالوں میں انھوں نے ۶ لاکھ چالیس ہزار کیلومیٹر کا بحری سفر کیا ہے۔ انھوں نے بیس بار اٹلانٹک سمندر کو پار کیا ہے۔ اور کرہ ارض کے گرد تین بحری سفر مکمل کئے ہیں۔

کامیابی کا راز

ڈاکٹر سی ،وی ،رمن (۱۸۸۸۔۱۹۷۰)ہندوستان کے مشہور سائنس دان ہیں ۔۲۸ فروری ۱۹۲۸کو انہیں فزکس کا نوبل انعام ملا۔اس کے بعد وہ عالمی شہرت کے مالک ہو گئے ۔ان کی سائنسی دریافت رمن ایفکٹ (Raman.Effect) آج سائنس کے مسلمات میں شمار ہوتی ہے ۔رمن ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ان کے والد دس روپے ماہوار پر سکول ٹیچر تھے ۔انھوں نے انتہائی مشکل حالات میں اپنی غیر معمولی محنت کے ذریعے علم کی دنیا میں اپنا موجودہ مقام حاصل کیا۔انھوں نے اپنے کامیابی کے سفر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔۔۔شکست ،مایوسی ،محنت اور ہر قسم کے دکھ کی ایک لمبی تاریخ:

ایک شخص نے رمن کی علمی کامیابی کو گھٹانے کے لئے کہا ،کہ آپ اپنی دریافت تک محض اتفاق کے ذریعہ پہنچے ہیں ۔جیسا کہ دوسرے سائنسدان بھی محض اتفاق کے ذریعہ اپنی دریافتوں تک پہنچے ۔رمن نے یہ سن کر سنجیدگی کے ساتھ کہا

یہ تصور کہ سائنسی دریافت اتفاق کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہیں ۔اس حقیقت کی بنا پر خارج از بحث ہیں کہ اتفاق اگر واقعتہً پیش آئے تو وہ بھی ایک صحیح آدمی کے سوا کسی اور کے ساتھ پیش نہیں آتا ۔ڈاکٹر رمن نے اپنی زندگی کی آخری دریافت کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے

The right man,right thinking,right)
(istruments,and right result

صحیح آدمی ،صحیح فکر ،صحیح آلات ،اور پھر صحیح نتیجہ۔(ہندوستان ٹائمس)جنوری ۱۷،۱۹۸۷ء

کتنا فرق

یکم ستمبر ۱۹۸۳ کو کوریا کی ایر لائنز کا ایک مسافر جہاز (Fligt 007) نیو یارک سے سیول کے لئے روانہ ہوا۔ وہ کمپاٹکا (Kamchatka) کے اوپر اڑ رہا تھا کہ روسی فوج نے اسے مار کر گرا دیا۔ اس جہاز پر عملہ سمیت ۲۶۹ مسافر تھے۔ جو سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ اس کے بعد روسی حکومت نے بیان دیا کہ اس جہاز کو مسافر جہاز سمجھ کر نہیں مارا گیا۔ روسی فوج نے اس کو امریکہ کا ایک (جاسوسی جہاز) سمجھا اور مدافعت میں اس پر وار کیا۔ تاہم امریکہ نے اس عذر کو قبول نہ کیا۔ اس نے کہا کہ مذکورہ جاسوسی جہاز اور مسافر جہاز میں اتنا زیادہ فرق تھا کہ راڈار مشین کی سکرین کا مشاہدہ اس کو سمجھنے میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔

۳ جولائی ۱۹۸۸ کو اسی قسم کا ایک اور واقعہ برعکس صورت میں پیش آیا۔ ایران ایر کا ایک مسافر بردار جہاز (Airbus.A.oo3) تہران سے دبئی جا رہا تھا۔ وہ خلیج فارس کے اوپر اڑ رہا تھا کہ امریکی بحریہ کے جنگی جہاز ونسینز نے اس کو مار کر گرا دیا۔ عملہ سمیت اس کے ۲۹۰ مسافر ہلاک ہو گئے۔ امریکہ کی طرف سے دوبارہ اس کی توجیہہ یہ کی گئی کہ امریکی بحریہ نے غلط فہمی میں ایسا کیا۔ اس نے اس جہاز کو مسافر بردار نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کو جنگی جہاز سمجھا۔ اور بچاؤ کے طور پر اس کو اپنے میزائل کا نشانہ بنایا۔ امریکہ کے مخالفین کے لئے یہ توجیہہ قابل قبول نہ ہو سکی۔ انھوں نے کہا کہ ایر بس کے مقابلہ میں مذکورہ جیٹ فائیٹر بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

جب کہ جیٹ فائیٹر کی رفتار ایر بس کے مقابلہ میں تقریباً ۲۵۰ کیلومیٹر زیادہ ہوتی ہے۔ امریکہ کے بحری جہاز کے راڈار سکرین پر یہ فرق واضح طور پر دکھائی دے رہا ہو گا۔ اس لئے دونوں میں اشتباہ ہونے کا کوئی سوال نہیں (ٹائمس آف انڈیا، ۵ جولائی ۱۹۸۸ صفحہ ۱۳)۔

آدمی دوسرے کی غلطی جاننے کے لئے انتہائی ہوشیار ہے، مگر اپنی غلطی کو جاننے کے لئے وہ انتہائی بے وقوف بن جاتا ہے۔ یہی دہرا معیار خرابیوں کی جڑ ہے۔ اگر لوگ ایک معیار والے ہو جائیں تو تمام خرابیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

مقصد کی اہمیت

ضلع حسن کرناٹک میں ایک گاؤں ہے۔جس کا نام تھپٹر گھٹہ ہے۔یہاں ایک شخص لچھ ناٹک نامی تھا۔جو ایک جھونپڑے میں رہتا تھا۔اور چوکیداری کا کام کرتا تھا۔اس کے چار بچے تھے اس نے طے کیا کہ وہ اپنی تینوں لڑکیوں کو دیوی چمند یشوری پر بھینٹ چڑھا دے، ۲۳ اپریل ۱۹۸۸ کو وہ دیوی کی مورت لے کر آیا۔اس کی پوجا کی اور اس کو بعد اپنی تین لڑکیوں (ڈیڑھ سالہ، تین سالہ، تیرہ سالہ) کو درانتی سے ذبح کر دیا۔اس کے لڑکے راج کمہار (۸ سالہ) نے مزاحمت کرنا چاہی تو اس پر بھی حملہ کر دیا۔جس کے نتیجہ میں اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا۔اس مجنونانہ حرکت کے بعد وہ بھاگ کر باہر چلا گیا۔چار دن بعد اس کی لاش آم کے ایک اکیلے درخت سے لٹکی ہوئی پائی گئی۔

مذکورہ خبطی کی بیوی (للّی تھما) کو چیف منسٹر ریلیف فنڈ سے ۵ ہزار روپیہ دیا گیا۔انڈین ریڈ کراس سوسائٹی نے اس کو ایک ہزار روپیہ دیا۔اب وہ اپنے لڑکے کے مستقبل کے بارے میں منصوبہ بنا رہی ہے۔اس کا خیال ہے کہ اس کے لڑکے کو تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔وہ اس کے لئے تیار ہے کہ بیٹے کی تعلیم کے لئے اگر اس کو ساری زندگی کام کرنا پڑے تو وہ ساری زندگی کام کرے گی۔اس کو بیوہ کی حیثیت سے ۵۰ روپے ماہوار پنشن ملنے کی امید ہے۔تقریباً اتنی ہی رقم اس کے بیٹے کو معذوری کے طور پر ملے گی۔راج کمہار جس کے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کٹ چکی ہیں۔اب اپنے بائیں ہاتھ سے لکھنا سیکھ رہا ہے۔(ٹائمس آف انڈیا ۲۸ اپریل ۱۹۸۸) للّی تھما کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔اب بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ بھی خودکشی کر لے، یا اپنے بیٹے کو لے کر ماتم یا رونے میں مشغول ہو جائے

مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔اس نے سب کچھ بھلا کر مثبت عمل کا منصوبہ بنایا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے معذور بیٹے کے مستقبل کی تعمیر کی صورت میں ایک مقصد پالیا تھا

www.urdukitabain.blogspot.com

۔

با مقصد آدمی کبھی محروم نہیں ہوتا، اس دنیا میں محروم وہ ہے جو اپنے مقصد سے محروم ہو جائے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

الٹا کام

ایک شخص اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانا چاہتا ہو۔ اور اس سے کہے کہ تم پہلے بازار میں دکان لے کر ایک مطب کھول لو۔ اس کے بعد ڈاکٹری پڑھتے رہنا۔ اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کو اس قسم کا مشورہ دے تو لوگ اسے پاگل یا غیر سنجیدہ انسان سمجھیں گے۔ کیونکہ ڈاکٹری پہلے سیکھی جاتی ہے اور مطب اس کے بعد کھولا جاتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی الٹا کام ہمارے تمام لیڈر کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی انھیں غیر سنجیدہ نہیں کہتا۔ بلکہ انھیں مفکر اور رہنما کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں جو لیڈر اٹھے وہ تقریباً سب کے سب قوم کو اسی قسم کی لاحاصل رہنمائی دیتے رہے ہے۔ پہلے سیاسی آزادی حاصل کرلو۔ اس کے بعد قومی تعمیر کا کام کرنا۔ پہلے ایک زمینی خطہ حاصل کرلو۔ اس کے بعد وہاں اسلامی نظام جاری کرانا۔ پہلے حکومت کا تختہ الٹ دو۔ اس کے بعد اصلاح معاشرہ کا کام انجام دینا۔ پہلے پارلیمنٹ سے قانون پاس کرالو۔ اس کے بعد لوگوں کی اصلاح کرنا وغیرہ۔

اس قسم کی تمام باتیں اتنی ہی بے معنی ہیں۔ جتنا ڈاکٹری سیکھنے سے پہلے ڈاکٹری دکان کھولنا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سو سال سے بھی زائد لمبی مدت تک ہنگامہ آرائی کرنے کے باوجود مسلمان کے حصہ میں بربادی اور ناکامی کے سوا، اور کچھ نہیں آیا۔

انسان کوئی لوہا لکڑی نہیں ہے جس کو مرحلہ وار گڑھا جا سکے۔ انسان ایک ہی بار بنتا ہے اور جیسا بن جائے اسی پر وہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خارجی انداز کی تحریکیں اپنے دوسرے مرحلے کے منصوبہ میں ہمیشہ ناکام رہتی ہیں۔ خارجی نشانہ پورا کرنے کے بعد ان کے لیڈر افراد کی داخلی اصلاح پر تقریریں شروع کر دیتے ہیں۔ مگر اس قسم کی تقریروں کا ایک فی صد بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کا تجربہ انسانی نفسیات سے بے خبری ہے۔ اور بدقسمتی سے موجودہ زمانے کے تمام مسلم لیڈر نفسیات انسانی

www.urdukitabain.blogspot.com

سے اسی بے خبری کی مثال بنے ہوئے ہیں۔

تعمیر قوم حقیقتاً تعمیر شعور کا دوسرا نام ہے۔ شعور کی تعمیر کے بعد ہر چیز اپنے آپ حاصل ہو جاتی ہے۔ شعور کی تعمیر کے بغیر کوئی بھی چیز حاصل نہیں ہوتی۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

انصاف زندہ ہے

ہندوستان کی سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو ان کی نئی دہلی کی رہائش گاہ میں ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس قتل میں چار آدمی ملوث تھے۔ حفاظتی دستے کے بیانت سنگھ، اور ستونت سنگھ۔ ان دونوں نے وزیر اعظم پر گولیاں چلائیں۔ بیانت سنگھ کو حفاظتی پولیس نے اسی وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اور ستونت سنگھ گرفتار ہو گیا۔ دوسرے دو شخص کیہر سنگھ اور بلبیر سنگھ تھے۔ جن کو قتل کی سازش کرنے اور اس کا منصوبہ بنانے کا مجرم قرار دیا گیا تھا۔

ان تینوں پر مقدمہ چلا۔ دہلی کے ایڈیشنل جج مہیش چندر نے ۲۲ جنوری کو اپنا فیصلہ سنایا۔ جس میں ستونت سنگھ، کیہر سنگھ اور بلبیر سنگھ کو موت کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد مقدمہ ہائی کورٹ میں گیا۔ دہلی ہائی کورٹ نے ۳ دسمبر ۱۹۸۶ کے فیصلہ میں تینوں کے لئے سزائے موت کی توثیق کر دی۔ اس کے بعد ملزمان اس مقدمہ کو سپریم کورٹ میں لے گئے۔ سپریم کورٹ نے ۳، اگست ۱۹۸۸ کو اپنا متفقہ فیصلہ سنایا۔ یہ فیصلہ مسٹر جسٹس جی ایل اوزا، مسٹر جسٹس سیٹھی، مسٹر جسٹس بی سی رائے پر مشتمل ایک ڈویژنل بنچ نے سنایا تھا۔

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں ستونت سنگھ اور کیہر سنگھ کی سزائے موت بحال رکھی مگر بلبیر سنگھ کو اس نے مکمل طور پر بری قرار دیا۔ بلبیر سنگھ کے خلاف قتل میں ملوث ہونے کی براہ راست شہادت نہیں ملی۔ مثلاً استغاثہ کی طرف سے ایک بات یہ کہی گئی تھی، کہ مسز اندرا گاندھی کا قتل اس لئے ہوا کہ آپریشن بلیو سٹار کی وجہ سے سکھ ان سے بگڑ گئے تھے۔ اور خود بلبیر سنگھ کی زبان سے انتقام کی بات سنی گئی تھی۔ اس دلیل کا ذکر کرتے ہوئے جسٹس اوزا نے لکھا ہے کہ اگر بلیو سٹار آپریشن پر غصہ یا احتجاج کے اظہار کو

ملزم کے خلاف شہادت یا قرینہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو سکھ فرقہ کے تمام افراد جو بلیو سٹار آپریشن پر برہم ہو گئے تھے، ان سب کو قتل کی سازش میں شریک کرنا پڑے گا ۔مسٹر جسٹس اوزا نے مزید لکھا کہ بلبیر سنگ کو چھوڑنے میں غلطی کرنا اس سے بہتر ہے کہ اس کو سزا دینے میں غلطی کی جائے۔

اس واقعہ پر صرف وہ تبصرہ نقل کرنا کافی ہے۔جو بلبیر سنگھ نے کہا: اس نے کہا مجھے انصاف کی ذرا بھی امید نہ تھی۔مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس ملک میں انصاف زندہ ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net
WWW.
All rights reserved.
©2002-2006

تخریب نہیں

کورین ایر کی فلائٹ ۸۵۸، نومبر ۱۹۸۷ کی ۲۹ تاریخ کو بغداد سے اڑی، اسے سی، اول پہنچنا تھا۔ وہ بحر انڈمان کے اوپر ۳۷ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہی تھی کہ اچانک دھماکہ ہوا، اور اس کے ۱۱۵ مسافر فضا ہی میں ہلاک ہو گئے۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ پائلٹ ایر پورٹ کو سگنل بھی نہ بھیج سکا۔ جب کہ اس کے لئے ایک سیکنڈ کا وقت درکار تھا۔ جہاز کی تباہی کا یہ منصوبہ شمالی کوریا کی طرف سے بنایا گیا تھا۔ منصوبہ کے تحت شمالی کوریا کی ایک ۲۴ سالہ عورت کو تربیت دے کر جہاز کا سفر کرایا گیا۔ وہ بغداد سے اس جہاز پر سوار ہوئی، اور جہاز کے اوپر کے خانہ میں ایک ٹرانسسٹر بم رکھ کر ابوظہی میں اتر گئی۔ یہ ایک طاقتور ٹائم بم تھا۔ وہ اپنے وقت پر پھٹا اور پورا جہاز اچانک تباہ ہو گیا۔

اس منصوبہ کا مقصد اولمپک ۱۹۸۸ کو ناکام بنانا تھا۔ جو جنوبی کوریا کے سی، اول میں ہو رہا تھا۔ شمالی کوریا کی اشتر کی حکومت کو یہ اعزاز پسند نہ تھا شمالی کوریا کے اسٹالینی ڈکٹیٹر کم ال سنگ نے اپنی خفیہ ایجنسی کو حکم دیا۔ کہ جنوبی کوریا کے جہاز کو بم سے اڑا دو۔ تاکہ جنوبی کوریا کا سفر لوگوں کو غیر محفوظ معلوم ہونے لگے۔ اور لوگ اولمپک میں شرکت کا ارادہ چھوڑ دیں۔

اس تخریبی مقصد کے تحت مذکورہ جہاز کو تباہ کیا گیا۔ جنوبی کوریا کے جہاز کو تباہ کرنا نہایت بیہودہ جرم تھا، مگر دہشت گردی کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔ کوئی بھی ملک اس کے ڈر کر اولمپک میں شرکت سے نہیں رکا۔

اس کے برعکس ۱۶۱ ملکوں نے اس میں شریک ہونے کا اعلان کیا۔ اور وہ سب اس میں شریک ہوئے۔ یہ تعداد کسی بھی پچھلے اولمپک سے زیادہ ہے۔: کسی کے خلاف تخریب کاری خود اپنے خلاف تخریب کاری ہے۔ ایسا آدمی صرف اپنا نقصان کرتا ہے وہ کسی

www.urdukitabain.blogspot.com

دوسرے شخص کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
اقبال سائبر لائبریری
©2002-2006

کمی کی تلافی

قیصر ولیم دوم (Friedrich William 11) ۱۸۸۸ سے 1918 تک جرمنی کا بادشاہ تھا۔ اس کا بایاں بازو پیدائشی طور پر ناقص اور چھوٹا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے غیر متعدل مزاج کا سبب اس کا یہی عضویاتی نقص تھا۔

قیصر ولیم ہی کی غیر مدبرانہ سیاست کے نتیجہ میں پہلی جنگ (۱۹۱۴۔۱۹۱۸) چھڑی۔ اس میں ایک طرف جرمنی اور اس کے ساتھی تھے۔ اور دوسری طرف برطانیہ اور اس کے ساتھی تھے۔ آخر کار جرمنی کو شکست ہوئی۔ اسی کے ساتھ ہی قیصر ولیم کی حکومت ختم ہوگئی۔

قید یا قتل سے بچنے کے لئے اس نے اپنا ملک چھوڑ دیا اور وہ نیدر لینڈ چلا گیا۔ وہاں وہ دوم میں خاموشی سے دن گزارتا رہا۔ یہاں تک کہ ۴ جون ۱۹۴۱ کو ۸۲ سال کی عمر میں مر گیا۔

پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے۔ قیصر ولیم دوم ایک سرکاری دورے پر وہ سوئٹزرلینڈ گیا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ سوئٹزرلینڈ اگرچہ ایک چھوٹا سا ملک ہے مگر اس کی فوج بہت منظم ہے۔ اس نے ملاقات کے دوران سوئٹزرلینڈ کے ایک فوجی سے مزاحیہ انداز میں کہا کہ جرمنی کی زبردست فوج جس کی تعداد تمہاری فوج سے دوگنی ہو، اگر تمہارے ملک پر حملہ کر دے تو تم کیا کرو گے۔ اعلیٰ تربیت یافتہ فوجی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا:

سر ہمیں بس ایک کی بجائے دو فائر کرنا پڑیں گے۔

سوئس فوجی کا یہ چھوٹا سا جملہ ایک بہت بڑی حقیقت کا اعلان ہے۔۔۔ وسائل اگر کم ہوں تو کارکردگی کی زیادتی سے آپ اس کی تلافی کر سکتے ہیں۔ آپ کی تعداد اگر فریق ثانی کی تعداد کا نصف ہے۔ تو آپ دوگنی محنت کا ثبوت دے کر زندگی کے میدان میں

اس کے برابر ہو سکتے ہیں۔

زندگی کی جد وجہد میں کبھی کوئی آگے بڑھ جاتا ہے اور کوئی پیچھے ہو جاتا ہے۔کوئی غالب ہو جاتا ہے اور کوئی مغلوب،مگر اس دنیا کے امکانات اتنے زیادہ ہیں۔کہ کبھی کسی کے لئے حد نہیں آتی،یہاں ہر پچھڑے ہونے کے لئے دوبارہ آگے بڑھنے کا امکان ہے۔ضرورت صرف یہ ہے کہ آدمی زیادہ بڑی مقدار میں عمل کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

عبرت ناک

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اپریل ۱۹۸۸) میں ایک خبر اورنگ آباد کے میونسپل کارپوریشن کے الیکشن (اپریل ۱۹۸۸) سے متعلق ہے۔ جہاں شیو سینا نے ۶۰ سیٹوں میں سے ستائیس سیٹوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ شیو سینا تین سال پہلے ختم شدہ طاقت کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ نیز اس سے پہلے وہ زیادہ تر بمبئی کی ایک جماعت سمجھی جاتی تھی۔ مگر اورنگ آباد کے الیکشن نے ظاہر کیا کہ وہ نہ صرف ازسرنو زندہ ہوگئی ہے۔ بلکہ اس نے پورے مہاراشٹر میں اپنے اثرات پھیلا لیے۔ شیو سینا نے یہ کامیابی ہندو ایکتا کا نعرہ لگا کر حاصل کی۔ اس کا ایک خاص نعرہ یہ تھا۔ گورو سے کہو ہم ہندو ہیں۔

اورنگ آباد میں ۲۵ فی صد سے زیادہ مسلمان ہیں۔ بعض حلقہ انتخاب سے ہیں۔ جہاں مسلم ووٹ اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر شیو سینا نے ایک خاص مسلم حلقہ میں بھی کامیابی حاصل کی۔ یہاں تین مسلم امیدوار تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے ووٹ بٹ گئے۔

یہ واقعہ مسلمانوں کی دُہری نادانی کو بتا رہا ہے۔ یہ درحقیقت مسلمان ہیں۔ جنھوں نے شوروغل کرکے اس کو زندہ کیا۔ مسلمان اگر اس کے معاملہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کرتے تو اب تک وہ اپنے آپ ختم ہوجاتی۔ مزید یہ کہ جس جماعت کو وہ اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ بتاتے ہیں۔ اس کے خلاف بھی وہ متحد نہ ہوسکتے۔ حتیٰ کہ اپنے عدم اتحاد کی وجہ سے بالواسطہ طور پر اس کی کامیابی کا سبب بن جاتے ہیں۔

جن لوگوں کا یہ حال ہو، ان کے بارے میں جو بات کہی جاسکتی ہے۔ وہ یہ کہ سچا عمل تو درکنار، جھوٹا عمل کرنے کی صلاحیت بھی ان کے اندر باقی نہیں۔ بولنا تو درکنار، نہ بولنے کا فن بھی انھیں نہیں آتا۔

بڑا اندیشہ

ڈاکٹر ڈینس بریو نے ان طبی ماہرین سے ملاقاتیں کیں۔اوران کا انٹرویولیا۔جو مشہور شخصیتوں کے معالج رہے ہیں۔اس کے بعد انہوں نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام غیر معمولی احتیاط ہے۔اس کتاب میں مصنف نے بڑے عجیب انکشافات کیے ہیں۔

انھوں نے لکھا کہ مشہور شخصیتیں اکثر ناممکن مریض ثابت ہوتی ہیں۔مچلا ہٹلر کو ایک جلدی مرض تھا۔مگر اس نے اس بات کو اپنے لئے فروتر سمجھا کہ ڈاکٹر کے سامنے وہ اپنا کپڑا، اتارے۔چنانچہ صحیح طور پر اس کا علاج نہ ہو سکا۔مشہور امریکی دولت مند ہوورڈ ہیوز (Howard hug (hes کا دانت خراب تھا۔مگر اس نے کبھی ڈاکٹر کے سامنے اپنا منہ نہیں کھولا۔اس نے اس کو پسند کیا کہ وہ شراب پی کر اپنی تکلیف بھلاتا رہے وغیرہ۔

شاہ ایران کے بارے میں مصنف نے بتایا کہ وہ فسادخون کے مریض تھے۔مگر انھوں نے ڈاکٹروں سے اس کا علاج کرانے سے انکار کردیا کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ یہ چیز انہیں سیاسی طور پر کمزور کردے گی۔

شاہ ایران نے فسادخون کو اپنی حکومت کے لئے خطرہ سمجھا۔حالانکہ بعد کہ واقعات نے انہیں بتایا کہ فساد سیاست ان کی حکومت کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھا۔ان کے اقتدار کو جس چیز نے ختم کیا وہ فسادخون کا مسئلہ نہیں تھا۔بلکہ فساد سیاست کا مسئلہ تھا۔وہ بڑے خطرے سے غافل رہے اور اپنی ساری توجہ چھوٹے خطروں پر لگادی۔نتیجہ یہ ہوا کہ عین اس وقت ان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔جب کہ اپنے نزدیک وہ اس کو بچانے کا پورا اہتمام کرچکے تھے۔

چھوٹے اندیشوں کی فکر کرنا اور بڑے اندیشوں سے غافل رہنا، یہی اکثر انسانوں کی

ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ خواہ وہ مشہور لوگ ہوں یا غیر مشہور لوگ۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بعد از وقت

مسٹر بوکاسا، ۱۹۲۱ میں پیدا ہوئے۔ وہ سینٹرل افریقہ کی فوج میں جنرل تھے۔ وہ اپنے اس عہدہ پر قناعت نہ کرسکے۔ جنوری ۱۹۶۶ میں انہوں نے فوجی بغاوت کردی۔ اور صدر ڈیوڈ ڈاکو، کو معزول کر کے خود سنٹرل افریقہ کے صدر بن گئے۔ صدر بوکاسا صدر بننے پر بھی قانع نہ ہوئے کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ اگلے الیکشن میں وہ صدارت کھودیں گے۔ چنانچہ ۱۹۷۶ میں انھوں نے پارلیمنٹ کو ختم کر کے اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کردیا۔ اب انہوں نے تاج پہن لیا اور شہنشاہ بوکاسا کہے جانے لگے۔

تاہم مسئلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اب شہنشاہ بوکاسا کا سامنا اس چیز سے تھا جس کو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے (Realtites of French economic control) سے تعبیر کیا ہے۔ سنٹرل افریقہ کی قیمتی کانیں فرانس کے قبضہ میں تھیں۔ نئے سیاسی نظام میں فرانس کو اپنا مفاد خطرے میں نظر آیا۔ چنانچہ فرانس کی مدد سے ۱۹۸۰ میں ایک اور فوجی انقلاب ہوا، اور مسٹر، ڈیوڈ ڈاکو دوبارہ سنٹرل افریقہ کے صدر بنادیے گئے۔ جون ۱۹۸۷ میں بوکاسا کو پھانسی دے دی گئی۔

انقلاب کے بعد مسٹر بوکاسا ملک سے باہر جانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ اکتوبر ۱۹۸۶ میں دوبارہ سنٹرل افریقہ واپس آئے۔ ملک میں داخل ہوتے ہی انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ (انڈین ایکسپریس ۹ جون ۱۹۸۷) ان کے اوپر بہت سے سنگین الزامات تھے۔ مثلاً ۴۰ آدمیوں کو قتل کرانا۔ سرکاری خزانہ سے کروڑوں ڈالر رشوت دینا وغیرہ۔ اسٹیٹ پراسیکیوٹر مسٹر جبریل مبوودو نے بینگوئی کی کریمنل عدالت سے کہا تھا کہ مسٹر بوکاسا نے اپنے چودہ سالہ زمانہ حکومت میں جو جرائم کئے ہیں۔ اس کے بعد ضروری ہے کہ انہیں سزائے موت دی جائے۔ ۸ جون ۱۹۸۷ کو مسٹر بوکاسا کی پیشی عدالت میں ہوئی تو انہوں نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا کہ آج میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ

معمولی شہری کی حیثیت سے پرامن زندگی گزاروں۔

آدمی اگر قناعت سے زندگی گزارے تو وہ کبھی ذلت اور ناکامی سے دوچار نہ ہو۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

چرچل کا اقرار

سرونسٹن چرچل (۱۸۷۴-۱۹۵۶) انگلستان کے مشہور سیاست دان تھے۔

وہ (۱۹۴۰ سے ۱۹۴۵) تک برطانیہ کے وزیر اعظم رہے۔ ان کے متعلق مورخین مغرب یہ الفاظ لکھتے ہیں کہ انھوں نے دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کو شکست سے بچا کر فتح تک پہنچایا۔

چرچل جنگ کے رہنما تھے مگر وہ امن کے رہنما نہ تھے۔ برطانیہ کے لوگوں کا یہ سیاسی شعور قابل داد ہے کہ جنگ عظیم کے فوراً بعد عام الیکشن ہوئے تو انھوں نے اپنے جنگی ہیرو کے حق میں ووٹ نہیں دیا۔ کیونکہ جنگ کے بعد برطانیہ کی تعمیر نو کے لئے وہ چرچل کو موزوں نہیں سمجھتے تھے۔

چرچل کے اندر بڑی عجیب وغریب خصوصیات تھیں۔ ان کی ایک خصوصیت کا ذکر مسز وجے لکشمی پنڈت نے اپنی سوانح عمری میں اس طرح کیا ہے۔

ہندوستان کے مطالبہ آزادی کے جواب میں چرچل نے اعلان کیا تھا کہ وہ سلطنت برطانیہ کے وزیر اعظم اس لئے نہیں بنے ہیں کہ وہ اس کے خاتمہ کی تقریب کی صدارت کریں۔ یہ بات قابل تعجب نہیں ہے کہ ہم ان سے محبت نہیں کرتے تھے۔ جو چیز قابل تعجب ہے وہ یہ ہے کہ آخر میں جب وہ میرے بھائی جواہر لال نہرو سے اس وقت ملے جب کہ عبوری حکومت بن چکی تھی۔ تو دونوں نے ایک دوسرے کو چاہا اور دونوں میں آزادانہ گفتگو ہوئی۔ جب وہ جدا ہوئے تو چرچل نے جواہر لال کو یہ کہہ کر مبارک باد دی کہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے انسان کے دو سب سے بڑے دشمنوں پر فتح پائی ہے۔ وہ ہیں نفرت اور خوف۔

کتنا مشکل کتنا آسان

ایک صاحب ملے ان کے پاس یونیورسٹی کی ایک بڑی ڈگری ہے۔ ملاقات کے دوران انھوں نے کہا مولانا صاحب آپ انگریزی رسالہ نکالتے ہیں۔ مگر آپ کے رسالہ کی انگریزی غلط ہوتی ہے۔ میں نے کہا آپ زبان کی غلطی کی کوئی مثال دیجیے۔ ان کے ہاتھ میں اس وقت الرسالہ (ماہ نومبر ۱۹۸۶) تھا اس شمارہ کے ٹائٹل کے آخری صفحہ پر ایک مضمون انگریزی زبان میں شائع ہوا ہے (یہ مضمون الرسالہ اردو اور انگریزی) دونوں میں موجود ہے۔ یہ انگریزی مضمون حسب ذیل ہے۔

مذکورہ بزرگ نے اس عبارت کی چوتھی سطر میں لفظ (sent) پر نشان لگاتے ہوئے کہا کہ دیکھیے یہ غلط ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں If you send ہونا چاہیے تھا۔ نہ کہ If you sent جیسا کہ آپ نے لکھا ہے

مگر جو لوگ انگریزی زبان سے بخوبی واقف ہیں وہ جانتے ہیں۔ کہ یہ اعتراض درست نہیں۔

میں نے جواب دیا کہ معاف کیجیے آپ نے یہ بات محض جوش اعتراض میں فرمائی ہے۔ نہ کہ بر بنائے واقفیت آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے اپنے اعتراض کی تحقیق کے لئے گرائمر کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ آپ ہرگز ایسا نہ فرماتے۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہاں پرنسپل کلاز میں چونکہ لفظ (would) استعمال ہوا ہے۔ اس بنا پر سب آرڈینیٹ کلاز میں بھی (sent) سکنڈ فارم استعمال کیا جائے گا۔ یہی انگریزی گرائمر کا اصول ہے۔:

میرے اس جواب پر وہ بزرگ چپ ہو گئے لیکن انھوں نے اپنی زبان سے اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ تم غلطی پر ہو کہنا کتنا زیادہ آسان ہے۔ اور میں غلطی پر ہوں کہنا کتنا زیادہ مشکل۔

www.urdukitabain.blogspot.com

اعتراف

سید مشتاق علی کرکٹ کے انتہائی مشہور کھلاڑی ہیں۔مسٹر شردو رمانے ان سے انٹرویو لیا ۔جو ہندوستان ٹائمس (۱۵ مئی ۱۹۸۷) میں شائع ہوا ہے وہ لکھتے ہیں۔کہ ہماری کرکٹ کی تاریخ میں بہت کم افراد نے وہ مقام حاصل کیا ہے،جو سید مشتاق علی نے حاصل کیا۔تقریباً بیس سال تک وہ کرکٹ کے ہیرو بنے رہے۔ان کے متعلق سر کار ڈوس نے کہا تھا کہ مشتاق گویا،بازیگر ہے۔جو کامیابی حاصل کرنے کے لئے ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔اسی طرح کیتھ ملر(Kath miller) نے کہا کہ وہ ہمارے وقت کے نا قابل یقین حد تک اچھے کھلاڑی ہیں۔

سید مشتاق علی کی شہرت ۱۹۳۰ میں شروع ہوئی جب کہ ان کی عمر صرف سولہ سال تھی۔وہ اگر چہ کم کھیلتے تھے مگر جب کھیلتے تھے تو ان کا کھیل سب سے ممتاز ہوتا تھا۔۱۹۴۵۔۴۶ میں کلکتہ میں آسٹریلیا کی ٹیم اور ہندوستان کی ٹیم کا مقابلہ تھا۔سید مشتاق علی کو ہندوستان کی ٹیم سے خارج کر دیا گیا۔اس پر کلکتہ میں زبردست مظاہرے ہوئے۔اور ہر طرف یہ نعرہ گونج اٹھا۔

No mustaq No Test

آخر کار منتظمین کو سید مشتاق علی کو ٹیم میں شامل کرنا پڑا۔اب سید مشتاق علی کی عمر بہتر سال ہو چکی ہے۔مسٹر شردو رما سے انہوں نے اپنے حالات بتاتے ہوئے انھوں نے کہا۔کہ ایک بار انگلینڈ میں ہندوستانی اور انگریزی ٹیم کا مقابلہ تھا۔انگریزی ٹیم کے کپتان ویلی ہیمنڈ تھے(Vally Hammond) تھے۔سید مشتاق نے رن بنانے شروع کیے۔یہاں تک کہ وہ نوے سے آگے بڑھ گئے۔ویلی ہیمنڈ اگر چہ مخالف ٹیم کے کپتان تھے۔وہ اپنے جذبہ اعتراف کو نہ روک سکے۔انھوں نے تیزی سے آکر مشتاق کا کندھا تھپتھپایا اور کہا جمے رہو میرے بیٹے جمے رہو،اپنا سو پورا کرو۔

مردہ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت بے اعترافی ہے۔ اور زندہ انسان کی سب سے بڑی خوبی اعتراف۔ زندہ انسان کے سامنے ایک حقیقت آئے یا وہ ایک خوبی کا مشاہدہ کرے تو وہ اس کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا، خواہ یہ اعتراف اپنی ہار ماننے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

حوصلہ

دہلی کی ایک کالونی وسنت وہار ہے۔ یہاں ایک خاتون کملا دیوی اگروال اپنے بیٹے اور پوتے کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ ان کی عمر ۹۹ سال ہو چکی تھی۔ بڑھاپے کی وجہ سے وہ زیادہ تر اپنے بستر پر رہتی تھیں۔

۱۵ دسمبر ۱۹۸۸ کو ایک حادثہ ہوا۔ ان کے گھر کے پچھلے دروازے کو کسی طرح کھول کر تین چور اندر داخل ہو گئے۔ گھر کے لوگ بیدار ہو گئے اور چور اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ تاہم وہ بوڑھی کملا دیوی کے کمرے سے نقد اور سامان کی صورت میں دس ہزار کی چیز لے کر فرار ہو گئے۔

چوروں نے کملا دیوی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اور نہ انہیں مارنے کی کوشش کی۔ تاہم وہ صبح کا مری ہوئی پائی گئی۔ (رپورٹ ٹائمس آف انڈیا ۱۶ دسمبر ۱۹۸۸) کے مطابق انھوں نے چور کی طرف ایک نظر دیکھا اور اچانک صدمے سے وہ مر گئیں:

مذکورہ مکان میں کملا دیوی بھی تھیں اور ان کے بیٹے اور پوتے بھی۔ مگر چور کو دیکھ کر بیٹے اور پوتے کی وفات نہیں ہوئی، البتہ بوڑھی کملا دیویا چانک ختم ہو گئیں۔ ان دونوں کے درمیان وہ کیا فرق تھا، جس کی وجہ سے ان کے انجام کے درمیان فرق ہو گیا۔ وہ فرق ہمت کا تھا۔ بیٹے اور پوتے میں ہمت تھی وہ جھٹکے کو سہہ سکتے تھے۔ اس لئے وہ لوگ بچ گئے مگر بوڑھی عورت اپنے اندر سہار کی طاقت کھو چکی تھی۔ وہ چوروں کو دیکھتے ہی جان بحق ہو گئی۔

یہ دنیا حادثات کی دنیا ہے۔ یہاں ہمیشہ ناموافق حالات پیش آتے ہیں۔

ایسی حالت میں موجودہ دنیا میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو ہمت والا ہو۔ جو ناخوشگوار حالات کے مقابلہ میں ٹھہر سکے۔ جس کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو، اس کا وہی انجام ہوگا جو مذکورہ بوڑھی عورت کا ہوا۔ حوصلہ مندی کمزور آدمی کو طاقتور بنا دیتی ہے

www.urdukitabain.blogspot.com

۔اور اگر حوصلہ نہ ہو تو طاقت ور آدمی بھی مغلوب اور کمزور ہو کر رہ جاتا ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

اپنے خلاف

موجودہ سائنسی زمانہ میں جو نئے ہتھیار ایجاد ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ زہریلی گیسوں کو جمع کر کے ان کے بم بنائے گئے۔ تا کہ ان کو دشمن کے اوپر چھوڑ کر اس کو ہلاک کیا جا سکے۔ مگر اب اس قسم کی زہریلی گیسوں کے ذخیرے تباہ کیے جا رہے ہیں۔ کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ وہ خود قابض **ملک** کے لئے بھی زبردست خطرہ ہیں۔ امریکہ کی ایک خبر (ٹائمس آف انڈیا ۲۴ جنوری ۱۹۸۹، سیکشن ۲) میں بتایا گیا ہے کہ سالوں کے مطالعہ سے امریکی فوج نے طے کیا ہے کہ وہ اپنے ۶۹۴۵۳ زہریلی گیس سے بھرے ہوئے راکٹوں کو تباہ کر دیا جائے۔

اس کے لئے ذخیرہ کے مقام پر مخصوص قسم کی بھٹی تیار کی جائے گی، ایسے راکٹ امریکہ میں آٹھ مقام پر موجود ہیں۔ یہ تمام راکٹ بھٹیوں میں ڈال کر تباہ کیے جائیں گے۔

زہریلی گیس کے ان مہلک ہتھیاروں کے بارہ میں معلوم ہوا ہے کہ وہ خود قابض **ملک** کے لئے بھی اتنا ہی خطرناک ہیں۔ جتنا کسی دشمن کے لئے۔ یہ ہتھیار اگر زیادہ دن تک ذخیرہ رہیں تو وہ اچانک پھٹ سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے اندر سے کہر کی قسم کا ایک مادہ نکل کر پھیل جائے گا۔ جس کے اندر نہ کوئی بو ہو گی۔ اور نہ وہ دکھائی دے گا۔ مگر اس کے راستے میں جو چیز پڑے گی وہ سب ہلاک ہو جائے گی۔

یہ ایک نشانی ہے جو بتا رہی ہے کہ دوسرے کے خلاف تخریب کاری خود اپنے خلاف تخریب کاری ہے۔ کوئی شخص تخریب کاری کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد اس کے برے نتیجہ سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ خواہ اس کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی حیثیت حاصل ہو اور خواہ اس نے اپنا تخریبی منصوبہ اعلیٰ ترین سائنسی سطح پر کیوں نہ بنایا ہو۔

بلند فکری

ٹوکیو کے ایک اشاعتی ادارہ نے ۱۶۰ صفحات کی ایک کتاب چھاپی ہے۔ یہ جاپانی سماج اور جاپانی انسان کے مزاج کا تعارف ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Chie Nakane Japanese Society(۱۹۸۷)

اس کتاب کی مصنف ایک خاتون چی ناکین ہیں جو ٹوکیو یونیورسٹی میں سوشل انتھرا پالوجی کی پروفیسر ہیں۔ انھوں نے تفصیلی معلومات دے کر بتایا ہے کہ جاپانیوں کا ذہن کیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق، جاپانی انسان کی ذہنی ساخت کو مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ۔۔ اس بات کی مسلسل خواہش کہ وہ اوسط سے اوپر اٹھ سکے:

صاحب کتاب کے نزدیک یہ ہی جاپانیوں کا طریق زندگی ہے وہ اس کو مذہبی تعلیم کی طرح مقدس جان کر ہمیشہ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

زندگی میں ٹھہراؤ نہیں آدمی یا تو نیچے گرے گا یا اوپر اٹھے گا۔ یہ اصول اتنا قطعی ہے کہ اگر اپنے آپ کو اوپر نہ اٹھائیں۔ تو آپ خود بخود نیچے جانا شروع کر دیں گے۔ نیچے گرنے کے لئے کسی مزید کوشش کی ضرورت نہیں۔ یہ اصول دین اور دنیا دونوں معاملہ میں یکساں طور پر درست ہے۔ حقیقی مومن وہ ہے جس کا ایمان مسلسل بڑھ رہا ہے۔ جس آدمی کے ایمان میں اضافہ کا عمل رک جائے وہ ایمانی تنزل کی طرف اپنا سفر شروع کر دے گا۔

یہاں کسی ایک حالت میں ٹھہراؤ ممکن نہیں۔

یہ ہی معاملہ دنیا کا ہے۔ دنیا کے معاملات میں بھی آدمی کو ترقی کی طرف اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔ جو شخص ترقی کی طرف اپنا سفر جاری نہ رکھ سکے وہ اوّلاً جمود کا شکار ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ختم ہو جائے گا۔۔ ہمیشہ اپنی ارتقا کے لئے فکر مند

رہیے۔ ارتقا کے لئے فکر مند نہ ہونا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ضروری تیاری

گاندھی جی کی زندگی پر ایک فلم بنائی گئی ہے۔ جو گاندھی کے نام سے کافی مشہور ہو چکی ہے۔ اس فلم میں گاندھی جی کا کردار ایک برٹش ایکٹر کنگسلے (Kingslay) نے ادا کیا تھا۔

کنگسلے نے اپنے آپ کو گاندھی کے روپ میں ڈالنے کے لئے غیر معمولی مشقت برداشت کی۔ کنگسلے کی حقیقی زندگی نہایت شاہانہ ہے۔ اس کے دسترخوان پر اس سے بھی زیادہ کھانے کا سامان ہوتا ہے جتنا پہلے زمانہ میں روایتی قسم کے راجہ یا نواب کے دسترخوان پر ہوتا تھا۔ مگر گاندھی کا کردار ادا کرنے کے لئے اس نے عرصہ تک نیم فاقہ کشی کی زندگی اختیار کی۔

کنگسلے ایک موٹے جسم کا آدمی تھا۔ جب کہ گاندھی جی ایک دبلے پتلے آدمی تھے۔ جو ہاتھ میں لٹھیا لیکر چلا کرتے تھے۔ اداکاری کا تقاضا تھا کہ کنگسلے جب سکرین پر آئے تو لوگوں کو دبلا پتلا گاندھی کی مانند دکھائی دے۔ چنانچہ اس نے مسلسل بھوکا رہ کر اور بہت کم غذا کھا کر اپنے آپ کو دبلا کیا۔ یہاں تک کہ اس کا وزن سات کیلوگرام کم ہو گیا، یہی پر مشقت عمل اس مراٹھی خاتون کو بھی کرنا پڑا۔ جس نے اس فلم میں گاندھی کی بیوی کستوربا کا کردار ادا کیا ہے۔

فلم کی فرضی کہانی میں مصنوعی کردار ادا کرنا جتنا مشکل ہے۔ اس سے بہت زیادہ مشکل یہ ہے کہ کوئی شخص حقیقی زندگی میں کسی قوم کی رہنمائی کے لئے اپنا کردار ادا کرے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ قومی رہنمائی کے میدان میں لوگ اس طرح بلا تیاری کود پڑتے ہیں، جیسے کہ یہاں کسی اہتمام کی ضرورت ہی نہیں۔

قوم کی رہنمائی بلاشبہ تمام کاموں سے زیادہ مشکل کام ہے۔ فلم میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے کنگسلے کو اپنے جسم کو مارنا پڑا تھا قوم کا رہنما بننے کے لئے آدمی کو اپنے نفس کو

www.urdukitabain.blogspot.com

مارنا پڑتا ہے۔ پہلے کام میں اداکار کو اپنا موٹاپا گھٹانا پڑا تھا۔ دوسرے کام کے قابل بننے کے لئے ایک رہنما کو اپنے نفس کا موٹاپا کم کرنا پڑتا ہے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

جو لوگ اس ضروری تیاری کے بغیر قوم کی رہنمائی کے میدان میں داخل ہوں۔ وہ قوم کے مجرم ہیں نہ کہ قوم کے رہنما۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

تجارتی کامیابی

امریکہ کے تاجر اپنی تجارت کو بڑھانے کے لئے ہر قابل قیاس اور نا قابل قیاس تدبیریں کرتے ہیں۔مثلاً امریکہ میں ضرورت کی تمام چیزیں قسطوں پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔وکیوم کلینز ہو یا کئی ایکڑ اراضی پر پھیلی ہوئی عالی شان عمارت ہوٹر کار ہو یا جیٹ طیارہ، ہر چیز آسان قسطوں پر حاصل کی جاسکتی ہے۔حتیٰ کہ امریکہ کے اندر یہ کہاوت عام ہوگئی ہے کہ اگر آپ کے اندر اقساط ادا کرنے کی استطاعت ہو تو آپ امریکہ کو بھی خرید سکتے ہیں۔بشرطیکہ وہ بک رہا ہو۔

امریکہ کے تجارتی ادارہ کی ایک اہم ترین خصوصیت وہ ہے جس کو گاہک نوازی کہا جاتا ہے۔امریکہ کے بڑے بڑے تاجر ہمہ وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ وہ اپنے گاہک کو خوش کریں۔اور انہیں اپنے بارے میں مطمئن کرسکیں۔

اسی گاہک نوازی کے اصول کا ایک مظاہرہ یہ ہے کہ کسی تجارتی ادارے کی ایک شاخ سے خریدا ہوا مال ناقص ہونے یا پسند نہ آنے کی صورت میں ادارے کی کسی بھی شاخ کسی بھی شہر میں یہ کہہ کر لوٹایا جاسکتا ہے۔کہ خریدنے کے بعد پسند نہیں آیا۔نہ جھنجھلاہٹ نہ استفسار۔بس رسید پاس ہونی چاہیے۔قیمت فی الفور لوٹا دی جاتی ہے۔خریدا ہوا مال واپس نہیں ہوگا، کا لفظ امریکی لغت کے لئے اجنبی ہے۔

اگر ہندوستان میں کچھ لوگ ایسا کریں کہ وہ ایک لمٹیڈ کمپنی یا کواپریٹو سوسائٹی قائم کریں۔اور مشترکہ سرمایا سے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ڈیپارٹمنٹل سٹور کھولیں، جہاں ہر طرح کا سامان بکتا ہو۔اور یہ ضمانت بھی دیں کہ کسی بھی سٹور سے خریدا ہوا سامان کسی بھی سٹور پر واپس کیا جاسکتا ہے تو ایسے کاروبار کی سارے ہندوستان میں دھوم مچ جائے گی۔اور وہ یقینی طور پر زبردست کامیابی حاصل کرے گا۔

یہ تجارتی میدان اس ملک میں مکمل طور پر خالی ہے ۔یہاں کسی کے لئے اجارہ داری کی حدتک کامیابی کے مواقع کھلے ہوئے ہیں ۔تاہم اس امکان سے وہ ہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔جن کے اندر یہ ضروری صفات پائی جاتی ہوں ۔۔۔محنت ،دیانت داری ،اوراشتراک عمل ۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سادہ حل

ایک صاحب نے اپنا واقعہ لکھا ہے کسی قدر لفظی تصرف کے ساتھ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک صحرائی علاقہ میں گئے ۔وہ تانگہ میں سفر کر رہے تھے ۔اتنے میں آندھی کے آثار ظاہر ہوئے ۔تانگہ والہ نے اپنا تانگہ روک دیا ۔اس نے بتایا کہ اس علاقہ میں بڑی ہولناک قسم کی آندھی آتی ہے ۔وہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ بڑی ،بڑی چیزوں کو اڑا لے جاتی ہے اور آثار بتا رہے ہیں کہ اس وقت اس قسم کی آندھی آرہی ہے ۔اس لئے آپ لوگ تانگہ سے اتر کر اپنے بچاؤ کی تدبیر کریں ۔

آندھی قریب آگئی تو ہم ایک درخت کی طرف بڑھے کہ اس کی آڑ میں پناہ لے سکیں ۔تانگہ والا نے ہمیں درخت کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو چیخ پڑا ۔اس نے کہا درخت کے نیچے ہرگز نہ جائیے اس آندھی میں بڑے ،بڑے درخت گر جاتے ہیں ۔اس لئے اس موقع پر درخت کی پناہ لینا بہت خطرناک ہے ۔اس نے کہا اس آندھی کے مقابلہ میں بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے ۔وہ یہ کہ آپ لوگ کھلی زمین پر اوندھے ہو کر لیٹ جائیں ۔ہم نے تانگہ والے کے کہنے پر عمل کیا ۔اور زمین پر منہ نیچا کرکے لیٹ گئے ۔آندھی آئی اور بہت زور کے ساتھ آئی ،وہ بہت سے درختوں اور ٹیلوں تک کو اڑا لے گئی ۔لیکن یہ سارا طوفان ہمارے اوپر سے گزرتا رہا ،

زمین کی سطح پر ہم محفوظ پڑے رہے ۔کچھ دیر بعد جب آندھی کا زور ختم ہوا تو ہم اٹھ گئے ۔ہم نے محسوس کیا کہ تانگے والے کی بات بالکل درست تھی ۔(ڈکری کی نومبر ۱۹۸۹)

آندھیاں اٹھتی ہیں تو ان کا زور ہمیشہ اوپر کی طرف رہتا ہے ۔زمین کے نیچے کی سطح اس کی براہ راست زد سے محفوظ رہتی ہے ۔یہ ہی وجہ ہے کہ آندھی میں زمین پر کھڑے ہوئے درخت تو گر جاتے ہیں ۔مگر زمین پر پھیلی ہوئی گھاس بدستور قائم رہتی ہے ۔ایسی حالت میں آندھی سے بچاؤ کا سب سے کامیاب طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو

www.urdukitabain.blogspot.com

وقتی طور پر نیچا کرلیا جائے۔

یہ قدرت کا سبق ہے جو بتاتا ہے کہ زندگی کے طوفانوں سے بچنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کا سادہ سا طریقہ یہ ہے کہ جب آندھی اٹھے تو وقتی طور پر اپنا جھنڈا نیچا کرلو۔ کوئی شخص اشتعال انگیز بات کہے تو تم اس کی طرف سے اپنے کان بند کرلو۔ کوئی تمہاری دیوار پر کیچڑ پھینک دے تو اس کے اوپر پانی بہا کر اسے صاف کردو۔ کوئی تمہارے خلاف نعرہ بازہ کرے تو تم اس کے لئے دعا کرنے میں مصروف ہو جاؤ۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

زمانہ کے خلاف

ٹائمس آف انڈیا (۶ جولائی ۱۹۸۹) میں مسٹر من نندا کے قلم سے ایک رپورٹ شائع ہوئی ۔جو وزیر اعظم راجیو گاندھی کے صاحبزادہ راہل گاندھی کے متعلق ہے ۔

راہل گاندھی نے نئی دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں ہسٹری (آنرز) کورس میں داخلہ لیا ہے ۔وہ اس مضمون کے لئے منتخب کئے جانے والے ۶۷ طلبہ میں سے ایک ہیں ۔راہل کے کالج جانے کے وقت کالج میں زبردست پہرہ رہتا ہے ۔وہ کمانڈوز کے زبردست پہرے کے اندر کالج جاتے اور واپس لوٹتے ہیں ۔

کالج کے ایک استاد ڈاکٹر ایس سی بھارگوا (فزکس لیکچرر) کو ایک طالب علم کا ٹیلی فون ملا ۔کہ وہ ان سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہے ۔انھوں نے اپنے مکان پر ملاقات کے لئے بلایا ۔ڈاکٹر بھارگوا جب وقت پر گھر پہنچے تو وہاں سکیورٹی کے لوگوں نے ان کے مکان کو گھیر رکھا تھا ۔ان کو مکان کے اندر داخل ہونے سے روک دیا گیا ۔انھیں صرف اس وقت داخلہ کی اجزت ملی جب کہ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہی ڈاکٹر بھارگوا ہیں ۔جن سے ملنے کے لئے مذکورہ طالب علم یہاں آیا ہوا ہے ۔

یہ وی،وی آئی پی طالب علم وزیر اعظم راجیو گاندھی کا بیٹا راہل گاندھی تھا ۔رپورٹ میں بتایا ہے کہ راہل نے ڈاکٹر بھارگوا سے یہ مشورہ چاہا تھا کہ وہ اقتصادیات کا مضمون لے یا تاریخ کا مضون ،داکٹر بھارگوا نے اس کو بتایا کہ طالب علم کے نمبر کو دیکھتے ہوئے اس کا اقتصادیات کے کورس میں

داخلہ مشکل ہوگا ۔اس لئے اس کو اقتصادیات کی بجائے تاریخ کا مضمون لینا چاہیے ۔

جہاں تعلیمی مقابلہ کا یہ حال ہو کہ وزیر اعظم کے بیٹے کو بھی میرٹ کی بنیاد پر داخلہ ملے ،وہاں رعایتی داخلہ کا مطالبہ کرنا عجیب بھی ہے اور نا قابل حصول بھی ۔

زندہ یا مردہ

گاڑی کے چلنے کی دو صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ اس کو ڈرائیور چلائے ۔اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے انجن کو چلا کر اس کو سڑک پر چھوڑ دیا جائے ۔بظاہر دونوں گاڑیاں چلتی ہوئی نظر آئیں گی ۔مگر دونوں میں بڑا فرق ہے ڈرائیور والی گاڑی چل کر اپنی منزل تک پہنچتی ہے ۔مگر بے ڈرائیور گاڑی کا انجام صرف یہ ہے کہ وہ کچھ دیر تک دوڑے ،اور اس کے بعد کسی چیز سے ٹکرا کر ختم ہو جائے۔

ایک باہوش ڈرائیور جب گاڑی چلاتا ہے تو وہ راستہ کو دیکھتا ہوا گاڑی چلاتا ہے ۔ضرورت کے مطابق وہ کبھی چلتا ہے اور کبھی رک جاتا ہے ۔کبھی آگے بڑھتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹ جاتا ہے ۔کبھی سیدھے چلتا ہے اور کبھی دائیں یا بائیں کی طرف مڑ جاتا ہے۔یہی وہ گاڑی ہے جو کامیابی کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچتی ہے ۔

اس کے برعکس جو گاڑی ڈرائیور کے بغیر دوڑ رہی ہو،وہ بس یک طرفہ طور پر دوڑتی رہے گی ۔اس گاڑی کے ساتھ عقل وشعور شامل نہیں وہ نہ رکے گی اور نہ پیچھے ہٹے گی ۔وہ نہ کہیں مڑے گی اور نہ کبھی سست ہوگی ۔وہ اندھا دھند بس آگے کی طرف دوڑتی رہے گی ۔ایسی گاڑی کا واحد انجام یہ ہے کہ وہ تھوڑی دیر چلے ،اور اس کے بعد ٹکرا کر خاتمہ کر لے۔

اس مثال سے زندہ انسان اور مردہ انسان کا فرق معلوم ہوتا ہے ۔زندہ انسان باہوش انسان ہے اور مردہ انسان بے ہوش اور بے عقل ،زندہ انسان اگر کسی وقت بولے گا تو حسب موقع چپ بھی ہو جائے گا۔وہ اگر چلے گا تو کبھی رک بھی جائے گا ۔وہ اگر آگے بڑھے گا تو حالات کو دیکھ کر پیچھے بھی ہٹ جائے گا ۔وہ اگر تیز دوڑے گا تو کبھی اپنی رفتار سست بھی کر لے گا۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی کامیابی تک پہنچ جائے گا ۔۔۔اس کے برعکس مردہ انسان وہ ہے جو اس قسم کی سمجھ سے خالی ہو ۔جو بولنے کے بعد چپ نہ

www.urdukitabain.blogspot.com

ہو سکے، جو چلنے کے بعد رکنا نہ جانے ۔ جو صرف اپنی شرطوں کو منوانا جانتا ہو۔ فریق مخالف کی شرطوں پر راضی ہونا اس کے لئے خارج از بحث ہو۔ ایسا انسان مردہ انسان ہے۔ خدا کی دنیا میں اس کے لئے صرف یہ مقدر ہے کہ وہ تباہی اور بربادی کا نشان بن کر رہ جائے۔

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ایک خودکشی

مسز پدما ڈیسائی مشہور صنعت کار راجہ رام کرلو کی صاحبزادی تھیں، ان کی شادی سابق وزیر اعظم ہند مرارجی ڈیسائی کے صاحبزادے مسٹر کانتی لال ڈیسائی سے ہوئی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی معاشی حیثیت کیا تھی۔ مگر ۱۶ نومبر ۱۹۸۴ کو انھوں نے اپنے پانچویں منزل کے فلیٹ سے کود کر خودکشی کر لی۔ اس وقت ان کی عمر ۵۱ سال تھی۔ نیچے گرنے کے فوراً بعد وہ اسپتال لے جائی گئیں۔ لیکن ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ اسپتال پہنچنے سے پہلے مر چکی تھیں۔

انھوں نے خودکشی کیوں کی اس کی وجہ خبر میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے:

پدما نے یہ خبر سننے کے بعد خودکشی کر لی کہ ان کا خاندان اپنے فلیٹ کو قبضہ میں رکھنے کا مقدمہ ہار گیا ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۷ نومبر ۱۹۸۴)

۱۹۷۷ میں جنتا پارٹی کی کامیابی کے بعد مرارجی ڈیسائی وزیر اعظم ہوئے وزارت عظمیٰ کی ڈھائی سالہ مدت میں ان کے صاحبزادے کانتی لال ڈیسائی نے کئی معاملات کئے۔ ان میں سے ایک مذکورہ فلیٹ بھی تھا۔ میرین ڈرائیو (بمبئی) میں ایک بڑی بلڈنگ ہے جس کا نام اوشیانا ہے۔

اس کی پانچویں منزل پر یہ فلیٹ تھا۔ جنتا حکومت کے خاتمہ کے بعد یہ کیس چلا کہ مسٹر کانتی لال ڈیسائی نے غیر قانونی طور پر یہ فلیٹ حاصل کیا تھا۔ عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ دیا۔ مسز پدما ڈیسائی کو اس کی خبر بذریعہ ٹیلی فون ملی، اس کے بعد انھوں نے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ خاتون نے سمجھا کہ وہ خودکشی کر کے ہمیشہ کے لئے عدالت کے فیصلہ سے نجات حاصل کر رہی ہے۔ لیکن اگر انہیں معلوم ہوتا کہ وہ خودکشی کر کے اپنے آپ کو زیادہ بڑی عدالت میں پہنچا رہی ہے۔ جہاں اس قسم کے اقدام کا کوئی موقع ان کے لئے باقی نہیں رہے گا تو ان کا فیصلہ بالکل مختلف ہوتا۔

www.urdukitabain.blogspot.com

آدمی کی سب سے بڑی کمزوری عجلت پسندی ہے۔ وہ فوری طور پر ایک اقدام کر بیٹھتا ہے، حالانکہ اگر وہ سوچے تو کبھی ایسا نہ کرے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

زندگی کا راز

بل کازبی ایک سیاہ فام امریکی ہے۔وہ ۱۹۳۷ میں ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ابتدا میں وہ بمشکل ایک ہزار ڈالر سالانہ کماتا تھا۔آج اس کی سالانہ آمدنی کئی ملین ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔سفید فام امریکہ میں ایک سیاہ فام امریکی کو یہ غیر معمولی کامیابی کیوں کر حاصل ہوئی۔جواب یہ ہے کہ تعلیم اور دانش مندانہ جدوجہد کے ذریعہ۔بل کازبی فلاڈیلفیا کے ایک سکول میں پانچویں گریڈ میں تھا۔وہ سکول میں اکثر تماشے کیا کرتا تھا۔اور پڑھائی پر زیادہ توجہ نہیں دیا کرتا تھا۔اس کی خاتون ٹیچر (Miss Nagle) نے ایک روز اس سے کہا کہ اگر تم جوکر بننا چاہتے ہو تب بھی تمہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔تعلیم کے بغیر تم کسی میدان میں ترقی نہیں کر سکتے۔

بل کازبی نے اس نصیحت کو پکڑ لیا۔اس نے پڑھنے میں محنت شروع کر دی۔یہاں تک کہ اس نے ایجوکیشن میں ڈاکٹریٹ کر لیا۔اس کے بعد اس نے تفریحی پروگراموں میں حصہ لینا شروع کیا۔آخر کار اس کو ٹیلی ویژن پروگرام ملنے لگے۔آج وہ امریکہ کا مشہور ترین کامڈین (Comedian) ہے۔بل کازبی شو امریکہ ٹیلی ویژن کا مہنگا ترین شو ہوتا ہے۔دوسرے بہت سے سیاہ فام امریکیوں کے برعکس، اس نے نسلی امتیاز کی باتیں کرنے سے پرہیز کیا۔اس نے اپنی کہانیاں عالمی واقعات کی بنیاد پر بنائیں۔جو تمام لوگوں کے لئے قابل فہم ہو سکیں۔

امریکی عام طور پر سیاہ فام لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔مگر وہ بل کازبی کے پروگرام کو نہایت شوق سے دیکھتے ہیں۔بل کازبی نے سفید فام لوگوں کی رعایت کی تو سفید فام لوگوں نے بھی بل کازبی کی رعایت کرنا شروع کر دی۔اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے آپ میں دلچسپی لیں تو آپ بھی دوسروں میں دل چسپی لینا شروع کر دیجیے۔اور اس کے بعد آپ کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

انسانی عظمت

اسٹیفن ہاکنگ (Stepjen Hawking) ۱۹۴۲ میں امریکہ میں پیدا ہوا، ایم ایس، سی کرنے کے بعد وہ پی، ایچ، ڈی میں ریسرچ کر رہا تھا کہ اس پر ایک خطرناک بیماری کا حملہ ہوا۔ اپنے حالات کے ذیل میں اس نے لکھا ہے کہ میں ریسرچ کا ایک طالب علم تھا، میں مایوسانہ طور پر ایک ایسے مسئلہ کے حل کا منتظر تھا۔ جس کے ساتھ مجھے پی، ایچ، ڈی کا مقالہ مکمل کرنا تھا۔ دو سال پہلے ڈاکٹروں نے تشخیص کیا تھا کہ مجھے ایک مہلک بیماری ہو چکی ہے۔ مجھے باور کرایا گیا کہ میرے پاس اب زندہ رہنے کے لئے ایک یا دو سال ہیں۔ ان حالات میں بظاہر میرے لئے پی۔ ایچ، ڈی پر کام کرنے کا زیادہ وقت نہیں تھا۔ کیونکہ میں اتنی مدت تک زندہ رہنے کی امید نہیں کر سکتا تھا۔ مگر دو سال گزرنے پر بھی میرا حال زیادہ خراب نہیں ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعات میرے لئے زیادہ بہتر ہوتے جا رہے تھے۔

ڈاکٹروں کے اندازے کے خلاف اسٹیفن ہاکنگ زندہ رہا۔ اس نے اپنی تعلیم مکمل کی اس نے اپنی محنت سے اتنی لیاقت پیدا کی کہ کہا جاتا ہے۔ کہ وہ آئن سٹائن کے بعد سب سے بڑا نظریاتی طبیعیات دان ہے۔ آج وہ کیمرج یونیورسٹی میں میتھمیٹکس کا پروفیسر ہے۔ یہ وہ کسی ہے جواب تک صرف ممتاز سائنس دانوں کو دی جاتی رہی ہے۔ اس کی صرف ایک کتاب (اے، بریف، ہسٹری آف ٹائم) ۱۹۸۸ میں چھپی تو اتنی مقبول ہوئی کہ پہلے ہی سال اس کے چودہ ایڈیشن شائع کئے گئے۔

انسان کی ذہنی صلاحیتیں اس کی ہر کمزوری کی تلافی ہیں۔ اس کا ارادہ ہر قسم کی رکاوٹوں پر غالب آتا ہے۔ وہ ہر ناکامی کے بعد اپنے لئے کامیابی کا نیا راستہ نکال لیتا ہے۔

الّو کا سبق

الّو کو عام طور پر نحوست اور بیوقوفی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کو بیکار سمجھ کر مار ڈالتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا کی دنیا میں کوئی چیز بے فائدہ نہیں۔ الّو ہماری زراعت اور فصلوں کے لئے بےحد مفید ہے۔ کیونکہ وہ فصلوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کا شکار کرکے انہیں کھا جاتا ہے۔

الّو کی غذا نقصان رساں کیڑے اور موذی جانور ہیں۔ اس اعتبار سے الّو ان بہت سے انسانوں سے اچھا ہے۔ جو محض اپنے حرص اور اقتدار کے لئے لوگوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ جو کارآمد چیزوں کو برباد کرکے فتح حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

الّو کی ۱۳۰ قسمیں معلوم کی گئی ہیں۔ وہ چار اونس سے لے کر چھ پونڈ وزن تک کے ہوتے ہیں۔ اسی اعتبار سے ان کی غذا کی مقدار بھی مختلف ہے۔

چھوٹے الّو تقریباً سات اونس خوراک کھاتے ہیں۔ اور بڑے الّو دو پونڈ سے زیادہ تک کھا جاتے ہیں۔ الّو عام طور پر رات کو شکار کرتے ہیں۔ وہ بڑے کیڑے، سانپ چھپکلیاں، چھوٹے خرگوش وغیرہ پکڑتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو زراعت کو یا انسان کو نقصان پہنچانے والی ہیں۔

الّو کے جسم کی بناوٹ شکار کے کام کے لیے نہایت موزوں ہے۔ مثلاً ایک ماہر طیور کے لفظوں میں، وہ رات کے وقت انتہائی پرواز کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ رات کے تاریکی میں کیڑوں یا جانوروں کی صرف آواز سے ان کے مقام کا پتہ لگا لیتا ہے۔ اور تیزی اور خاموشی سے وہاں پہنچ کر اچانک ان کو پکڑ لیتا ہے۔ اور نگل جاتا ہے۔

خدا کی دنیا میں کوئی چیز بے فائدہ نہیں، یہاں کوئی چیز حکمت سے خالی نہیں۔ خدا کی دنیا میں الّو جیسی چیز بھی اس کا ایک مفید جزو ہے۔ ایسی حالت میں جو انسان دنیا میں اس طرح رہیں۔ کہ انہوں نے دوسروں کے لئے اپنی افادیت کھو دی ہو۔ جو دنیا کے

مجموعی نظام میں ایک فائدہ بخش عنصر کی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔ جو انسانی سماج میں مفید حصہ بننے کی بجائے مضر حصہ بن گئے ہوں۔ وہ بلاشبہ اللہ کی نظر میں الو سے بھی بے قیمت ہیں۔ ایسے لوگوں کی ضرورت نہ خدا کو ہے اور نہ عام انسانیت کو۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کھونے کے بعد بھی

اے، پی لندن کی فراہم کردہ ایک خبر حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوئی ہے۔۔۔ مسٹر اسٹینلی جا کی ہنگری میں پیدا ہوئے، وہ ایک سیاہ پوش راہب، عیسائی عالم اور فزکس کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دس سال تک آواز سے محرومی ان کے لئے ان کی سائنس اور مذہب سے متعلق تحریروں پر دو لاکھ دس ہزار ڈالر جیتنے کا ذریعہ بن گئی۔ ۱۹۵۳ میں میرے گلے کی سرجری کے ایک حادثہ نے مجھے وقت دیا کہ میں لکھوں اور سوچوں،

اور ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا، بہت سی انتہائی مقبول کتابوں کے مصنف ایسے ہیں۔ جو بالکل نہیں سوچتے، انہوں نے کہا ہے کہ مسٹر جا کی جنھوں نے مذہب میں ترقی پر ٹمپلٹن انعام حاصل کیا ہے۔ یقین رکھتے ہیں کہ عیسائیت نے وہ ذہنی فضا پیدا کی۔ جس نے سائنس کو ترقی کا موقع دیا۔

وہ اس خیال کے سخت ناقد ہیں کہ سائنس اور خدا ایک دوسرے سے غیر متعلق چیزیں ہیں۔

مسٹر جا کی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا کہ غلط آپریشن کی وجہ سے ان کے بولنے کی صلاحیت ختم ہوگئی۔ مگر ان کے سوچنے اور پڑھنے کی صلاحیت بدستور باقی تھی۔ انھوں نے اس بچی ہوئی صلاحیت کو بھرپور طور پر استعمال کیا۔ دس سال کی خاموش محنت سے انھوں نے ایک ایسی کتاب لکھی جس کا انعام سوا دو لاکھ ڈالر تھا۔ حادثہ کے بعد جو لوگ کھوئی ہوئی چیز کا غم کریں۔ وہ صرف اپنی بربادی میں اضافہ کرتے ہیں۔ جو لوگ حادثہ پیش آنے کے بعد بچی ہوئی چیز پر اپنی ساری توجہ لگا دیں۔ وہ ازسرنو کامیابی کی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔

کم سمجھنا

زندگی نام ہے ناخوشگواریوں کو خوش گواری کے ساتھ قبول کرنے کا۔تھیوڈور روز ویلٹ (Theodore Roosevelt) نے اسی بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ زندگی کا سامنا کرنے کا سب سے ناقص طریقہ یہ ہے کہ حقارت کے ساتھ اس کا سامنا کیا جائے۔

اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص اکیلا نہیں، بلکہ اس کے ساتھ دوسرے بہت سے لوگ بھی یہاں زندگی کا موقع پائے ہوئے ہیں۔اللہ تعالیٰ اپنے منصوبہ کے تحت ہر ایک کو اس کا سامان حیات دے رہا ہے۔کسی کو ایک چیز، کسی کو دوسری چیز اور کسی کو تیسری چیز، ایسی حالت میں آدمی اگر دوسرں کو حقیر یا کم سمجھ لے تو وہ حقیقت پسندانہ نظر سے محروم ہو جائے گا۔وہ نہ اپنے بارہ میں صحیح رائے قائم کر سکے گا، اور نہ دوسروں کے بارے میں۔

تاریخ انسانی میں جو سب سے بڑا جرم کیا گیا ہے وہ عدم اعتراف ہے۔

تاریخ کے ہر دور میں خدا کے نیک بندے حق کا پیغام لے کر اٹھے، انھوں نے لوگوں کو سچائی کی طرف بلایا۔مگر ہمیشہ ایسا ہوا کہ ان کے مخاطبین کی اکثریت نے ان کو نظر انداز کر دیا۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہی تھی کہ انھوں نے ان سچے انسانوں کو حقیر سمجھ لیا۔صرف اس لئے کہ ان کے پاس انھیں دنیا کی رونقیں نظر نہ آئیں۔وہ ان کو تخت عظمت پر بیٹھے ہوئے دکھائی نہ دیئے۔انھوں نے کہ اہم ایک چھوٹے آدمی کے سامنے کیوں اپنے آپ کو جھکائیں۔

یہ ہی معاملہ قومی رویہ کا بھی ہے۔اگر ہم ایک قوم کو حقیر سمجھ لیں تو اس کے بارے میں ہمارا پورا رویہ غلط ہو کر رہ جائے گا۔ہم اس قوم کی اچھائیوں کو بھی برائیوں کے روپ میں دیکھنے لگے گے۔ہم اس قوم کی طاقت کا غلط اندازہ کریں گے۔اور اس سے اس

موقع پر غیر ضروری طور پر لڑ جائیں گے۔ جہاں بہترین عقلمندی یہ تھی کہ اس سے اعراض کیا جائے۔

دوسروں کو کم سمجھنا با عتبار نتیجہ خود اپنے آپ کو کم سمجھنا ہے۔ دوسروں کو حقیر سمجھنے کا آخری انجام صرف یہ ہے کہ آدمی خود دوسروں کی نظر میں حقیر ہو کر رہ جائے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ذہنی ارتکاز

چارلس ڈارون (۱۸۰۹۔۱۸۸۲) موجودہ زمانے کا مشہور ترین مفکر ہے ۔اس کے نظرہ سے اگر چہ راقم الحروف کو اتفاق نہیں ۔تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید انسان کی فکری تشکیل میں جتنا ڈارون کا حصہ ہے اتنا شاید کسی دوسرے مفکر کا نہیں ۔

ڈارون نے موجودہ دنیا میں یہ غیر معمولی مقام اپنی غیر معمولی ذہانت کے ذریعہ حاصل کیا۔انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کے حالات بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

ڈارون کی تمام ذہنی طاقت اس کے موضوع پر وقف ہو گئی تھی ۔اور یہی وجہ ہے کہ شاعری،تصویر،اور موسیقی اس کی بعد کی زندگی میں اس کو وہ خوشی نہ دے سکی ۔جو کہ اس کی ابتدائی زندگی میں انھوں نے اس کو دیا تھا۔

یہ ذہنی ارتکاز کسی کام میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے لئے انتہائی طور پر ضروری ہے ۔خواہ وہ صحیح کام ہو یا غلط،آدمی جب تک اپنے مقصد میں اتنا زیادہ گم نہ ہو جائے کہ بقیہ تمام چیزیں اسے بھول جائیں ۔کسی اور چیز میں اس کے لئے لذت باقی نہ رہے ۔اس وقت تک وہ کوئی بڑی کام یابی حاصل نہیں کر سکتا ۔تمام بڑے لوگوں نے اس طرح کام کیا ہے۔اس کے سوا اور کوئی بڑا کام کرنے کا طریقہ نہیں ۔

جب ایک آدمی کسی کام میں ہمہ تن مشغول ہوتا ہے تو اس وقت اس پر اس کام کے تمام راز کھلتے ہیں ۔اسی وقت وہ اس کام کے تمام ضروری پہلوں پر توجہ دینے کے قابل بنتا ہے ۔اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ اس کی تمام فطری صلاحیتیں اس کے مقصد کے حصول میں لگ جائیں ۔یکسوئی اور لگن کے بغیر کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہوتی ۔اکثر لوگ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا کام نہیں کرتے ۔اسی لیے اکثر لوگ کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر پاتے ۔

قدرت کا فیصلہ

اگر آپ امریکہ جائیں اور وہاں سے کناڈا کی طرف سفر کریں تو آپ دیکھیں گے کہ امریکہ اور کناڈا کی سرحد پر دونوں ملکوں کے جھنڈے ایک ساتھ لہرا رہے ہیں۔پاس ہی ایک بورڈ ہے جس کے اوپر بڑے، بڑے حروف میں لکھا ہوا ہے۔۔۔ایک ہی ماں کی اولادیں:

یہ بات جو امریکہ اور کناڈا کی سرحد پر کھلے بورڈ کے اوپر لکھی گئی ہے۔یہ ہی بات تمام دوسرے ملکوں کی سرحدوں پر چھپے بورڈ میں نہ دکھائی دینے والے حروف میں لکھی ہوئی ہے۔یہ دوسرا بورڈ وہ ہے جو قدرت کی طرف سے لگایا گیا ہے۔پہلا بورڈ انسانی ہاتھوں نے لکھا ہے دوسرا بورڈ خود خدا کے ہاتھوں نے:

جدید تحقیقات جو مالے کیوں حیاتیات (Moleceular biology) میں ہوئی۔ان سے جینی شہادت کے ذریعہ خاص سائنسی سطح پر ثابت یہ ہوا ہے کہ تمام دنیا کے لوگ ایک ہی عظیم خاندان کا حصہ ہیں۔سب ایک ہی مشترک ماں، باپ سے تعلق رکھتے ہیں۔(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تعمیر کی طرف (صفحہ ۲۸۔۳۰)

ایسی حالت میں گویا حقیقت واقعہ وہ ہی ہے جو مذکورہ بورڈ پر امریکہ اور کناڈا کی سرحد پر نصب کی گئی ہے۔وہ ہی معاملہ تمام قوموں کا ہے جس کا اعلان امریکہ اور کناڈا، نے اپنے یہاں لکھ رکھا ہے۔

یہ ہی موجودہ دور میں انسان کا امتحان ہے۔یہاں آدمی کو اپنے آزاد ارادے سے وہ ہی کام کرنا ہے۔جو قدرت نے لازمی قانون کے تحت پیشگی طور پر مقدر کر دیا ہے۔جو چیز قدرت نے اپنے مخفی قلم سے لکھی ہے۔

اسے انسان کو اپنے ہاتھ سے اپنے صفحہ حیات پر لکھنا ہے۔قدرت کے اپنے منصوبے کے تحت چیزوں کی جو سکیم ہے اس کے مطابق اپنے شعور اور عمل کو ڈھالنا ہے۔قدرت

کے نقشہ سے مطابقت کا نام تعمیر ہے۔ اور قدرت کے نقشہ سے عدم مطابقت کا نام تخریب ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بڑی ترقی

علم النفس کے ماہرین نے انسانی سوچ کی دو قسمیں کی ہیں ۔۔۔کنور جنٹ تھنکینگ (Convergent thinking) اور ڈاور جنٹ تھنکینگ (Divergent thinking) کنورجنٹ تھنکنگ یہ ہے کہ آدمی کی سوچ ایک ہی نقطہ کی طرف رہے ۔مگر دوسری چیز اس کی فکر کی گرفت میں نہ آسکے ۔یہ غیر تخلیقی فکر ہے۔

ڈایورجنٹ تھنکینگ کا معاملہ اس سے مختلف ہے ۔ڈایورجنٹ تھنکینگ یہ ہے کہ آدمی کی سوچ ایک رخ سے دوسرے رخ کی طرف مڑ جائے ۔وہ ایک چیز کو دیکھے اور اس کے بعد اس کا ذہن دوسری چیز کی طرف منتقل ہو جائے ۔اسی کا دوسرا نام تخلیقی فکر ہے ۔(۲۴ جنوری ۱۹۸۹)

ایک شخص کسی بستی میں جوتا خریدنے گیا۔وہاں کی آبادی کافی بڑی تھی مگر وہاں جوتے کی دکان موجود نہیں تھی ۔اب ایک شخص وہ ہے جو تجربہ سے صرف یہ جانے کہ مذکورہ بستی میں جوتے کی دکان نہیں ہے ۔یہ وہ شخص ہے جس کے اندر صرف کنورجنٹ تھنکنگ ہے ۔دوسرا شخص وہ ہے کہ جس پر یہ تجربہ گزرا تو اس کا ذہن اس طرف منتقل ہوگیا کہ اس بستی میں جوتے کے گاہک ہیں مگر جوتے کی دکان نہیں ۔اس لیے اگر یہاں جوتے کی دکان کھول لی جائے تو وہ بہت کامیاب ہوگی ۔اس نے فوراً وہاں جوتے کی ایک دکان کھول لی اور پھر زبردست نفع کمایا۔

یہ دوسرا شخص وہ ہے جس کے اندر ڈاورجنٹ تھنکنگ ہے ۔اس نے جوتے کی دکان میں ایک نئے کاروبار کی تصویر دیکھ لی ۔اس نے دکان کے نہ ہونے میں دکان کا ہونا دیکھ لیا۔

ڈایروجنٹ تھنکنگ کی صفت ان لوگوں میں ہوتی ہے جن کے اندر تخلیقیت کی صلاحیت

www.urdukitabain.blogspot.com

ہو۔یہ ہی تخلیقیت تمام بڑی ترقیوں کی سب سے اہم شرط ہے۔انھیں لوگوں نے بڑی بڑی سائنسی دریافتیں کیں۔جن کے اندر تخلیقی ذہن ہو۔انھیں لوگوں نے بڑے بڑے سیاسی کانامے انجام دیئے ہیں۔جو تخلیقی ذہن کے مالک ہوں وہ ہی لوگ تجارتی ترقیاں حاصل کرتے ہیں۔جو تخلیقی فکر کا ثبوت دے سکیں۔

اس دنیا میں پانے والا وہ ہے جس نے کھونے میں پانے کا راز دریافت کرلیا ہو۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کامیابی کا ٹکٹ

موجودہ زمانہ میں کامیابی حاصل کرنے کی سب سے یقینی تدبیر تعلیم ہے۔ جن لوگوں نے اس راز کو جان لیا وہ اس سے زبردست فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

امریکہ میں ہر سال ایک تعلیمی مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں پورے ملک کے طلبہ شریک ہوتے ہیں۔ اس میں امریکہ کے چھ ممتاز سائنسی طلبہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۷ میں جب اس قسم کے چھ ممتاز ترین امریکی طلبہ کا انتخاب کیا گیا تو اس میں ایک ہندوستانی لڑکی کیشانی بھوشن کا نام بھی شامل تھا۔ اس کو بالڈون کالج سے (Mary Baldwin college) سے ایک ہزار ڈالر وظیفہ دیا جائے گا (ہندوستان ٹائمس ۳۰ اگست ۱۹۸۷)

۲۔ دہلی کے اکیس مارچ (۲۱ مارچ ۱۹۸۸) کے اخبارات میں ایک خبر تھی کہ ہندوستانی لڑکا امریکہ کے سائنسی مقابلہ میں ٹاپ کرتا ہے۔

۳۔ امریکہ میں خاص قسم کے سائنسی مقابلے ہوتے ہیں ان میں سے ایک خاص مقابلہ وہ ہے جس کو ویسٹنگ ہاؤس سائنسی صلاحیت جانچ (Westing hose science Talent Search) کہا جاتا ہے۔ ۱۹۸۸ میں اس کا ۴۷واں سالانہ مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں جو طالب علم اول آیا وہ ایک ہندوستانی طالب علم تھا۔ جس کا نام چیتن نائیک ہے اس کو ۲۰ ہزار ڈالر سالانہ تعلیمی وظیفہ دیا جائے گا۔ تاکہ وہ اپنی مزید تعلیم بحسن وخوبی جاری رکھ سکے۔

ماضی میں ویسٹنگ ہاؤس مقابلہ میں کامیاب ہونے والے پانچ طالب علموں نے بعد کو نوبل انعام حاصل کیا۔

تعلیم موجودہ زمانے میں کامیابی کا ٹکٹ ہے۔ تعلیم کی ڈگری والے نظام نے کامیابی کے اس زینہ کو ہر آدمی کے دروازہ تک پہنچا دیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے

صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ محنت ہے۔

آدمی اگر محنت اور دانش مندی کے ساتھ اس امکان کو استعمال کرے تو وہ ہر جگہ اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ خواہ وہ امریکہ ہو یا ہندوستان یا کوئی اور ملک۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

دریافت

دریافت ایک انسانی کمال ہے۔نئی چیز کی دریافت کسی آدمی کا سب سے بڑا کانامہ سمجھا جاتا ہے۔تاریخ کے ہر دور میں ایسے لوگوں کو خصوصی عزت اور احترام حاصل ہوا ہے۔جنھوں نے انسانی علم میں کسی نئی چیز کا اضافہ کیا ہو۔

دریافت کیا ہے اور کوئی شخص کس طرح ایک دریافت تک پہنچتا ہے۔اس کے بارہ میں البرٹ زنٹ گیورگی کا ایک قول نہایت بامعنی ہے۔اس کو طبیعات میں ایک نئی چیز دریافت کرنے پر نوبل انعام ملا تھا۔اس سلسلہ میں اس نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔کہ دریافت یہ ہے کہ آدمی اس چیز کو دیکھے،جس کو ہر ایک نے دیکھا ہے۔مگر اس سے وہ ایک ایسے خیال تک پہنچ جائے۔جس کو کسی نے نہیں سوچا تھا۔

دریافت کی اس تشریح کی ایک مشہور مثال نیوٹن کا واقعہ ہے۔نیوٹن نے سیب کے ایک درخت سے سیب کا ایک پھل نیچے گرتے ہوئے دیکھا۔پھل کا درخت سے نیچے گرنا ایک انتہائی عام واقعہ ہے۔جس کو ہر شخص جانتا ہے اور اس کو ہر شخص نے دیکھا ہے۔مگر نیوٹن نے جب اس واقعہ کو گہری نظر سے دیکھا تو اس کو اسی معمولی واقعہ میں ایک غیر معمولی چیز مل گئی۔یعنی کشش ثقل کے قوانین (Laws of Gravity) وہ چیز جس کو ہر ایک نے دیکھا تھا اس میں اس نے وہ چیز پالی جو کسی نے نہیں پایا تھا۔

یہی دریافت تمام اعلیٰ کامیابیوں کا خزانہ ہے۔وہ ہی شخص بڑی ترقی تک پہنچتا ہے،جو کوئی نئی چیز دریافت کرے،وہ ہی قوم دوسروں کے مقابلہ میں برتر مقام حاصل کرتی ہے۔جو دوسروں کے مقابلہ میں کوئی نئی تدبیر ایجاد کر سکے۔جو لوگ اس تخلیقی صلاحیت کا ثبوت نہ دیں وہ صرف پچھلی صف میں جگہ پاتے ہیں۔وہ کبھی اگلی صف میں جگہ پانے والے نہیں بنتے۔

خدمت کا کرشمہ

نئی دہلی کے پندرہ روزہ انڈیا ٹوڈے (۱۵ اگست ۱۹۹۰) میں صفحہ ۶۸ پر ایک سبق آموز واقعہ شائع ہوا۔ محمد حنیف سلیمان لکھنو کے ایک مسلمان باربر ہیں۔ وہ پچھلے دس سال سے مسٹر ملائم سنگھ یادو کی حجامت بناتے رہے ہیں۔ مسٹر یادو پہلے صرف ایک نیتا تھے اب وہ یوپی کے چیف منسٹر ہیں۔

محمد حنیف سلیمان نے مسٹر یادو سے کہا کہ آپ ایک بڑے عہدے پر پہنچ گئے ہیں۔ مجھے لکھنو کے بازار حضرت گنج میں ایک دکان دلا دیجیے۔

مسٹر یادو اس پر راضی ہو گئے مگر وہ اس کے بعد اپنے وعدے کو بھول گئے۔ محمد حنیف سلیمان چند مہینے تک انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے چیف منسٹر کی رہائش گاہ پر جانا چھوڑ دیا۔ مسٹر یادو کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ سلیمان کے لئے حضرت گنج میں ایک دکان تلاش کرو۔ افسروں نے دوڑ دھوپ کی تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں کوئی بھی دکان خالی نہیں ہے۔

حضرت گنج میں لکھنو ڈولپ منٹ اتھارٹی کا ایک سرکاری دفتر موجود تھا۔ مسٹر یادو کے حکم پر یہ دفتر خالی کر کے سلیمان کو دے دیا گیا۔ تاکہ وہ وہاں اپنی دکان کھول سکیں۔ رپورٹر کے مطابق اس وقت ۱۲۵۰ لوگ حضرت گنج میں دکان حاصل کرنے کے منتظر ہیں۔ سلیمان نے ان سب پر چھلانگ لگا کر ایک دن میں لکھنو کی اہم ترین مارکیٹ میں دکان حاصل کر لی۔ جس کی قیمت اس وقت پانچ لاکھ روپیہ ہے۔ اب محمد حنیف سلیمان نے اس دکان میں اپنا کام شروع کر دیا۔ اس دکان کے اوپر اس نام کا بورڈ لگا ہوا ہے۔

بمبئی ہیر ڈریسرز۔ رپورٹر کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے سلیمان نے جو کچھ کہا اس کو رپورٹر نے اپنی زبان میں اس طرح نقل کیا ہے کہ میں اپنی سیوا کی وجہ سے اس کا حقدار

www.urdukitabain.blogspot.com

(for all my swva)I deserved this Much)تھا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

ذہن کی تعمیر

اقوام متحدہ کے اقتصادی اور ثقافتی ادارہ کے دستور میں جو باتیں درج ہیں۔ان میں سے ایک اہم بات یہ ہے ۔۔۔جنگوں کی ابتدا چونکہ ذہن سے ہوتی ہے اس لئے یہ دراصل لوگوں کے ذہن ہیں ۔جہاں قیام امن کا مورچہ بنایا جائے۔

یہ نہایت صحیح بات ہے حقیقت یہ ہے کہ خواہ سڑک پر دو آدمیوں کا جھگڑا ہو یا میدان جنگ میں دو قوموں کا ٹکراؤ، اس قسم کی تمام چیزیں ہمیشہ ذہن میں شروع ہوتی ہیں۔کچھ آدمیوں کے ذہن میں غصہ اشتعال، انتقام اور نفرت کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔یہی خیالات جب بھڑک کر عملی صورت اختیار کرتے ہیں تو اسی کا نام جھگڑا، یا جنگ ہے۔اس لیے اگر ذہن کی سطح پر امن قائم کیا جائے تو عمل کی سطح پر بھی امن قائم ہو جائے گا۔

آدمی کے ذہن میں منفی خیالات ہمیشہ ردعمل کے طور پر پیدا ہوتے ہیں۔کسی آدمی نے سخت بات کہہ دی تو آپ کو غصہ آ گیا۔کسی سے ناخوشگوار تجربہ ہوا تو آپ مشتعل ہو گئے کسی نے آپ کے وقار کو مجروح کیا تو آپ کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔یہ ہی سب چیزیں جو ابتداً ذہن کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔وہی باہر آ کر جنگ اور فساد برپا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔

ایسی حالت میں انفرادی لڑائی اور قومی جنگ دونوں کو روکنے کا واحد موثر حل یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں کی تربیت کی جائے۔لوگوں کے اندر وہ مزاج بنایا جائے جس کو مذہب میں صبر کہا جاتا ہے۔یہ مقصد اس طرح حاصل ہو گا جب کہ لوگوں کی منفی سوچ کو ختم کیا جائے۔اور ان کے اندر مثبت سوچ پیدا کی جائے۔لوگوں کے اندر یہ مزاج بنایا جائے کہ وہ اشتعال کی باتوں پر مشتعل نہ ہوں۔وہ ناخوشگوار چیزوں میں الجھنے کی بجائے ان سے اعراض کریں۔وہ نفرت کے جواب میں محبت کرنا سیکھیں۔

وہ ٹھنڈی سوچ کے تحت فیصلہ کریں نہ کہ جذباتی ابال کے تحت۔

ذہن کی اصلاح عمل کی اصلاح ہے اور ذہن کی تعمیر زندگی کی تعمیر۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

ناگزیر مسئلہ

اینی برانٹا ایک خاتون ادیب ہیں۔ وہ انگلینڈ میں ۱۸۲۰ میں پیدا ہوئیں۔ اور ۱۸۴۹ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی تحریروں میں حقیقت پسندی کا سبق ملتا ہے۔ ان کا ایک قول یہ ہے کہ اس غیر معیاری دنیا میں ہر چیز کے ساتھ ایک مگر ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔

یہ بلاشبہ ایک حکیمانہ قول ہے۔ موجودہ دنیا امتحان کے لئے بنائی گئی ہے۔

اس لئے یہاں معیار کو پانا ممکن نہیں۔ یہاں مختلف قسم کی محدودیتیں ہیں۔

یہاں ہر انسان کو قول و فعل کی آزادی حاصل ہے یہاں بار بار مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس بنا پر یہاں کسی کے لئے بھی ہموار زندگی کا حصول ممکن نہیں۔ یہاں آدمی کو ہمیشہ ایک مگر سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنی کاروائیوں میں اس حقیقت کو سامنے رکھے۔ ورنہ وہ آخر کار وہ ناکام ہو جائے گا۔

آپ آزاد ہیں کہ سڑک پر اپنی گاڑی پوری تیز رفتاری کے ساتھ دوڑائیں۔ مگر آپ کو اس پر قدرت نہیں کہ دوسری سمت سے آنے والی گاڑیوں کو روک کر سڑک کو صرف اپنے لئے خالی کرلیں۔ آپ ایک ناپسندیدہ جلوس کو روکنے کے لئے اس سے الجھاؤ کر سکتے ہیں۔ مگر آپ کے بس میں یہ نہیں کہ اس کے بعد مسلح پولیس کو مداخلت سے باز رکھیں۔

آپ اپنے ایک قومی ایشو کے لئے جلسہ جلوس کا ہنگامہ کھڑا کر سکتے ہیں۔ مگر آپ کے لئے یہ ناممکن ہے کہ آپ مخالف فریق کے اندر مخالفانہ ردعمل کو روک دیں۔ آپ اپنی حق تلفی کے نام پر احتجاج اور مطالبات کا طوفان برپا کر سکتے ہیں۔ مگر آپ دنیا کے اس قانون کو نہیں بدل سکتے کہ آدمی کو اتنا ہی ملے جتنی استعداد اس نے اپنے اندر پیدا کی ہو۔

اس دنیا میں ہر طرف ایک مگر کی رکاوٹ کھڑی ہوئی ہے۔ اس رکاوٹ کو جاننے ، اور

اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے عمل کا نقشہ بنائیے۔ اگر آپ نے اس کو نظر انداز کر کے اپنا عمل شروع کر دیا تو آخر کار تباہی کے سوا کوئی اور چیز آپ کے حصے میں آنے والی نہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

قدرت کی تعلیم

ٹیک (Teak) ایک عمارتی لکڑی ہے۔ٹیک کا سب سے بڑا پیداواری ملک برما ہے۔اس کے بعد ہندوستان، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور سری لنکا میں ٹیک کی پیداوار ہوتی ہے۔ہندوستان میں تقریباً دو ہزار سال سے اس کا استعمال کیا جا رہا ہے۔

ٹیک کی سب سے بڑی صفت ایک ماہر کے الفاظ میں، اس کی غیر معمولی طویل عمر ہے۔ہزار سال پرانی عمارتوں میں بھی اس کے بیم اچھی حالت میں پائے گئے ہیں۔قدیم زمانہ میں کشتی اور پل وغیرہ اکثر اسی لکڑی کے بنائے جاتے تھے۔

ٹیک کی لکڑی کے دیرپا ہونے کا خاص سبب یہ ہے کہ، عام لکڑیوں کی طرح اس میں دیمک نہیں لگتا۔دیمک لکڑی کا دشمن ہے، دیمک لگنے کے بعد کوئی لکڑی صحیح حالت میں باقی نہیں رہتی۔مگر تیک کے لئے دیمک کا کوئی خطرہ نہیں۔اس لیے اس کی دیرپائی کو کوئی چیلنج کرنے والا بھی نہیں۔

ٹیک کی وہ کون سی صفت ہے جس کی بنا پر وہ دیمک سے محفوظ رہتی ہے۔اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ٹیک کی لکڑی میں ایک خاص قسم کا کڑوا، ذائقہ ہوتا ہے۔یہ ذائقہ دیمک کو پسند نہیں۔لکڑی ہی دیمک کی خوراک ہے۔مگر ٹیک کی لکڑی استثنائی طور پر دیمک کے ذائقہ کے مطابق نہیں۔اس لیے دیمک اس کو اپنی خوراک بھی نہیں بناتا۔

اس مثال سے قدرت کا طریقہ معلوم ہوتا ہے قدرت نے یہ چاہا کہ وہ ٹیک کو دیمک سے بچائے۔اس مقصد کے لیے اس نے ٹیک کو شور وغل اور احتجاج کا طریقہ نہیں سکھایا، قدرت نے سادہ طور پر یہ کیا کہ خود ٹیک کے اندر ایک ایسی صفت پیدا کر دی۔جس کے نتیجہ میں دیمک اپنے آپ اس سے دور ہو جائے۔

اس دنیا میں جس طرح لکڑی کا دشمن دیمک ہے اسی طرح یہاں انسانوں میں بھی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔اب انسان اس سے بچنے کے لیے کیا کرے، اس کو یہ کرنا ہے

www.urdukitabain.blogspot.com

کہ وہ اپنے اندر ایسی صفت پیدا کرے کہ اس کا دشمن اپنے آپ ہی اس سے دور ہو جائے ۔ وہ اس کے خلاف کارروائی کرنے سے اپنے آپ رک جائے ۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سفرِ حیات

جیومیٹری کے اصولوں میں سے ایک مشہور اصول یہ ہے کہ۔۔۔ دو نقطوں کے درمیان قریب ترین فاصلہ سیدھی لکیر کا ہوتا ہے۔

یہ بات روشنی کے سفر کے لیے نہایت درست ہے۔ کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ روشنی ہمیشہ خط مستقیم کے اصول پر سفر کرتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس اصول کو انسانی زندگی کے سفر کے لیے استعمال کرنا شروع کر دے تو اس کا سفر بھٹکاؤ کے ہم معنی بن کر رہ جائے۔

اگر آپ اپنے گھر سے نکلیں اور یہ چاہیں کہ آخری منزل تک بالکل خط مستقیم پر سفر کریں تو ایسا کرنے کی صورت میں کہیں آپ کسی کھڈ میں جاگریں گے یا کہیں کسی پہاڑ سے ٹکرا جائیں گے۔ کہیں دریا کی موجیں آپ کے سفر کو موت کا سفر بنا دیں گی۔ اس لیے کوئی بھی آنکھ والا آدمی ایسا نہیں کرتا۔ کہ وہ خط مستقیم کے سفر پر اپنا سفر جاری کر دے، ہر آنکھ والا آدمی مقامات سفر کی رعایت سے اپنے سفر کا رخ متعین کرتا ہے۔ وہ جیومیٹری کے اصول کے تحت کبھی اپنے سفر کا راستہ نہیں بناتا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان ساری دنیا میں مفروضہ اعداء اسلام کے خلاف جنگ چھیڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے سفر حیات کے لیے اٹھتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے راستے میں دریا اور پہاڑ کی مانند کچھ قوتیں حائل ہیں۔ وہ فوراً ان قوتوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیتے ہیں۔

یہ طریقہ جو موجودہ زمانے کے مسلمان ساری دنیا میں اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ گویا خط مستقیم میں سفر کرنے کی کوشش ہے۔ مگر ایسی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی سرگرمیاں صرف موت کی سرگرمیاں ہیں۔ وہ ہرگز زندگی کی سرگرمیاں نہیں۔

زندگی کا سفر جیومیٹری کے اصول پر طے نہیں ہوتا، وہ حالات کی موافقت اور ناموافقت

کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ سفر حیات کا حقیقت پسندانہ منصوبہ وہ ہی ہے، اور وہ ہی منصوبہ اس دنیا میں کام یاب ہوتا ہے۔ جس میں خارجی حالات کی پوری رعایت شامل ہو۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

فرضی وہم

ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ جس کو ہائپو کونڈریا کہتے ہیں۔(Hypochondriasis) کہا جاتا ہے۔ جو شخص اس بیماری میں مبتلا ہو وہ خیالی طور پر اپنے آپ کو بیمار سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ فی الواقع بیمار نہیں ہوتا۔ اس مرض میں مبتلا ہونے والے لوگ یہ یقین کر سکتے ہیں کہ بیماریاں موجود ہیں۔ اگرچہ فی الواقع ایسا نہ ہو۔

۲۰ جولائی ۱۹۹۲ کی ملاقات میں پونہ کے جناب فرحات ہارون خان صاحب نے بتایا کہ ۱۹۷۱ میں ان کی ملاقات ایک بیس سالہ طالب علم محمد عبدالغفار سے ہوئی۔ وہ بحرین کا رہنے والا تھا اور پونہ میں تعلیم کے لیے آیا تھا۔ اس کو اپنے بارہ میں یہ خیال ہو گیا کہ ہندوستانی غذائیں کھاتے، کھاتے اس کی صحت تباہ ہو گئی ہے۔ وہ کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو گیا ہے۔

اس نے فرحات ہارون صاحب سے کہا، کہ مجھے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے چلیے۔ فرحات صاحب اس کو پونہ کے ڈاکٹر ایس، ایم، ایچ مودی کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر مودی نے نوجوان کا معائنہ کیا۔ مختلف قسم کے ٹیسٹ لیے چند دن بعد اس نے فرحات صاحب سے کہا، کہ ان کو بتا دیجیے کہ ان کو کوئی بیماری نہیں، وہ گھوڑے کی طرح ٹھیک ہیں۔

ڈاکٹر مودی کا فیصلہ معلوم ہونے کے بعد اچانک عرب نوجوان کی ساری پریشانیاں ختم ہو گئیں۔ وہ متعدل آدمی کی طرح رہنے لگا۔ اب وہ ایسا ہو گیا جیسے کہ وہ کبھی بیمار ہی نہ تھا

بیماری کی یہ قسم صرف افراد تک منحصر نہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی قوم کو بھی یہی نفسیاتی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ اس کے رہنماؤں کی غلط رہنمائی اس کو اس بے بنیاد خدشوں

میں مبتلا کر دیتی ہے۔ کہ ہر طرف سے اس کو خطرات نے گھیر رکھا ہے۔ ایسی قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس کو فرضی وہم سے نکال دیا جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے گی۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

ایک مثال

مالیگاؤں کے فساد کے بارے میں دہلی کے ایک اردو ماہنامہ (افکار ملی ستمبر ۱۹۹۲) میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے، اس کا خلاصہ خود اسی کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

مالیگاؤں میں ۱۹ جولائی ۱۹۹۲ کو فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔اس فساد میں تین کروڑ روپے کی مالیت لوٹی گئی۔یا اسے جلا دیا گیا۔تین مسلمان جاں بحق ہو گئے۔۱۲۵ سے زیادہ افراد زخمی ہو گئے۔اور ہسپتالوں میں زیر علاج ہیں۔کاروبار بند ہونے کی وجہ سے یہاں کی آبادیاں، جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے مایوسی اور افسردگی کا شکار نظر آتی ہے۔

مزدور طبقہ بھوک مری کے اندیشہ میں مبتلا ہے۔اور تاجر پیشہ افراد اقتصادی مشکلوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔

۱۹ جولائی کو بابری مسجد کے مسئلہ پر اپنے غم وغصہ کے اظہار کے لیے مسلمانوں نے اپنے کاروبار اور دکانیں بند کرنے کا فیصلہ کیا تھا، بابری مسجد بچاؤ! تحریک کے ضمن میں مقامی جنتا دل کے ایم، ایل، اے، جناب نہال احمد نے مسجد کے تحفظ کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔اور ۱۸ جولائی کی شب میں قدوائی روڈ پر ایک جلسہ عام منعقد کیا۔اور ۱۹ جولائی کو مالیگاؤں بند رکھنے کے اعلان کے ساتھ احتجاجی جلوس کے اہتمام کا اعلان بھی کر دیا۔عام طور پر مسلمانوں میں اس تجویز کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔

شہر میں موجودہ فرقہ وارانہ کشیدگی کا نقطہ آغاز یہی تھا۔

دوسرے دن ۲۵۔۳۰ ہزار افراد پر مشتمل ایک مورچہ (احتجاجی جلوس) جناب نہال احمد کی قیادت میں قلعہ کے پاس سے نکلا۔مگر یہ مورچہ موسم پل تک بھی نہ پہنچا ہوگا، کہ انتشار و اشتعال کا شکار ہو گیا۔بتایا جاتا ہے کہ ایک غیر مسلم فوٹو گرافر نے مورچہ میں

www.urdukitabain.blogspot.com

شامل چند مسلمانوں کے منع کرنے کے باوجود تصویریں کھینچنے کا کام بند نہ کیا تو اس سے کیمرہ چھیننے کی کوشش کی گئی۔ اس چھینا جھپٹی کے دوران پولیس کے آدمی وہاں پہنچ گئے۔ اور معاملہ کو رفع دفع کرنے لگے، کہ جلوس سے کچھ افراد نے سنگ باری شروع کر دی۔ اور پھر وہیں سے عمل اور ردعمل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

برداشت والے لوگ اگر جلوس نکالیں تو اس کا نام مظاہرہ ہے۔ اور بے برداشت لوگ اگر جلوس نکالیں تو اس کا نام فساد ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

غصہ کا انجام

دہلی کے قرول باغ کے علاقہ میں اجمل خاں روڈ ہے۔ یہاں ایک ساتھ جوتے کی دو دکانیں تھیں۔ ایک دکان دار کا نام سریندر کمار (۳۵ سال) ہے اور دوسری دکان کے مالک کا نام بلراج اروڑا (۴۵ سال)۔ ایک ہفتہ پہلے سریندر کمار کی دکان سے ایک شخص نے ایک جوڑا جوتا خریدا۔ دکاندار نے اس کی قیمت ۱۸۰ روپے حاصل کی۔ گاہک باہر نکلا تو دوسرے دکان دار بلراج نے اس کو آواز دے کر بلایا۔ اس کا جوتا دیکھ کر پوچھا کہ اس کو تم نے کتنی قیمت میں خریدا ہے۔ اس نے بتایا کہ ۱۸۰ روپے میں۔ بلراج اروڑا نے اسی قسم کا جوتا اپنی دکان سے نکال کر دکھایا اور کہا دیکھو یہ وہی جوتا ہے اور یہ میں تم کو ۱۲۵ روپے میں دے سکتا ہوں۔ (دی پائنیر ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۲)

گاہک غصہ ہو گیا وہ جوتا لے کر دوبارہ سریندر کمار کے یہاں آیا۔ اور کہا تم نے قیمت زیادہ لی ہے۔ مجھ کو ۴۵ روپے واپس کرو۔ اس پر سریندر کمار بگڑ گیا اور پڑوس کی دکان پر جا کر بلارج اروڑا کو ڈانٹنے لگا۔ کچھ لوگوں نے درمیان میں پڑ کر فوری طور پر دونوں کو اپنی، اپنی دکان میں واپس بھیج دیا۔

مگر غصہ بدستور باقی رہا۔ یہاں تک کہ ایک ہفتہ بعد ۱۳، اکتوبر ۱۹۹۲ کو سریندر کمار نے بلراج اروڑا سے تیز، تیز باتیں کیں۔ اور آخر کار جیب سے ریوالور نکالا اور ایک کے بعد ایک چھ گولیاں اس کے اوپر خالی کر دیں۔ بلراج اروڑا کو فوراً لوہیا اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے اسے مردہ قرار دیا۔

اب قاتل کا معاملہ عدالت میں ہے۔ اب یا تو مقتول کی طرح قاتل کو بھی پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔ یا قاتل لاکھوں روپیہ خرچ کر کے مقدمہ کو اپنے موافق بنائے۔ اور عدالت سے رہائی کا فیصلہ حاصل کر لے۔ ایک صورت اگر قاتل کے لئے جسمانی موت ہے تو دوسری صورت اس کے لیے مالی موت۔

www.urdukitabain.blogspot.com

قاتل اگر غصہ اور انتقام سے مغلوب نہ ہوتا تو بہت آسانی کے ساتھ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کے لیے زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ وہ مذکورہ گاہک کو ۴۵ روپے واپس کر دیتا۔ اور پھر جہاں تک پڑوسی دکاندار کا مسئلہ ہے اس کو تجارتی انداز میں حل کرنے کی کوشش کرے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

سبب کیا ہے

بارسلونا (اسپین) میں جولائی۔اگست ۱۹۹۲ کے درمیان اولمپکس کے مقابلے ہوئے۔اس میں ۱۷۱ ملکوں نے حصہ لیا۔ان میں سے ۶۴ ملکوں نے اعلیٰ کارکردگی دکھا کر تمغے حاصل کیے۔

ہندوستان جو ۸۶ کروڑ افراد کا ملک ہے وہ ایک بھی تمغہ حاصل نہ کرسکا۔

نہ گولڈ میں نہ سلور میں نہ برانز ،میں۔حتیٰ کہ تیر اندازی جو بھارت کی روایات میں شامل ہے اس میں بھی دوسرے ملکوں کے لوگ آگے نکل گئے۔۶۴ جیتنے والے ملکوں کی فہرست میں ابتدائی دس ملکوں کے نام بالترتیبیہ ہیں۔سی ،آئی ایس ،امریکہ ،جرمنی ،چین ،اسپین ہنگری ،ساؤتھ کوریا ،کیوبا فرانس آسٹریلیا۔

یہ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے۔جو لوگ بیرونی دنیا کا سفر کرتے ہیں۔یا جن کی عالمی حالات پر نظر ہے۔وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔کہ بین الاقوامی سطح پر آج ہندوستان کی کوئی اہمیت نہیں۔مثلاً بڑے صنعتی ملکوں میں ہندوستان کا نام آخری سطروں میں بھی نہیں ملتا۔جدید سائنسی ریسرچ میں ہندوستان قابل تذکرہ نہیں سمجھا جاتا۔ہندوستان کے تعلیمی ادارے اپنے معیار کے اعتبار سے سب سے کم تر ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔وغیرہ۔

اس پچھڑے پن کا سبب کیا ہے۔اس کا سبب وہ ہی ہے۔جس کی طرف ایک مبصر نے اشارہ کیا ہے۔۔لوگوں کے دماغ نا قابل لحاظ چیزوں میں کھوئے رہتے ہیں۔وہ وقت کے اصل قابل لحاظ مسائل کی طرف متوجہ نہیں۔

خواہ فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا معاملہ ،اس دنیا میں ترقی کا صرف ایک ہی راز ہے۔اور وہ یہ کہ چھوٹی ،چھوٹی باتوں کو نظر انداز کیا جائے۔اور صرف ان باتوں پر سارا دھیان لگایا جائے۔جو مستقبل کو سنوارنے یا بگاڑنے میں حقیقی طور پر موثر ہوتی ہیں۔ہندوستان

کے لوگ اس فرق کو نہیں جانتے اسی لیے نصف صدی کے ہنگاموں کے باوجود وہ کوئی قابل ذکر ترقی نہیں کر سکے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

ایک میدان

ونگ کمانڈر محمد یوسف خاں (پیدائش ۱۹۴۳) پروفیشن کے اعتبار سے پائلٹ ہیں۔مگر اسی کے ساتھ انھیں صحافت کا ذوق بھی ہے۔اور وہ انگریزی اخبارات میں لکھتے رہتے ہیں۔ان کے انگریزی مضامین یہاں کے قومی روزناموں میں چھپتے رہتے ہیں۔۳ دسمبر ۱۹۹۲ کو ان سے دہلی میں

ملاقات ہوئی۔کئی سبق آموز واقعات ان کی زبانی معلوم ہوئے۔آج کل وہ سینیر پائلٹ ہیں۔اس کمپنی کا ہیڈ آفس بھوبنیشور (اڑیسہ) میں ہے۔حال ہی میں ان کا ایک مضمون ہندوستان ٹائمس (۱۸ اکتوبر ۱۹۹۲) میں چھپا۔یہ مضمون بچوں کی تعلیم کے بارہ میں تھا۔اور اس کا عنوان یہ تھا کہ کیا آپ انھیں ٹیچروں پر چھوڑ دیں گے۔

ایک اور مضمون دہلی کے پانیر (۴ اکتوبر ۱۹۹۲) میں چھپا۔یہ ٹورزم (سیاحت) کے بارہ میں تھا اس کا عنوان یہ تھا۔ایک ہفتہ اڑیسہ میں۔کمپنی والوں کے علم میں یہ مضمون آئے تو وہ بہت خوش ہوئے۔کمپنی کے ذمہ داروں نے ان مضامین کو اپنے دفتر کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کیا۔اور ان کی فوٹو کاپی کرکے انھیں اپنی مختلف شاخوں کے نام روانہ کیا۔ان مضامین کی اشاعت کے بعد کمپنی کے حلقوں میں یوسف خان کی عزت و وقعت بڑھ گئی۔کمپنی میں ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کے جنرل مینجر مسٹر پاشینے نے کہا کہ ہم کو فخر ہے کہ آپ اخبارات میں لکھتے ہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے تمام کارکن یہ جانیں کہ ہمارے یہاں اس صلاحیت کا ایک شخص ہے جو قومی روزناموں میں لکھتا ہے۔

اگر آپ لوگوں کے درمیان عزت چاہتے ہیں تو ان کے کام آیئے حتیٰ کہ ان کے لیے باعث فخر بن جایئے۔

تخریبی منصوبہ

انڈیا کے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کو مدراس میں ۲۱ مئی ۱۹۹۱ کو قتل کر دیا گیا۔قتل کرنے والے لنکا کے تمل ٹائگرس تھے۔انھوں نے اس مقصد کے لیے اتنی کامیاب منصوبہ بندی کی کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کبھی پکڑے نہیں جا سکیں گے۔مگر آخر کار ۲۰ اگست ۱۹۹۱ کو پولیس بنگلور کے ٹھیک اس مکان تک پہنچ گئی۔جہاں اس قتل کا اصل ذمہ دار (ماسٹر مائنڈ) ۲۳ سالہ سیوارسن (Sivarasan) چھپا ہوا تھا۔

پولیس کی بھاری جمعیت دیکھ کر سیوارسن اور اس کے ساتھیوں نے سائنائڈ کھا کر خودکشی کر لی۔

سیوارسن کے اس طرح پکڑے جانے کی وجہ اس کی ایک غلطی تھی۔۲۱ مئی کو جب سیوارسن اپنی ٹیم کے ساتھ اس جلسہ گاہ میں پہنچا جہاں اسے راجیو گاندھی کو قتل کرنا تھا تو اس نے اپنا حلیہ پریس رپورٹر جیسا بنایا تھا۔اپنی اس تصویر کو مزید مکمل کرنے کے لیے اس نے ایک مقامی فوٹو گرافر ہری بابو کو ساتھ لے لیا۔

ہری بابو صرف کرایہ کا آدمی تھا مصلحت کی بنا پر اس کو اصل منصوبہ سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ہری بابو نے حسب معمول مختلف رخ سے راجیو گاندھی کی تصویریں لیں۔انھیں میں ایک تصویر ایسی تھی جس میں سیوارسن کی تصویر بھی آگئی تھی۔جب وہ بم پھٹا جس نے راجیو گاندھی کو ہلاک کیا تھا تو اس کے قریب جو لوگ مرے ان میں سے ایک مذکورہ ہری بابو بھی تھا۔سیوارسن بچ کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔مگر اس کے فوٹو گرافر کا کیمرہ پولیس کے قبضہ میں آگیا۔پولیس نے اس کیمرہ کے اندر سے سیوارسن کا فوٹو حاصل کر کے اسے اخباروں میں چھاپ دیا۔اور اعلان کیا کہ جو شخص اس فوٹو والے کا پتہ دے گا اس کو دس لاکھ روپیہ انعام دیا جائے گا۔بنگلور کی ایک دودھ فروش عورت جو روزانہ سیوارسن کو دودھ پہنچاتی تھی

اس نے سیوارسن کو فوٹو کی مدد سے پہچان لیا۔اس کی سراغ رسانی پر پولیس بنگلور کے مضافات میں مذکورہ مکان تک پہنچ گئی (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ اگست ۱۹۹۱)

ایک تخریبی واقعہ کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے بے شمار عوامل کی مساعدت درکار ہوتی ہے۔انسان اپنی محدودیت کی بنا پر ان کی رعایت نہیں کر پاتا

کوئی نہ کوئی رخنہ ہر تخریبی منصوبہ میں رہ جاتا ہے۔یہی رخنہ تخریب کار کے منصوبے کو ناکام بنا دیتا ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بڑی اسٹوری

ٹائم انٹرنیشنل امریکہ سے نکلنے والا مشہور ہفتہ وار میگزین ہے۔اس کے ہر شمارہ میں ایک خصوصی مضمون ہوتا ہے۔اس مضمون کو صفحہ اول پر نمایاں کیا جاتا ہے۔اس لیے اس کو کور سٹوری کہتے ہیں۔

ٹائم کے شمارہ ۸ جون ۱۹۹۲ کے صفحہ ۲ پر اس کے مستقل عنوان کے تحت آدھے صفحہ کا ایک نوٹ ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ ٹائم میں سٹوری لکھنا گویا بڑی سٹوری لکھنا ہے۔اور بڑی سٹوری لکھنا وہ چیز ہے جس کو لکھنے کا خواب ہر صحافی دیکھتا رہتا ہے۔

اخبار یا میگزین میں بڑی سٹوری لکھنا یا کسی بڑے واقعہ کی رپورٹنگ کرنا صحافی کا خواب ہے تاہم صحافی کا یہ خواب اس کی ذاتی خوشی کے لیے ہوتا ہے۔جس کو ٹائم کے ایک رپورٹر میگنوس نے حقیقی خوشی سے تعبیر کیا ہے۔

مگر ایک اور طبقہ ہے جو بڑی سٹوری ذاتی خوشی کے لیے نہیں بلکہ ذاتی نمائش کے لیے لکھتا ہے۔وہ بڑی سٹوری اس لیے لکھنا چاہتا ہے کہ اس کی ذات بڑائی حاصل ہو۔اس کی شخصیت دوسروں کے سامنے نمایاں ہو جائے۔یہ لیڈروں کا طبقہ ہے۔صحافی کا ذاتی خوشی کے لیے بڑی سٹوری لکھنا کوئی قابل اعراض بات نہیں۔مگر لیڈر کا ذاتی نمائش کے لیے بڑی سٹوری لکھنا بلاشبہ جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

لیڈر قومی تعمیر کی زبان بولتا ہے مگر اس کا اصل مقصد اپنی ذات کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔اس لیے لیڈر ہمیشہ بڑی ،بڑی باتیں کرتا ہے۔تاکہ اس کا نام زیادہ سے زیادہ چھپے،اس کے گرد زیادہ سے زیادہ لوگوں کی بھیڑ جمع ہو۔مگر اس قسم کی لیڈری قومی تعمیر کے لیے زہر ہے۔قومی تعمیر کا کام ہمیشہ چھوٹی سٹوری لکھنے سے ہوتا ہے۔اور لیڈر اپنے مزاج کی بنا پر صرف بڑی سٹوری لکھنے میں دلچسپی لیتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لیڈر کی شخصیت تو چمک اٹھتی ہے،مگر قوم کی تعمیر و ترقی کا کام نہیں ہوتا۔

www.urdukitabain.blogspot.com

احساس اصلاح

ایک مسلم نوجوان سے ملاقات ہوئی۔وہ کتابت کا کام کرتے تھے۔انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔مجھ کو الرسالہ بہت پسند ہے۔مگر آپ کی ایک بات مجھے کھٹکتی ہے۔آپ اکثر مسلمانوں کی کمیوں کا ذکر کرتے ہیں۔اس سے تو مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا ہو جائے گا۔

میں نے کہا آپ ایک کاتب ہیں۔فرض کیجیے کہ آپ حرف ،ج اور ع کا دائرہ صحیح نہ بناتے ہوں۔اب اگر آپ کے استاد آپ کی اس کمی کو بتائیں تو کیا آپ کہیں گے کہ استاد صاحب میرے اندر احساس کمتری پیدا کر رہے ہیں۔انھوں نے کہا نہیں۔میں نے کہا کہ اسی ذاتی مثال سے آپ الرسالہ کے ان مضامین کو سمجھ سکتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین کا مقصد مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کرنا نہیں۔بلکہ احساس اصلاح پیدا کرنا ہے۔اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ اپنی کمیوں کی اصلاح کیے بغیر کوئی شخص یا گروہ اس دنیا میں ترقی نہیں کر سکتا۔

عربی کا ایک مثل ہے کہ جو شخص تم کو نصیحت کرے۔وہ اس سے بہتر ہے جو تمہاری تعریف کرے۔یہ مثل صد فی صد درست ہے۔ہر وہ شخص جو کسی کے ساتھ خیر خواہی رکھتا ہو وہ یہی کرے گا۔کہ وہ اس کی کمیوں کی نشاندہی کرے گا۔اور اس کی کوتاہیوں پر اس کی فہمائش کرے گا۔یہی سچے مصلح کا طریقہ ہے۔

قرآن میں گھاٹے (خسر) سے بچنے کے لیے جو لازمی صفات بتائی گئی ہیں۔ان میں سے ایک ضروری صفت تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ہے۔

یعنی ایک دوسرے کو حق وصبر کی نصیحت کرتے رہنا۔وہی گروہ اس دنیا میں نقصان اور بربادی سے بچ سکتا ہے۔جس کے افراد میں یہ روح زندہ ہو۔کہ جب وہ اپنے بھائی کو حق کے راستہ سے ہٹا ہوا پائے تو فوراً اس کو ٹوکے۔اور جب بھی اس کو بے صبری کی

طرف جاتا ہوا دیکھے۔ تو اس کو صبر کی اہمیت سے آگاہ کرے۔ (سورت العصر)

صحابہ کرام کے اندر نصیحت کرنے کا جذبہ بھی پوری طرح موجود تھا اور نصیحت سننے کا بھی۔ حضرت عمر فاروق نے ایک معاملہ میں ایک بار فیصلہ دیا۔ حضرت علی کو اس فیصلہ میں غلطی نظر آئی۔ انھوں نے اس پر ٹوکا۔ حضرت عمرؓ اگر چہ خلیفہ اور حاکم تھے انھوں نے اس کو فوراً مان لیا۔ اور کہا اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بہتر حکومت

آزادی کے بعد آپ کی سب سے بڑی مشکل کیا رہی ہے، یہ ایک سوال ہے۔ جس کو فرانسیسی مصنف اینڈرے مالراکس نے ایک بار جواہر لال نہرو سے پوچھا تھا۔ نہرو نے جواب دیا۔ کہ ایک درست حکومت کو درست ذرائع سے وجود میں لانا۔

جواہر لال نہرو کو ہندوستان میں کامل اقتدار حاصل تھا۔ اس کے باوجود بہتر نظام حکومت بنانے کے لیے وہ اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہتر نظام حکومت بنانے کا کام حکومت کی طاقت سے نہیں ہوتا۔ یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں۔ جو حکومت سے باہر رہ کر اس مقصد کے لیے جدوجہد کریں۔

اصل یہ ہے کہ بہتر نظام حکومت بنانے کا کام بہتر افراد بنانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ لوگ خالص تعمیری انداز میں ذہن بنانے کے کام میں لگیں۔ وہ تقریر و تحریر اور دوسرے ممکن ذرائع سے ایک ایک شخص کے ذہن میں داخل ہونے کی کوشش کریں۔

یہ کام خاموش اور پر امن انداز میں لمبی مدت تک جاری رہے۔ یہ گویا ایک قسم کا تعمیری لاوا پکانا ہے۔ جب افراد کی قابل لحاظ تعداد میں فکر کا لاوا پکتا ہے۔ اور افراد کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا ہے۔ تو اس کے بعد سماج میں بھی انقلاب آجاتا ہے۔ اور جب سماج کی اصلاح ہو جائے تو اس کے بعد اصلاح یافتہ حکومت بھی لازماً بن کر رہتی ہے۔

افراد میں انقلاب سماج میں انقلاب لانے کا باعث بنتا ہے۔ اور سماج میں انقلاب حکومت میں انقلاب لے آتا ہے۔ کیونکہ حکومت جمہوری نظام میں سماج کے اندر سے نکل کر ہی تشکیل پاتی ہے۔

تعمیری لاوا پکانا ایک انتہائی خاموشی کا کام ہے۔ اس میں آدمی کو زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ مگر

اس کو کم کا کریڈٹ بھی نہیں ملتا۔ یہ قوم کا گنبد کھڑا کرنے کی خاطر اس کی بنیاد میں دفن ہو جانا ہے۔ اس کام کی یہ ہی مشکل نوعیت ہے۔ جس کی بنا پر لوگ اس میدان میں محنت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

درست مشورہ

وزیراعظم نرسیما راؤ نے ۴۶ ویں یوم آزادی کی تقریر میں ایک اہم بات کہی۔ اکثر اخباروں نے اس کو اپنی سرخیوں میں نمایاں کیا، ہندوستان ٹائمس (۱۶ اگست ۱۹۹۲) نے اس تقریر کی جو رپورٹ چھاپی، اس کی سرخی یہ تھی۔۔وزیراعظم کی اپیل کہ نزاعی امور کو تین سال کے لیے التوا میں ڈال دیں۔

وزیراعظم نے کہا کہ ہمارے درمیان بہت سے اختلافات ہیں۔اور یہ ایک فطری بات ہے۔کہ اختلافات ہوں۔مگر زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آزادی کے تقریباً آدھی صدی کے بعد بھی ہم گمبھیر مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یکسوئی کی ضرورت ہے۔ہمیں چاہیے کہ کم از کم اگلے تین سال کے لیے اپنی نزاعی بحثوں کو طاق پر رکھ دیں۔اور اپنی ساری طاقت ملک کو ترقی کے راستے پر اٹھانے میں لگا دیں۔

یہی اصول دنیا میں ترقی اور کامیابی کا واحد اصول ہے۔موجودہ دنیا میں لازماً ایسا ہوتا ہے۔کہ ایک شخص اور دوسرے شخص، اسی طرح ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان اختلاف اور نزاع پیدا ہو۔اس دنیا میں بے اختلاف زندگی ممکن نہیں۔

اب اگر ہر شخص اور ہر گروہ اختلافی باتوں کو لے کر دوسروں سے الجھ جائے تو ترقی کا سفر ناممکن ہو جائے گا۔اس لیے درست طریقہ یہ ہے کہ اختلافی یا نزاعی باتوں کو اعراض کے خانہ میں ڈال دیا جائے۔اور اپنی ساری طاقت عملی تعمیر کے کام میں لگائی جائے۔اگر بالفرض مستقل اعراض ممکن نہ ہو تو کم از کم کچھ مدت کے لیے تو اعراض کے اصول کو اختیار کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔

انسان بیک وقت دو محاذ پر اپنی قوت صرف نہیں کر سکتا۔اگر وہ نزاع میں الجھے گا تو تعمیری کام رک جائیں گے۔اور اگر تعمیری کاموں میں مصروف ہوگا تو نزاع کے

www.urdukitabain.blogspot.com

میدان کو خالی چھوڑنا پڑے گا۔ ایسی حالت میں عقل مندی کیا ہے۔ عقل مندی یہ ہے کہ نزاع کو ترک یا ملتوی کرکے اپنی تمام ممکن قوت کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگا دیا جائے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بڑا ظرف

لنڈن جانسن (Lyndon JohmSon) امریکہ کا ۳۶واں پریسیڈنٹ تھا۔وہ ۱۹۰۸ کو پیدا ہوا۔۱۹۷۳ میں اس کی وفات ہوئی۔وہ چاہتا تھا کہ وہ امریکہ کو عظیم سماج بنائے۔اس کے لیے اس نے مختلف اقدامات کیے۔انھیں میں سے ایک ہجرت کے قانون میں تبدیلی بھی ہے

جانسن نے سب سے زیادہ اہمیت علم اور تعلیم کو دی۔اس کا کہنا تھا کہ امریکہ کے مستقبل کے بارہ میں ہماری جو امیدیں ہیں اس میں سب سے زیادہ اہمیت علم کو ہے۔ امریکہ بیرونی دماغوں کا استقبال کرتا ہے۔تاہم اس سلسلہ میں جانسن سے پہلے ایک رکاوٹ حائل تھی۔امریکہ میں سفید فام ماہرین کے داخلہ کے لیے نرم قوانین تھے۔مگر سیاہ فام ماہرین کے داخلہ کے سلسلہ میں سخت قسم کے قواعد وضوابط تھے۔اس کی وجہ سے امریکہ اپنے ترقیاتی کاموں میں سیاہ فام ماہرین کو زیادہ استعمال نہیں کرپاتا تھا۔ لنڈن جانسن نے اقتدار میں آنے کے بعد ہجرت قوانین میں تبدیلی کردی۔اس نے سیاہ فام کے داخلہ سے تمام قانونی پابندیاں اٹھالیں۔اس نے کہا ہمیں لوگوں کی مہارت کی ضرورت ہے،ہمیں ان کے چمڑے کی ضرورت نہیں۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے۔کہ اس دنیا میں بڑی ترقی حاصل کرنے کے لیے آدمی کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔وہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کی صلاحیت کو دیکھے۔اور بقیہ تمام پہلوں کو نظر انداز کردے۔جن کا ذہن دوسرے پہلوں میں الجھا رہے وہ کبھی لائق افراد کو اپنے گرد جمع نہیں کرسکتے۔

بڑی کامیابی کے لیے بڑا ظرف درکار ہوتا ہے۔اس دنیا میں کامیابی کا اصول صرف ایک لفظ میں یہ ہے کہ۔۔جتنا بڑا ظرف اتنی بڑی کامیابی۔

فرق کیوں

۱۹۷۱ کا واقعہ ہے۔ایک سفر کے دوران میں لاہور (پاکستان) میں ایک صاحب کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔یہ ایک بڑا دو منزلہ مکان تھا۔میرے میزبان ایک روز رات کے وقت مجھے چھت کے اوپر لے گئے۔اس وقت پورا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔اور کھلی فضا میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ہم لوگ قدرت کے حسین منظر میں کھوئے ہوئے تھے۔اچانک میرے میزبان نے کہا یہی چاند تو آپ کے ملک میں بھی چمکتا ہوگا۔

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔میں نے اپنے دل میں سوچا کہ کیسی عجیب بات ہے۔چاند ہر ملک میں چاند ہے۔مگر انسان ہر ملک میں انسان نہیں۔ایک شخص اپنے ملک میں وطنی سمجھا جاتا ہے مگر وہ اپنے ملک میں خارجی بن جاتا ہے۔

چاند کو جس طرح ایک ملک میں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔اسی طرح سورج ایک ملک میں بھی محبوب ہے۔اور دوسرے ملک کے لیے بھی۔مگر انسان کا یہ حال ہے کہ ایک ملک کا مطلوب شخص دوسرے ملک میں پہنچ کر غیر مطلوب بن جاتا ہے۔اس کی وجہ کیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند اور سورج اپنی فطرت پر قائم ہیں مگر انسان اپنی مقرر فطرت پر قائم نہیں۔

سورج چاند ایسا نہیں کرتے کہ ایک ملک میں اجالا پھیلائیں اور دوسرے ملک میں اندھیرا۔مگر انسان ایک قوم کا دشمن اور دوسری قوم کا دوست ہوتا ہے۔پھول کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ایک کو خوشبو دے اور دوسرے کے لیے بدبودار بن جائے۔مگر انسان ایک کے لیے خیر خواہ اور دوسرے کے لیے بدخواہ بن جاتا ہے۔ستارے اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں۔کوئی ستارہ دوسرے کے مدار میں داخل نہیں ہوتا۔مگر انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے دائرے کو چھوڑ کر دوسرے کے دائرے میں داخل ہوتا

www.urdukitabain.blogspot.com

ہے۔درخت ایک ملک میں جس اصول پر اگتا ہے۔دوسرے ملک میں بھی اسی اصول پر اگتا ہے۔مگرانسان ایک کے ساتھ عدل کا معاملہ کرتا ہےاور دوسرے کے لیے ظالم بن جاتا ہے۔

دوسری چیزوں کی محبوبیت کا راز یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت پر قائم ہیں۔مگرانسان اپنی فطرت کھودیتا ہے۔اورنتیجۂ غیرمطلوب بن جاتا ہے۔اگر انسان اپنی فطرت پر قائم رہےتو اس کوبھی ہرجگہ وہ ہی استقبال ملے۔جوسورج اورچاندکوملاہوا ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

اقدام نتیجہ

ٹائم میگزین (۲۳ دسمبر) کی کور سٹوری سویت یونین کے خاتمہ کے بارے میں تھی ۔اور اس میں سابق سویت یونین کے سابق صدر گورباطوف کا ایک انٹرویو شامل تھا ۔جس کا عنوان ایک آدمی بغیر ملک تھا ۔

ٹائم کے شمارہ ۱۳ جنوری ۱۹۹۲ میں اس کے بارہ میں قارین کے جو تاثرات چھپے ہیں ۔ٹائم کے ایک قاری نے لکھا ہے ۔کہ گورباچوف کی قبر پر تاریخ جو کتبہ لگائے گی ۔اس کے الفاظ کچھ اس قسم کے ہوں گے ۔۔۔یہاں ایک عمدہ آدمی اور آئیڈیلسٹ آرام کر رہا ہے ۔جس نے سویت یونین میں تشدد کو ختم کیا ۔اس حقیقت کو نہ جانتے ہوئے کہ جبر اور تشدد ہی وہ سریش تھا جو اس ایمپائر کے مختلف حصوں کو جوڑے ہوئے تھا ۔

ٹائم کے قاری کا یہ تبصرہ بالکل درست ہے ۔اس میں نصیحت کا پہلو یہ ہے کہ کسی اقدام کا نتیجہ آدمی کی خواہش کے مطابق نہیں نکلتا ۔بلکہ خارجی حقائق کی بنیاد پر نکلتا ہے ۔

گورباچوف کا اقدام فی الاصل کیا تھا ،اس سے قطع نظر ،اس کی یہ نصیحت بے حد اہم ہے ۔کوئی فرد ہو یا کوئی قوم اگر وہ کوئی عملی قدم کرے تو اس کو اچھی طرح جان لینا چاہیے ۔کہ جس طرح اقدام کرنا اس کے اپنے بس میں ہے ۔اس طرح نتیجہ اس کے اپنے بس میں نہیں ۔نتیجہ کا معاملہ دوسرے بہت سے خارجی اسباب سے تعلق رکھتا ہے اگر یہ خارجی اسباب موافقت کریں تو نتیجہ موافق نکلے گا ۔اور اگر اسباب موافقت نہ کریں تو اس کے بعد موافق نتیجہ بھی نکلنے والا نہیں ۔

کسی اقدام کا نتیجہ اپنی خواہش کے مطابق نہ نکلنا ۔بلکہ حقائق تاریخی کے مطابق نکلنا ،یہ اتنا اہم قانون ہے ۔کہ کوئی سپر پاور بھی اس کو بدلنے پر قادر نہیں ۔حقائق خارجی ہمیشہ فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں ۔خواہ ہم اس کو پسند کریں یا ناپسند ۔

جنگ یا امن

الرسالہ کا شمارہ مئی ۱۹۹۱ خلیج ڈائری کے طور پر شائع ہوا تھا۔۲ فروری ۱۹۹۱ کو میں نے اپنی ڈائری میں جو صفحہ لکھا تھا۔اس میں یہ الفاظ تحریر کیے تھے اس جنگ میں فتح کا تمغہ خواہ جس فریق کو ملے۔عام آدمی کی مصیبتوں میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔اور یہ مصیبتیں عالمی ہونگی، حتیٰ کہ ان مصیبتوں کا برا اثر اس ملک تک بھی پہنچ جائے گا۔جس نے جنگ کے بعد فتح کا تمغہ حاصل کیا ہے۔

اس تحریر کے ایک ماہ بعد جنگ بندی ہوئی تو واقعتہً ایسا ہی ہوا۔چنانچہ جنگ ختم ہو گئی مگر مسائل ختم نہ ہوئے۔ٹائم میگزین (۱۵ اپریل ۱۹۹۱) نے اس کے بارہ میں جو تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ خلیج میں فتح کے باوجود کس طرح نئے مسائل کا سامنا درپیش ہے۔ٹائم نے لکھا امریکہ اور اس کے اتحادی اب ایک نئی مشکل سے دوچار ہو رہے ہیں۔

ٹائم کے مذکورہ شمارہ کو پڑھنے کے بعد ٹائم کے کچھ قارئین نے اس کو خطوط لکھے۔یہ خطوط میگزین کے شمارہ ۶ مئی ۱۹۹۱ میں چھپے ہیں۔ایک امریکی مکتوب نگار نے لکھا ہے۔کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر بش نے خلیج میں لڑائی جیت لی ہے۔مگر وہ جنگ کو ہار گئے ہیں۔

لڑائی صرف تخریب برپا کرتی ہے۔وہ تعمیر کا واقعہ ظہور میں نہیں لاسکتی۔لڑائی میدان جنگ میں جیتی جاسکتی ہے مگر وہ میدان جنگ کے باہر وہ حقیقی زندگی میں فتح کی خوشی نہیں دیتی۔اس کے باوجود کیوں لوگ لڑائی کی طرف دوڑتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑائی لوگوں کو بڑی چیز معلوم ہوتی ہے۔حالانکہ باعتبار حقیقت امن بڑی چیز ہے۔اور جنگ چھوٹی چیز

www.urdukitabain.blogspot.com

اگر لوگ اس حقیقت کو جان لیں۔ تو ہر آدمی پر امن تعمیر کی طرف دوڑے۔
اور جنگ کا میدان ہمیشہ کے لیے انسانوں سے خالی ہو جائے۔
جنگ ہیروازم ہے۔ مگر جنگ کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں۔ امن بظاہر زیرو ازم ہے۔ مگر تمام بہترین کامیابیاں امن ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہیں۔

ایک واقعہ دو انجام

جمیل اختر صاحب سعودی عرب کے ایک شہر میں رہتے ہیں۔انھوں نے اپنے خط مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۹۲ میں خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہوا ایک واقعہ لکھا۔یہ واقعہ ان کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

جولائی 1991 کی ایک شام ہے مغرب کی اذان ہو چکی ہے۔میں کرمہ سے نکل رہا ہوں۔گیٹ کے باہر چند اوباش قسم کے لڑکے راہ گیروں سے چھیڑ خانی کرتے نظر آرہے ہیں۔مجھے دیکھ کر وہ لڑکے لپکے۔ان کے ہاتھ میں خرگوش کی قسم کا کوئی جنگلی جانور ہے۔مجھے ڈراتے رہے ایک نے چاہا کہ
سر یا کندھے پر پھینک دیں پھر تماشہ دیکھیں۔میں بھانپ گیا کہ ان سے الجھا تو خیر نہیں۔دل ہی دل میں سوچا یہ جو بھی بے ہودہ حرکت کریں۔ردعمل کا اظہار نہیں کروں گا۔میں تیز تیز قدموں سے مسجد کی طرف چلتا رہا۔

میری بے توجہی پر ان لڑکوں نے بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔یہاں تک کہ میں بے ضرر مسجد پہنچ گیا۔نماز سے فراغت کے بعد جب میں کمرہ میں واپس آرہا ہوں تو ایک اور ہی منظر سامنے ہے۔دیکھا وہ ہی لڑکے ایک پاکستانی سے الجھے ہوئے ہیں۔ان لوگوں نے اس جانور کو اس کے بدن پر پھینک دیا۔اس پر وہ غصہ ہو گیا۔ایک لڑکے کو مار بیٹھا۔بس یہیں سے کھیل شروع ہو گیا۔نتیجتہً ایک درجن لڑکے اس پر ٹوٹ پڑے۔کوئی سر کی مالش کر رہا ہے۔کوئی پیٹھ کو تختۂ مشق بنائے ہوئے ہے۔ایک نے پیچھے سے دونوں بانہوں کو پکڑ لیا۔دوسرے نے سینے پر گھما گھ شروع کر دی۔کسی طرح ایک سے جان چھڑاتا تو دوسرا لپٹ جاتا۔مار مار کر اس کا برا حال کر دیا۔کون تھا جو اسے چھڑانے جاتا اور اپنی شامت مول لیتا۔

یہاں تک کہ ایک سعودی جو اس راہ سے گزر رہا تھا۔رحم آیا گاڑی روکی۔دخل اندازی

www.urdukitabain.blogspot.com

کر کے معاملہ رفع دفع کیا۔ان صاحب کو پتا نہیں کتنے دن چوٹ اور غم کے ساتھ بستر پکڑے رہنا پڑا ہوگا۔

ایک ہی معاملہ میں ایک کی نظر اندازی کی پالسی نے بے ضرر چھوڑ دیا۔دوسرے کو بے صبری کا بروقت تحفہ مل گیا۔حالانکہ وہ صاحب اگر صرف اتنا کرتے کہ چند قدم لپک کر چلتے تو کمرہ میں پہنچ جاتے۔بعد میں کمرہ میں پہنچے مگر اس حال میں کہ چوٹ سے نڈھال تھے۔میں نے سوچا کہ انفرادی معاملہ میں بے صبری رنگ لاسکتی ہے تو اجتماعی معاملہ میں وہ کتنی زیادہ سنگین ہوجائے گی۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

قیمت ضروری

ایئر پورٹ پر خودکار ترازو رکھا ہوا تھا۔ اس میں ایک روپیہ ڈالنے سے ایک ٹکٹ نکلتا تھا جس پر آدمی کا وزن چھپا ہوا ہوتا تھا۔ ایک بچہ سکیل کے تختہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک روپیہ کا سکہ تھا۔ اس نے یہ سکہ سکیل کے مخصوص خانہ میں ڈالا۔ اس کے بعد کھٹ، کھٹ کی سی آواز پیدا ہوئی۔

اور پھر ایک چھپا ہوا کارڈ سامنے آ گیا۔ اس پر بچے کا وزن واضح حرفوں میں لکھا ہوا تھا

۔

بچہ کو یہ چیز ایک کھیل سی معلوم ہوئی۔ اس نے اپنے والدین سے مزید سکے مانگے۔ وہ اس فعل کو بار، بار دہراتا رہا۔ ہر بار جب وہ اپنا سکہ مشین میں ڈالتا تو چند سکینڈ کے بعد ایک خوبصورت کارڈ باہر آ جاتا۔ آخر والدین کے سب سکے ختم ہو گئے۔ اب ان کے پاس روپیہ کی بجائے پچاس پیسہ کا سکہ تھا۔ بچے نے پچاس پیسے کا سکہ لے کر مشین میں ڈالا۔ اس کے بعد جھٹ، کھٹ کی آواز تو سنائی دی۔ مگر حسب سابق وزن کا کارڈ باہر نہیں آیا۔ مشین کی طرف سے رسپانس نہ ملنے پر بچہ رونے لگا۔

کم عمر بچہ اس واقعہ کی توجیہہ نہ کر سکا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ رونے کا نہیں۔ بلکہ سبق لینے کا تھا۔ مشین نے اپنی خاموش زبان میں ایک ایسا سبق دیا۔ جو بچہ کے لئے اور اس کے سرپرستوں کے لیے عظیم اہمیت رکھتا تھا۔ یہ سبق کہ یہاں ہر چیز کی ایک قیمت ہے۔ اگر تم نے وہ قیمت ادا نہیں کی تو تم کو مطلوبہ چیز نہیں ملے گی۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ تم نے اصل قیمت سے کم قیمت ادا کی ہو۔

یہی قانون موجودہ دنیا کے لیے بھی ہے اور یہی قانون آخرت کے لیے بھی۔ دونوں دنیاؤں میں آدمی کسی چیز کو اس وقت پا سکتا ہے۔ جب کہ وہ حسب اصول اس کی پوری، پوری قیمت ادا کرے۔ جو شخص قیمت ادا کرنے پر راضی نہ ہو اس کو یہ امید بھی نہیں

کرنی چاہیے کہ اس کی مطلوبہ چیز اس کے حصہ میں آسکے گی۔ قیمت کا قانون ایک اٹل قانون ہے۔ نہ کسی کی خوش گمانیاں اس قانون کو بدل سکتی ہیں۔ اور نہ احتجاج اور شکایت کے ذریعہ اس کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

تعمیر کی طاقت

دوسری عالمی جنگ سے لے کر ۱۹۹۱ تک کا زمانہ امریکہ اور سوویت یونین کی عظمت کا زمانہ ہے۔ان دونوں سلطنتوں کو سپر پاور کہا جانے لگا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ یہی دو ملک تھے۔جن کے پاس سب سے زیادہ ایٹم بم تھے۔ایٹم بموں کی ملکیت نے انھیں سپر پاور بنادیا۔

مگر تحقیقات نے بتایا کہ ایٹم بم اپنی ساری فوجی طاقت کے باوجود قابل استعمال ہی نہیں ہیں۔قدیم زمانہ کے ہتھیار (تلوار وغیرہ) کی تخریب کاری محدود ہوتی تھی۔مگر ایٹم بم کی تخریب کاری لامحدود ہے۔یہ بم اگر استعمال کیے جائیں تو ان سے عالمی تباہی پیدا ہوگی۔نتیجہ یہ ہوگا کہ مفتوح کے ساتھ فاتح بھی تباہ ہو چکا ہوگا۔اس طرح کے مختلف حقائق نے

نے ایٹم بم کے استعمال کو ناممکن بنادیا۔

ایٹم بم اور دوسرے جدید ہتھیاروں کی تیاری میں امریکہ اور سوویت یونین دونوں کی اقتصادیات کو غیر معمولی نقصان پہنچا تھا۔امریکہ کی اقتصادیات کھوکھلی ہوگئی۔مثال کے طور پر امریکہ کے اوپر اس وقت چالیس بلین ڈالر سے زیادہ جاپان کا قرضہ ہے۔سوویت یونین کی اقتصادیات مکمل طور پر تباہ ہوگئی۔حتیٰ کہ اس کا عظیم ایمپائر ٹوٹ کر ختم ہوگیا۔

۱۹۹۲ سے جدید تاریخ کا نیا دور شروع ہوا۔اس نئے دور کا نتیجہ امریکی میگزین ٹائم (۱۰ فروری ۱۹۹۲) کے الفاظ میں یہ ہے کہ امریکہ میں اب یہ عام طور پر کہا جانے لگا ہے۔کہ سرد جنگ ختم ہوگئی۔اور جاپان جیت گیا۔

امریکہ کی عالمی فوجی سیادت کی معقولیت باقی نہ رہی۔امریکہ کو دنیا کی پیچیدہ اقتصادیات میں اب نئی جگہ تلاش کرنا ہوگا۔امریکہ اگرچہ اب بھی بہت طاقتور اقتصادیا

www.urdukitabain.blogspot.com

ت کا مالک ہے۔ مگر اب وہ محسوس کرنے لگا ہے۔ جیسے کہ اب وہ ایک تخفیف شدہ چیز ہے۔

جنگ کے حالات میں وہ قوم دنیا کی قائد نظر آتی ہے۔ جس کے پاس تخریب کی طاقت ہو۔ مگر امن کے حالات میں وہ قوم قیادت کرتی ہے۔ جو دنیا کو امن کا تحفہ دے سکے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

دو قسم کے رہنما

جی کے چسٹرٹن ایک انگریز رائیٹر تھا۔ وہ ۱۸۷۴ میں لندن میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا قول ہے کہ ایک بڑا آدمی وہ ہے جو ہر آدمی کو یہ احساس دلائے کہ تم مجھ سے چھوٹے ہو۔ مگر حقیقی معنوں میں بڑا آدمی وہ ہے جو ہر آدمی کے اندر بڑائی کا احساس پیدا کر دے۔

لیڈر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بڑے، بڑے ایشو لے کر اٹھتے ہیں۔ جن کے پاس بڑے، بڑے نعرے ہوتے ہیں۔ جو ہمیشہ ہائی پروفائل میں بات کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر جگہ چھپتے ہیں۔ ہر جگہ ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ہر مقام پر ان کو استقبال ملتا ہے۔ اس طرح ان کی شخصیت نمایاں ہو جاتی ہے وہ ہر آدمی کو اپنے سے بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وہ لیڈر ہیں جن کی اپنی شخصیتیں تو خوب نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مگر عوام کو ان سے حقیقی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

دوسرا لیڈر وہ ہے جو حقیقی معنوں میں عوام کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ ہر آدمی کا درد اپنے سینے میں لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کا یہ مزاج اس کو ایسے کام کی طرف لے جاتا ہے۔ جو ایک عام انسان کے لیے تو بے حد مفید ہوتا ہے۔ مگر وہ کہنے میں کوئی بڑا کام نظر نہیں آتا۔ وہ اخبار کے صحہ اول کی سرخی نہیں بنتا۔ اس کی بنیاد پر اس کو تعریفی قصیدے نہیں ملتے۔

ایسے لیڈر کا عمل اس کو ذاتی شہرت تو نہیں دیتا۔ البتہ قوم کے ہر فرد کو وہ اونچا کر دیتا ہے۔ وہ ہر آدمی کو اپنے دائرہ میں ہیرو بناتا ہے۔ وہ ہر آدمی کی شخصیت کو بلند کر دیتا ہے۔

عظمت پرست لوگ اگرچہ پہلی قسم کے لیڈروں ہی کی پوجا کرتے ہیں۔

مگر انسانیت کے حقیقی خیر خواہ صرف دوسری قسم کے لیڈر ہیں۔ وہ اپنے کو چھوٹا کر کے دوسرے کو بڑا بنا دیتے ہیں۔ وہ اپنے کو بنیاد میں دفن کر کے دوسروں کو اونچے مینار کی

www.urdukitabain.blogspot.com

مانند کھڑا کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی نفی کرکے دوسروں کے لیے اثبات کے مواقع فراہم کر دیتے ہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

زندگی، موت

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے مجبور ہے کہ وہ کسی کو عظمت کا مقام دے ۔ یہ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے ۔اب جو شخص اللہ کو عظیم سمجھے وہ موحد ہے ۔

اور جو آدمی کسی اور چیز کو عظیم سمجھے وہ مشرک ہے ۔

قرآن میں سابق اہل کتاب کے بارے میں کہا گیا ہے ۔ کہ انھوں نے اپنے بعد کے زمانے میں اپنے احبار اور رہبان کو اپنا رب بنالیا ۔(التوبہ ۳۱) یہ ایک مثال کی صورت میں بتایا گیا ہے ۔ کہ دور زوال میں قوموں اور امتوں کا حال کیا ہوتا تھا ۔ وہ توحید پرستی کے مقام سے گر کر اکابر پرستی کی بیماری میں مبتلا ہو جاتی تھی ۔

قوم جب زندہ ہو تو اقدار کی پرستار ہوتی ہے ۔اور جب وہ مردہ ہو جائے تو اس کے قومی اکابر اس کی پرستاری کا مرکز بن جاتے ہیں ۔ یہی ایک لفظ میں زندہ اور مردہ قوم کا خلاصہ ہے ۔

زندہ قوم مقاصد کو اہمیت دیتی ہے اور مردہ قوم رجال کو ۔زندہ قوم حال میں جیتی ہے اور مردہ قوم گزرے ہوئے ماضی میں ۔ زندہ قوم تنقید کا استقبال کرتی ہے ۔اور مردہ قوم تنقید پر بپھر اٹھتی ہے ۔زندہ قوم حقیقی ایشو پر کھڑی ہوتی ہے ۔اور مردہ قوم فرضی اشو پر ۔زندہ قوم کو ہر ایک اپنا دوست نظر آتا ہے اور مردہ قوم دوسروں کے خلاف شکایت اور احتجاج میں مشغول نظر آتی ہے ۔زندہ قوم کی صفت تحمل اور برداشت ہے ۔اور مردہ قوم کی صفت عدم تحمل ،اور عدم برداشت ۔

جب کسی قوم کے فرد میں وہ علامتیں ظاہر ہو جائیں ۔ جو مردہ قوم کی علامت ہوا کرتی ہیں ۔تو اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ ساری طاقت تربیت اور تیاری کے محاذ پر لگائی جائے ۔افراد میں ازسرنو سپرٹ پیدا کرنا ہی اس وقت کرنے کا اصلی کام بن جاتا ہے ۔

دور عروج کا قومی پروگرام پیش قدمی ہوتا ہے ۔اور دور زوال کا قومی پروگرام تیاری

www.urdukitabain.blogspot.com

دور عروج میں آگے بڑھنے کا نام عمل ہوتا ہے۔ اور دور زوال میں پیچھے ہٹنے کا نام عمل ہے۔ دور عروج میں قوم اپنے اختتام میں ہوتی ہے۔ اور دور زوال میں وہ دوبارہ اپنے آغاز میں پہنچ جاتی ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

فطرت کی طرف

نفسیات کے ایک عالم نے کہا ہے کہ تم ہر جگہ اپنے دوست پا سکتے ہو۔ مگر تم ہر جگہ اپنے دشمن نہیں پا سکتے۔ دشمن تم کو خود بنانا پڑے گا۔

یہ بات نہایت درست ہے حقیقت یہ ہے کہ دوستی معمول کی ایک حالت ہے اور دشمنی ایک خلاف معمول حالت۔ دو آدمی سادہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں تو ان کی فطرت ان کو دوستی ہی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ دشمنی ہمیشہ اس وقت شروع ہوتی ہے جب دونوں میں سے کوئی شخص ناگوار قول یا عمل کے ذریعہ دوسرے کو بھڑکا دے۔

جب بھی آپ کی کسی کے ساتھ دشمنی قائم ہو جائے تو اس کو مستقل نہ سمجھ لیجیے۔ فطرت کے قانون کے مطابق دوستی کی حالت مستقل حالت ہے نہ کہ دشمنی کی حالت۔ آپ وقتی حالت کو دوبارہ مستقل حالت کی طرف لے جانے کی کوشش کریں۔ آپ یقیناً کامیاب ہونگے۔ بشرطیکہ آپ نے اس کے لیے حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہو۔

دوستی کی حالت چونکہ مستقل انسانی حالت ہے۔ اس لیے جب کوئی شخص دشمنی سے دوستی کی طرف جانا چاہے تو فطرت کا پورا نظام اس کے ساتھ رہتا ہے۔ ایسی کوشش میں وہ تنہا نہیں ہوتا بلکہ اپنے باہر کی پوری دنیا کو اپنا ہم نوا بنا لیتا ہے۔ اور جس آدمی کی پوری کائنات ہم نوا ہو اس کے لیے ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

اس دنیا میں سب سے طاقتور چیز فطرت ہے کسی چیز کی فطرت جو اس کے خالق نے لکھ دی ہے اس سے ہٹنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ جمادات، نباتات، حیوانات، سب کے سب اپنی مقرر کی ہوئی فطرت پر چلتے ہیں۔ وہ کبھی اس سے نہیں ہٹتے۔

یہی حال انسان کا ہے۔ انسان کے اندر بھی سب سے طاقتور چیز اس کی فطرت ہے۔ آپ اگر فطرت کا اسلوب اختیار کریں تو آپ سرکش ترین انسان کو بھی مسخر کر سکتے ہیں۔

حکمت کا طریقہ

اس دنیا میں بے نزاع زندگی ممکن نہیں آپ خواہ اپنوں میں رہتے ہوں یا غیروں کے درمیان، بہر حال آپ کے اور دوسروں کے درمیان نزاع کی صورتیں پیدا ہونگی۔ ان نزاعات کو پیدائش کو آپ روک نہیں سکتے۔ البتہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ پہلے ہی مرحلہ میں آپ نزاع کو ختم کر کے اپنے آپ کو اس کے برے انجام سے بچالیں۔

کبھی نظر انداز کرنے کی پالیسی ہی نزاع کو ختم کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ کوئی شخص آپ کے خلاف اشتعال انگیز کلمات کہتا ہے۔ اس کا کامیاب ترین جواب یہ ہے کہ آپ اس کی اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہوں۔ اس طرح آپ پیدا شدہ نزاع کو پہلے ہی مرحلے پر کچل دیں گے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نزاع پیدا کرنے والا آپ کی عزت کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ وہ آپ کے لیے وقار کا مسلہ کھڑا کر دیتا ہے۔ یہاں بھی وقار کے تحفظ کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ اس کی کوئی تدبیر نہ کی جائے۔ آپ یہ سوچ کو خاموش ہو جائیں کہ عزت دینے والا بھی خدا ہے اور عزت کو چھین لینے والا بھی خدا ہے۔ پھر اس کے لیے میں کسی سے کیوں الجھوں۔ آپ کا یہ رویہ نزاع کو ختم کرنے کے لیے کافی ہو جائے گا۔

کبھی نزاع کے ساتھ فائدہ اور نقصان کا پہلو وابستہ ہو جاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اگر صبر و اعراض کی پالیسی اختیار کی گئی تو وہ مادی نقصان کا سبب بن جائے گی۔ مگر ہی سوچ درست نہیں۔ اس طرح کے معاملہ میں اصل انتخاب نقصان اور بے نقصان کے درمیان نہیں ہوتا۔ بلکہ کم نقصان اور زیادہ نقصان کے درمیان ہوتا ہے۔ ایسے معاملات میں نزاع کو پہلے مرحلہ میں ختم کرنا کم نقصان کا راستہ ہے۔ اور نزاع کو بڑھانا زیادہ نقصان کا راستہ ہے۔ پھر کیوں نہ آدمی زیادہ نقصان کو چھوڑ کر کم نقصان والے راستہ کو اختیار کرے۔

ہم نزاع کی پیدائش کو روک نہیں سکتے البتہ یہ یقینی طور پر ہمارے اختیار میں ہے کہ اعراض کا راستہ اختیار کر کے اپنے آپ کو نزاع سے بچالیں۔ ہم زیادہ نقصان کے مقابلہ کم نقصان کو گوارہ کرلیں۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006 www.

اخلاق کا پھل

بدر الدین احمد (پیدائش ۱۹۳۸) مراد آباد کے رہنے والے ہیں۔انھوں نے مراد آباد کے فرقہ وارنہ فساد کے بارہ میں کئی سبق آموز واقعات بتائے۔یہ فساد ۱۳ اگست ۱۹۸۰ کو شروع ہوا تھا اور رک، رک کر اگلے مہینہ تک جاری رہا۔

فساد کے دوران کرفیو لگا ہوا تھا ہر طرف ابتر حالات تھے،لوگوں کے گھروں میں کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو گئی تھیں۔بدر الدین صاحب نے بتایا کہ اس زمانہ میں ہم لوگوں کو دودھ نہیں ملتا تھا۔اس لیے ہم لوگ بغیر دودھ کے چائے گرم پانی کر کے پی لیا کرتے تھے۔

پولیس کے ایک افسر مسٹر شرما نے ایک دکان سے پیتل کے کچھ کھلونے خریدے۔اس کو ان کھلونوں پر پالش کروانا تھا۔وہ پالش کے لیے بدر الدین کے پاس آیا۔انھوں نے پالش کر دی مگر اس کا کوئی پیسہ نہ لیا۔

اس اخلاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس افسر جب راؤنڈ پر نکلتا تو گاڑی روک کر اترتا اور بدر الدین صاحب سے ان کا حال پوچھتا کہ کوئی پریشانی تو نہیں۔ہماری کوئی ضرورت ہو تو بتایئے۔اس طرح وہ کم از کم ایک بار آتا رہا۔

ایک روز مسٹر شرما آئے تو بدر الدین صاحب اپنے چھوٹے بچے کو گود میں لیے ہوئے تھے۔مسٹر شرما نے پوچھا یہ بچہ تو دودھ پیتا ہوگا۔بدر الدین صاحب نے کہا ہاں۔مسٹر شرما نے کہا پھر آپ کو دودھ ملنے میں تو کوئی پریشانی نہیں۔بدر الدین نے کہا کہ پریشانی تو ہے۔اس لیے کہ کرفیو لگا ہوا ہے۔اس کے بعد مسٹر شرما چلے گئے۔اگلے دن آئے تو ان کے ساتھ گلیکسو ملک کے دو ڈبے بھی تھے۔انھوں نے یہ دونوں ڈبے بدر الدین صاحب کو دیتے ہوئے کہا یہ آپ کے بچے کے لیے میری طرف سے تحفہ

ہے۔

اخلاق کے اندر اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑی طاقت رکھی ہے۔ یہ طاقت اتنی زیادہ ہے کہ بدنام پولیس کو بھی مسخر کر لیتی ہے۔ اخلاق ایک ایسا خاموش ہتھیار ہے۔ جو ہر آدمی پر کارگر ثابت ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کٹر دشمن کے اوپر بھی۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

محنت کا کرشمہ

اختر حسین غازی خان ۱۹۲۶ میں غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۷ سے وہ دہلی میں ہیں۔ وہ دہلی آئے تو اپنی معمولی تعلیم کی وجہ سے وہ یہاں کوئی اچھا کام نہ پا سکے۔ سال ہا سال تک ان کا یہ حال تھا کہ معمولی کاموں کے ذریعے وہ کچھ پیسہ حاصل کرتے اور اس سے بالکل سادہ قسم کی زندگی گزارتے۔ اکثر ان کا اور ان کے بیوی بچوں کا کھانا چٹنی اور چاول یا دال اور چٹنی ہوتا تھا۔ مگر آج وہ نئی دہلی کے ایک فلیٹ میں رہتے ہیں ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے۔ 387899

۱۹۷۰ میں وہ ایک مسجد کے حجرہ میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے چھ لڑکے ہو چکے تھے۔ مگر حال یہ تھا کہ ان کے بچوں کے لیے نہ رہنے کا کوئی ٹھکانہ تھا۔ اور نہ کھانے پینے کا۔ ایک بار مہینوں تک چٹنی اور چاول اور وہ بھی آدھا پیٹ کھانا پڑا۔ ان کی بیوی گھبرا اٹھیں۔ انھوں نے کہا کہ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم کہیں سے زہر لے آؤ۔ ہم سب لوگ زہر کھا کر اپنا قصہ ختم کر لیں۔

بیوی کی اس بات نے اختر حسین کو تڑپا دیا۔ انھوں نے سوچا میرا یہ حال اس لیے ہے کہ میں نے علم حاصل نہیں کیا۔ اور اگر میرے بچے بھی علم سے محروم رہے تو ان کا بھی وہی حال ہوگا۔ جو میرا ہے ان کو وہ شعر یاد آ گیا۔

جو انھوں نے اسماعیل میرٹھی کی کتاب میں پڑھا تھا۔

جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرمانروائی ہے۔ جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے۔

انھوں نے طے کیا کہ میں اپنے بچوں کو زہر نہیں دونگا۔ بلکہ انھیں تعلیم دلاؤں گا۔ اب ان کے اندر ایک نیا جذبۂ عمل جاگ اٹھا، حالات کے دباؤ نے انھیں ہیرو بنا دیا۔ وہ روزانہ ۱۶، ۱۶ گھنٹے تک کام کرنے لگے۔ وہ رات دن پیسہ کمانے کے لیے دوڑتے رہتے۔ تاکہ اپنے بچوں کو پڑھا سکیں۔ ۲۶ جون ۱۹۹۱ کی ملاقات میں انھوں نے بتایا

www.urdukitabain.blogspot.com

کہ برسوں تک میرا یہ حال رہا کہ میں دہلی کی سڑکوں پر دیوانوں کی طرح دوڑتا رہتا۔ تا کہ محنت کر کے اتنا پیسہ کما سکوں جو میرے بچوں کی تعلیم کے لیے کافی ہو۔

جن حالات نے اختر حسین کو ہیرو بنا دیا تھا۔ ان حالات نے ان کے بچوں کو بھی سراپا محنت بنا دیا۔ ان کا ہر بچہ انتہائی محنت اور لگن کے ساتھ پڑھنے لگا۔ ہر بچہ اپنی کلاس میں فرسٹ آنے لگا۔ یہ جدوجہد تقریباً بیس سال تک جاری رہی۔ آج ان کا ہر بچہ اعلیٰ ترقی کے منازل طے کر رہا ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

دانش مندی

آج کا سماج کتنا زیادہ بگڑ گیا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ایک واقعہ پڑھیے۔ انڈین ایکسپریس (۲۴ جولائی ۱۹۸۷) صفحہ ۳ پر نئی دہلی کی ایک خبر ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ ۲۱ جولائی ۱۹۸۷ کو دہلی کے ایک ۲۳ سالہ نوجوان اشوک کمار نے اپنی ماں شیلا سے ۵۰۰ روپے مانگے۔ ماں نے انکار کیا جس کے نتیجہ میں اشوک کمار بگڑ گیا گھر میں پتھر کی سل تھی۔ اشوک کمار نے یہ پتھر کی سل اٹھا کر اپنی ماں کے سر پر پٹک دی۔

ماں کا سر پھٹ گیا اور وہ مر گئی۔ اشوک کمار نے اپنی ماں کی لاش کو لوہے کے ایک بکس میں بند کر کے اس میں تالہ ڈال دیا۔ اور خون کے دھبے دھو دیے۔ اس کے بہن اور بھائی شام کو آئے تو اس نے کہہ دیا کہ ماں پنجاب چلی گئی ہے۔ کیونکہ وہاں سے باپ کی بیماری کی خبر آئی تھی۔ مگر اگلے دن جب بکس سے سخت بدبو آنے لگی تو بکس کھولا گیا۔ بکس کے اندر ماں کی سڑی ہوئی لاش موجود تھی۔ اشوک کمار نے قتل کا اقرار کیا۔ اب وہ پولیس کی حراست میں ہے۔

جس ملک میں بے دردی اور بے راہ روی کا یہ عالم ہو وہاں مسلمان اگر ناخوش گوار باتوں سے اعراض نہ کریں اور ہر بات پر دوسروں سے لڑنے جھگڑنے کے لیے تیار رہیں تو اس کا نتیجہ ذلت و بربادی کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ ایسے ماحول میں جو لیڈر انھیں یہ سکھاتے ہیں کہ ظلم کا ڈٹ کر مقابلہ کرو وہ یقیناً بدترین پاگل یا بدترین شاطر ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی سنجیدہ اور ہوش مند آدمی ایسے حالات میں لڑنے بھڑنے کا سبق نہیں دے سکتا۔

نادان آدمی صرف اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ اور دانش مند آدمی اپنے ساتھ دوسروں کو بھی دیکھتا ہے۔ اور انسانوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوگا۔ جو اپنے

www.urdukitabain.blogspot.com

ساتھ دوسروں کو بھی دیکھے۔ اور اپنی سرگرمیوں میں ان کا لحاظ کرے۔ اس کے برعکس جو شخص صرف اپنے آپ کو دیکھے وہ اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندگی کی گاڑی منزل تک نہیں پہنچے گی۔ بلکہ راستہ میں ہی ٹکرا کر تباہ ہو جائے گی۔

یہ زندگی کی حقیقت ہے اور حقیقت کبھی بدلنے والی نہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بے مسئلہ انسان

۵ ستمبر ۱۹۸۶ کو کراچی ایرپورٹ پر ہائی جیکنگ کا واقعہ ہوا۔ یہ پان ایم کا جہاز تھا۔ اس حادثہ میں جو لوگ مارے گیے۔ ان میں سے ایک خاتون نیرجا بھانوت بھی تھی۔ وہ اس امریکی ہوائی کمپنی میں سینئر فلائیٹ پرسر تھی۔ اس حادثہ کے بعد اس کے باپ ہریش بھانوت نے ایک مفصل یاداشت لکھی۔ جو ہندوستان ٹائمس میں (۵ اکتوبر ۱۹۸۶) شائع ہوئی۔ اس یاداشت میں مسٹر ہریش بھانوت نے اپنی لڑکی کے بارے میں جو باتیں لکھی تھیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ نیرجا اول دن سے بے مسلہ لڑکی تھی۔

عام طور پر چھوٹے بچے گھر کے ان مسلہ بنے رہتے ہیں۔ وہ طرح طرح سے اپنے ماں باپ کو پریشان کرتے ہیں۔ اس لیے ایسے بچہ کو بے مسلہ بچہ کہا جاتا ہے جو ہر حال میں مطمئن رہے۔ اور کسی بھی بات پر گھر والوں مسلہ پیدا نہ کرے۔

سب سے بہتر بچہ بے مسئلہ بچہ ہے۔ یہی بات بڑوں کے لیے بھی صحیح ہے۔ وہ آدمی سب سے زیادہ قیمتی ہے جو بے مسئلہ ہو۔ جو دوسروں کے لیے مسائل پیدا کیے بغیر دوسروں کے ساتھ رہ سکے۔ اس دنیا میں ذاتی شکایات کا ہونا لازمی ہے۔ اس لیے قابل عمل صورت صرف یہ ہے کہ آدمی خود اپنے آپ کو بے شکایت بنائے۔

یہ انسانی خصوصی عام زندگی کے لیے بھی نہایت ضروری ہے۔ اور تحریکوں کے لیے تو وہ لازمی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دنیا میں وہی تحریک کامیاب ہوتی ہے جو اپنے گرد ایسے افراد کو جمع کر سکے۔ جو مسائل پیدا کرنے والے نہ ہوں۔ جو مسائل سے بھری ہوئی دنیا میں ایسے بن جائیں۔ گویا دوسروں کی نسبت سے ان کا کوئی مسلہ ہی نہیں۔

جو شخص بے مسئلہ ہو وہی دوسروں کے مسائل حل کر سکتا ہے۔ جو لوگ خود مسائل میں

www.urdukitabain.blogspot.com

مبتلا ہو جائیں۔ وہ صرف دنیا کے مسائل میں اضافہ کریں گے۔ وہ کسی بھی درجہ میں دنیا کے مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

واحد راستہ

سفرنامہ الرسالہ (مارچ ۱۹۸۸) میں ایک جاپانی انجینیر شوگو کٹاکورا کا ذکر آیا ہے۔ جن سے میری ملاقات مالدیپ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا، کہ جاپان کے جغرافیائی حالات نے جاپان کے اندر یہ ذہن پیدا کیا کہ وہ ہمیشہ نئے خیالات کی تلاش میں رہیں۔ وہاں بار، بار موسم بدلتے ہیں۔ زلزلے اور طوفان سے نئے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے جاپانیوں کو بار، بار یہ سوچنا پڑتا ہے کہ بدلے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ کیا کریں۔

اس صورت حال نے نئے خیالات کی تلاش کو جاپانیوں کا مستقل مزاج بنا دیا ہے۔ یہی مزاج ہے جو دوسری جنگ عظیم کی بربادی کے بعد جاپانیوں کے کام آیا۔ انھوں نے جنگ کے بعد بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں اپنے معاملات پر از سر نو غور کیا۔ اور نئے حالات کے مطابق نیا منصوبہ بنا کر دوبارہ زیادہ بڑی کامیابی حاصل کی۔ جاپانیوں کی اسی خصوصیت کو ایک امریکی مصنف نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔ کہ وہ ربدیلی کے آقا بن گیے۔ بجائے اس کے کہ وہ اس کا شکار ہو جائیں۔

زندگی کا سفر کبھی ہموار راستے پر طے نہیں ہوتا، زندگی حادثات اور مشکلات سے بھری ہوئی ہے۔ یہ حادثے اور مشکلیں افراد کو بھی پیش آتے ہیں اور قوموں کو بھی۔ یہ خود خالق کا پیدا کیا ہوا نظام ہے۔ اس سے بچنا کسی بھی طرح ممکن نہیں۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے کامیابی کا صرف ایک راستہ ہے۔ وہ مشکلات کے باوجود جاری رکھے۔ وہ راستہ کے کانٹوں اور پتھروں کے باوجود منزل تک پہنچنے کا حوصلہ کر سکے۔

حالات کی تبدیلی کے بعد حالات کی شکایت نہ کیجیے۔ بلکہ نئے حالات کے مطابق اس کا نیا حل سوچیے۔ اور آپ ہمیشہ کامیاب رہیں گے۔

رکاوٹیں زینہ ہیں

۲۶ مئی ۱۹۸۷ کو دہلی کے اخبارات نے اپنے پہلے صفحہ پر جو خبریں نمایاں طور پر دیں۔ ان میں سے ایک خبر وہ تھی جو دہلی سکینڈری اسکول سرٹیفکیٹ امتحان سے متعلق تھی۔

اس امتحان میں جن طلبہ نے ٹاپ کیا تھا ان میں اکثریت لڑکیوں کی تھی۔ اخبارات کے نمائندوں نے ان ٹاپ کرنے والے طلبہ اور طالبات سے ملاقات کر کے ان کا انٹرویو لیا۔ اور اس کو باتصویر خبر کے طور پر شائع کیا۔

ان ممتاز طالب علموں کے حالات میں ایک نہایت سبق کی بات تھی۔ اکثر ٹاپ کرنے والوں میں مشترک طور پر یہ بات پائی گئی کہ وہ خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے نہ تھے۔ درحقیقت ان میں سے کچھ طالب علموں کو سخت رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ غریب گھرانوں کا فرد ہونے کی وجہ سے ان کے پاس لکھنے پڑھنے کے لیے مناسب جگہ نہ تھیں۔

کتابیں بہت کم تھیں۔ مزید یہ کہ شوروغل ان کے ذہن کو منتشر کرتا رہتا تھا۔ تاہم وہ ان عوامل کو پار کر گیے۔ اور اپنے دل چسپی کے مضمون میں امتیازی نمبر حاصل کیے۔

اسباب کی فراوانی انسان کے اندر بےفکری پیدا کرتی ہے۔ اور اسباب کی کمی سے آدمی کے اندر فکرمندی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اسباب کی فراوانی آدمی کو بےعملی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور اسباب کی کمی عمل کی طرف۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو وہ شخص زیادہ خوش قسمت نظر آئے گا۔ جو اسباب کی کمی کے مسئلہ سے دوچار ہو۔ رکاوٹیں آدمی کے لیے زینہ ہیں۔ بشرطیکہ وہ ان کو زینہ کے طور پر استعمال کر سکے۔

ایک واقعہ

۱۹۴۰ کا واقعہ ہے۔ مشرقی یوپی کا ایک زمیندار گاؤں کے موچی پر غصہ ہو گیا۔ موچی نے اس کے جوتے کی مرمت میں دیر کر دی۔ موچی کو زمیندار کے مکان پر بلایا گیا۔ زمیندار ایک ڈنڈا لے کر کھڑا ہوا، اور حکم دیا کہ وہ اپنا کرتا اتار دے۔ موچی نے فوراً حکم کی تعمیل کی، اس نے نہ صرف کرتا اتارا۔ بلکہ اپنی پیٹھ زمیندار کی طرف کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ تا کہ زمیندار بہ آسانی اس کے اوپر اپنا ڈنڈا برسا سکے۔

اولاً جب موچی زمیندار کے پاس آیا تو وہ اس کو دیکھتے ہی بے حد خفا ہو گیا۔ مگر جب موچی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور خاموشی سے ننگی پیٹھ کر کے بیٹھ گیا تو زمیندار کو اس پر رحم آ گیا۔ اس نے اپنا ڈنڈا الگ رکھ دیا اور موچی کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ جاؤ، اب ایسی غلطی مت کرنا۔

۱۹۴۰ کے زمانہ کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو موچی اس وقت بالکل بے بس تھا اور زمیندار اس کے اوپر ہر قسم کا اختیار رکھتا تھا۔ پھر کیا چیز تھی جس نے ایک با اختیار کے ظلم سے ایک بے اختیار کو بچا لیا۔ یہ وہ ضمیر تھا جس کو قدرت نے ہر انسان کے اندر رکھ دیا ہے۔ خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ موچی نے جب زمیندار کے سامنے اپنے کو جھکا دیا تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اب اس کا ضمیر زندہ ہو کر کام کرنے لگا۔ جس کے اوپر غصہ نے وقتی طور پر پردہ ڈال دیا تھا۔

اس کے برعکس اگر موچی زمین دار سے تیز زبانی کرتا یا اس سے مزاحمت کرتا تو وہ زمیندار کے غصہ کو بڑھا کر اس کے ضمیر کو بالکل دبا دیتا۔ اور اس طرح اپنے کو اس قیمتی مدد گار سے محروم کر لیتا۔ جو ہر ظالم کے دل میں آخری طور پر مظلوم کے لیے رکھ دیا گیا ہے۔

اس دنیا کے بنانے والے نے اس دنیا کا نظام بڑی ہی عجیب حکمتوں کے ساتھ بنایا ہے

۔یہاں ایک شخص کے لیے اس وقت بھی کوئی نہ کوئی محفوظ سہارا موجود ہوتا ہے۔جب کہ وہ بظاہر بالکل بے سہارا ہو چکا ہوتا ہے۔

بشرطیکہ وہ کوئی نادانی کر کے اپنے آپ کو اس آخری سہارے سے محروم نہ کر لے۔

زمیندار کے پاس اگر اپنی طاقت تھی تو موچی کے پاس خدا کی طاقت تھی۔اور کون ہے جو خدا کی طاقت کے آگے ٹھہر سکے۔ہر انسان کے اندر ضمیر ہے۔یہ ضمیر خدا کی عدالت ہے۔آپ اپنا مقدمہ اس خدائی عدالت میں لے جایئے اور پھر کبھی آپ کو کسی سے ظلم شکایت نہ ہو گی۔

آسان طریقہ

پروفیسر رشید احمد صدیقی (۱۹۷۷-۱۸۹۲) جون پور میں پیدا ہوئے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر تھے۔ ان کی شہرت زیادہ تر مزاح نگار کی حیثیت سے ہوئی۔ مزاحیہ نگاری میں وہ اردو کے ممتاز لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

موصوف کے ایک رفیق آل احمد سرور نے ایک مضمون میں لکھا۔ کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک دفعہ اپنا ایک مضون مجھ سے لے کر کہیں اور شائع کر دیا۔ میں اسے ماہنامہ اردو ادب میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس پر احتجاج کیا تو انھوں نے نوٹس نہیں لیا پھر میں نے فریادکی تو محرم کا مہینہ اسی زمانے میں گزر چکا تھا۔ رشید صاحب نے لکھا محرم ختم ہو گیا ہے ماتم موقوف کیجیے۔ (قومی آواز ۲۲، اپریل ۱۹۹۰)

جواب کا یہ طریقہ بعض اوقات نہایت مفید ہوتا ہے۔ علمی تبادلہ خیال میں منطقی طریقہ ہی مناسب ہے۔ علمی گفتگو میں طنز و مزاح کے کے الفاظ بولنا ایک معیوب فعل سمجھا جاتا ہے۔ مگر دوسرے بہت سے مواقع ایسے ہیں۔ جہاں مذکورہ قسم کا انداز زیادہ کار آمد ہے۔

خاص طور پر جب دو شخص یا دو گروہ میں تلخی کی صورت پیدا ہو جائے تو ایسے موقع پر سنجیدہ مزاح کا طریقہ ہیز یادہ مناسب ہے۔ تلخی اور کشیدگی کے وقت آدمی اس حالت میں نہیں ہوتا کہ وہ دلائل کی زبان سمجھے۔ ایسے وقت میں بہترین صورت یہ ہی ہے کہ کوئی پر لطف جملہ بول کر ذہن کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دیا جائے۔

یہ اصول گھریلو سطح پر بھی کار آمد ہے اور جماعتی سطح پر بھی۔ اور دو گرہوں کے باہمی نزاعات کے موقع پر بھی۔ آدمی اگر اپنے ہوش و حواس نہ کھوئے، اور جھنجھلاہٹ سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے تو وہ ہر ایسے موقع پر کوئی دلچسپ بات پا لے گا۔ جس سے وہ لوگوں کی برہمی کو ٹھنڈا کر سکے۔

مزاح کو اگر عادت کے طور پر اختیار کیا جائے تو وہ ایک معیوب بات ہے۔

لیکن مزاح کو اگر تدبیر کے طور پر اختیار کیا جائے تو وہ ایک پسندیدہ چیز بن جائے گی

۔کیونکہ بعض اوقات مزاحیہ کلام وہ کر دیتا ہے جو سنجیدہ کلام نہیں کر سکتا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

زندگی کا راز

۱۹۴۷ میں جب برصغیر ہند کو آزادی ملی تو ایک طرف اہل پاکستان تھے۔ جن کی نمائندگی کرتے ہوئے مسٹر محمد علی جناح نے کہا تھا۔ کہ ہم کو کٹا پٹا اور کرم خوردہ پاکستان ملا ہے۔ ان کے خوابوں کے پاکستان میں پنجاب اور بنگال کا پورا صوبہ شامل تھا۔ وہ پورے کشمیر کو اپنے ملک کا حصہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے موجودہ پاکستان انھیں اپنی امیدوں سے کم نظر آیا۔

دوسری طرف اہل ہند کا حال بھی یہی ہوا۔ یہاں کے لوگوں کے ذہن میں آزاد ہندوستان یا سوتنتر بھارت کا جو تصور تھا۔ موجودہ ملک اس سے کم تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد بھی کروڑوں لوگ اسی احساس کا شکار رہے کہ ان کا محبوب بھارت انھیں ٹکڑے ہو کر ملا ہے۔ انھوں نے جو کچھ چاہا تھا۔ اس سے بہت کم ہے۔ وہ جو عملاً انہیں حاصل ہوا تھا۔

آزادی بظاہر پانے کے انجام پر ختم ہوئی تھی۔ مگر مذکورہ اسباب کی بنا پر اس نے نہ پانے کے احساس کی صورت اختیار کر لی۔ سرحد کے دونوں طرف سیاسی محرومی کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھ کر ایک دوسرے کی کاٹ میں لگ گئے۔ دونوں اس کوشش میں مصروف ہو گیے کہ یا تو ماضی کی سیاسی امنگوں کو دوبارہ واقعہ بنائیں یا کم از کم ایک دوسرے کے خلاف کاروائیاں کر کے اپنے سینہ میں جلتی ہوئی احساس محرومی کی آگ کو ٹھنڈا کریں۔

اس سے مختلف مثال جاپان کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے اس کا جغرافیائی رقبہ بھی گھٹا دیا تھا۔ اور اسکی سیاسی اور فوجی آزادی بھی اس سے چھین لی تھی۔ مگر اہل جاپان نے کھوئی ہوئی چیز کو بھلا دیا۔ اور جو چیز اب بھی انہیں حاصل تھی۔ اس پر قناعت کرتے ہوئے عملی جدوجہد شروع کر دی۔ چالیس سال بعد آج جاپان ترقی کی چوٹی پر پہنچ چکا

www.urdukitabain.blogspot.com

ہے۔اور ہندوستان اور پاکستان کے حصے میں صرف یہ آیا کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرانے کے لیے الفاظ کا جھوٹا طوفان برپا کرتے رہیں۔

زندگی کم تر پر راضی ہونے کا نام ہے۔اس دنیا میں جو کم پر راضی ہو جائے وہ زیادہ پاتا ہے۔اور جو کم پر راضی نہ ہو۔وہ کم سے بھی محروم رہتا ہے اور زیادہ سے بھی۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

حکمت کی بات

کانگریس کے صدر نرسیما راؤ (P.vnarasimha rao) کا ایک انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (یکم جون 1991) میں چھپا ہے۔انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ہندوستانی سماج مختلف قومیتوں کا مشترک سماج ہے۔اور اس سماج کے ہر جزو کو آزادی اور برابری کے ساتھ رہنا چاہیے۔ہندوستان میں رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ مل جل کر رہا جائے۔

یہ نہایت صحیح اور درست بات ہے۔مگر اس کا تعلق صرف ہندوستانی سماج سے نہیں بلکہ دنیا کے ہر سماج سے ہے۔یہی طریقہ پاکستان اور افغانستان کے لیے بھی صحیح ہے۔اور یہی طریقہ یورپ اور امریکہ کے لیے بھی۔چاہے ایک خاندان کا معاملہ ہو یا پوری زمین کا معاملہ، اس دنیا میں زندہ رہنے کی یہی واحد صورت ہے کہ ایک دوسرے کو برداشت کیا جائے۔اور زندگی گزاری جائے۔اگر رواداری اور (ٹالرنس) برداشت کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے تو اس زمین پر نہ ایک خاندان بن سکتا ہے اور نہ ایک ملک۔

اس دنیا میں اختلاف کا ہونا اتنا ہی فطری ہے جتنا خود انسان کا موجود ہونا۔جہاں انسان ہونگے وہاں اختلاف ہوگا۔خواہ یہ انسان ایک مذہب اور کلچر کے ہوں۔یا کئی مذہب اور کلچر کے۔ایسی حالت میں انسان کو دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔یا تو وہ اختلاف کو برداشت کرے یا اختلاف کو برداشت نہ کر کے دوسروں سے ہمیشہ لڑتا جھگڑتا رہے۔

ہمارے لیے انتخاب کا موقع اختلاف اور بے اختلاف میں نہیں ہے۔بلکہ اختلاف کو برداشت کرنے یا اختلاف کو برداشت نہ کر کے مر جانے میں ہے۔اگر ہم زندگی چاہتے ہیں تو وہ صرف اختلاف کو برداشت کرنے ہی میں مل سکتی ہے۔اس کے بعد دوسرا جو امکان ہے وہ لڑ کر اپنے کو برباد کر لینے کا ہے۔اس کے سوا کسی تیسرے انتخاب

کا ہمارے لیے موقع نہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

مقصد کا تقاضا

ٹائمس آف انڈیا (۲۶ مارچ ۱۹۸۷) کے ساتھ ایک ضمیمہ شائع ہوا ہے۔ اس ضمیمہ میں مشہور انگیزی صحافی مسٹر خشونت سنگ کا ایک انٹرویو درج ہے۔ اس انٹرویو کا ایک سوال وجواب یہ ہے

سوال: آپ میڈیا کے ایک آدمی ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ آپ ٹیلی ویژن کے اس قدر مخالف ہیں۔ کہ آپ نے ایک بار اپنے مستقل کالم میں لکھا تھا۔

جواب: جی ہاں میں اپنے ٹیلی ویژن دیکھنے کے خلاف ہوں۔ بمبئی میں میرے ایک مکان میں ایک ٹیلی ویژن سیٹ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کسی بھی دوسری چیز پر اپنے ذہن کو لگا نہیں پاتا تھا۔ میں بس ٹی وی کا بٹن دباتا اور جو کچھ اس پر آتا اس کو دیکھتا رہتا۔ خواہ وہ کتنا ہی بے معنی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ میں نے ٹیلی ویژن کمپنی سے کہا کہ وہ اس کو واپس لے جائے۔ کیونکہ میں لکھنے پڑھنے کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔

مسٹر خشونت سنگھ نے اس معاملہ میں جو کچھ کیا اس کو ہماری زبان میں ترجیح کہا جاتا ہے۔ ترجیح کا یہ اصول کسی بامقصد انسان کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اگر آپ کے سامنے ایک مقصد ہو تو آپ کو لازماً یہ کرنا پڑے گا۔ کہ آپ اصل مقصد کے سوا دوسری تمام چیزوں میں اپنی دلچسپی ختم کر دیں۔

اپنی توجہ کو دوسری تمام سمتوں سے ہٹا کر صرف مقصد کے رخ پر لگا دیں۔ یہ کامیابی کی لازمی شرط ہے۔ اس کے بغیر دنیا میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی۔

ایک چیز کو پانے کے لیے آپ کو دوسری چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر آپ چھوڑنے والی چیز کو نہ چھوڑیں۔ تو اس دنیا میں آپ پانے والی چیز کو بھی نہیں پائیں گے۔

باب دوم

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

اوراق حکمت

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سوچ کا فرق

فریڈرک لینگ برج (Frederick Langbridge) انگریزی کا ایک شاعر ہے وہ ۱۸۴۹ میں پیدا ہوا۔ ۱۹۲۳ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک شعر ہے۔ رات کے وقت دو آدمی جنگلہ کے باہر دیکھتے ہیں۔ ایک شخص کیچڑ دیکھتا ہے اور دوسرا شخص ستارہ۔

یہی بات ایک فارسی شاعر نے زیادہ بہتر طور پر اس طرح کہی ہے۔ کہ میرے اور تمہارے درمیان جو فرق ہے۔ وہ سننے کا فرق ہے۔ ایک آواز آتی ہے۔ تم اس کو دروازہ بند کرنے کی آواز سمجھتے ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ دروازہ کھلنے کی آواز ہے۔:

تفاوت است میان شنیدن من وتو ـــــــ تو غلق باب ومنم فتح باب می شنوم۔

درخت میں کانٹے کے ساتھ پھول بھی ہوتا ہے۔ یہی حال انسانی سماج کا بھی ہے۔ سماجی حالات خواہ کتنے غیر موافق ہوں۔ ہمیشہ اس کے اندر موافق پہلو بھی ساتھ ساتھ موجود رہتا ہے۔ ایک شخص جو چیزوں کو صرف ظاہری طور پر دیکھنے کی نگاہ رکھتا ہو۔ وہ سطحی چیزوں کو دیکھے گا۔ اور زیادہ گہرے پہلوؤں کو دیکھنے میں ناکام رہے گا۔ مگر جو شخص گہری نظر رکھتا ہو۔ وہ زیادہ دور تک دیکھے گا۔ اور نا موافق پہلو کے ساتھ موافق پہلو دیکھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس دنیا میں کیچڑ بھی ہے اور یہاں ستارے بھی ہیں۔ یہ دیکھنے کی بات ہے کہ کون شخص کس چیز کو دیکھتا ہے۔ اور کون شخص کس چیز کو۔ ایک ہی آواز ہے۔ مگر نادان آدمی اس کو دیکھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اور دانا آدمی سمجھتا ہے کہ دروازہ اس کے لیے کھول دیا گیا ہے۔

تمام مسائل ہمیشہ ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور ذہن کے اندر ہی ان کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی میں صحیح سوچ کا مادہ پیدا ہو جائے۔

www.urdukitabain.blogspot.com

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا عقل کا امتحان ہے۔ جو شخص اپنی عقل کو استعمال کرے گا۔ وہ اپنے لیے راستہ پالے گا۔ اور جو شخص عقل کو استعمال نہیں کرے گا۔ اس کے لیے بربادی کے سوا کوئی انجام مقدر نہیں۔

سمندر میں موجوں کے تھپیڑے ہیں۔ جو شخص سمندر میں اپنی کشتی چلانا چاہے۔ وہ مجبور ہے کہ موج اور طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے، اپنی کشتی مطلوبہ منزل کی طرف لے جائے۔ جنگل میں جھاڑیاں اور درندے ہیں۔ جو جانور جنگل میں رہتے ہیں۔ ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ کانٹے دار جھاڑیوں اور اپنے دشمن جانوروں کے درمیان اپنے لیے زندگی کا طریقہ نکالیں۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسانی سماج کا بھی ہے۔ انسانوں کے اندر ہر طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ مختلف اسباب سے ایک اور دوسرے کے بیچ میں ناخوشگواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ اونچ نیچ اور فرق سماجی زندگی میں ہمیشہ سے ہے۔ اور ہمیشہ باقی رہیں گے ان کو کسی حال میں ختم نہیں کیا جا سکتا۔

ایسی حالت میں انسان کے لئے زندگی اور کامیابی کا صرف ایک ہی ممکن راستہ ہے۔ وہ باوجود کے اصول کو اپنی پالیسی بنائے۔ وہ مخالفتوں کے باوجود لوگوں کو اپنا موافق بنانے کی کوشش کرے۔ وہ ناخوشگواریوں کے باوجود اپنے لیے خوشگوار زندگی کا راز دریافت کرے۔ اس کے خلاف عداوتیں اور سازشیں کی جائیں۔ تب بھی وہ اس یقین کے ساتھ آگے بڑھے کہ وہ اپنے مثبت عمل سے تمام منفی باتوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

اس دنیا میں آدمی کو کانٹے کے باوجود پھول تک اپنا ہاتھ پہنچانا ہوتا ہے۔ یہاں بیماریوں کے بے شمار جراثیم کے باوجود اپنے آپ کو تندرست اور صحت مند بنانا پڑتا ہے

۔اسی طرح اس دنیا میں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ ناموافق حالات کو دیکھ کر مایوس نہ ہو ۔اور نہ شکایت اور احتجاج میں اپنا وقت ضائع کرے ۔وہ ان حقائق سے موافقت کر کے جیے ۔جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔وہ راستہ کے ان پتھروں سے کترا کر نکل جائے ۔جو اس کے سفر میں حائل ہو رہے ہیں ۔لوگوں کی مخالفانہ باتوں پر مشتعل ہونے کی بجائیوہ تدبیری حکمت کے ذریعہ سے ان سے نپٹنے کی کوشش کرے ۔وہ کم ملنے پر راضی ہوتا کہ آئندہ اس کو زیادہ دیا جائے ۔وہ دشمنی پر صبر کرے تا کہ آج جو اس کے دشمن ہیں ۔کل وہ اس کے دوست بن جائیں ۔

تدبیر نہ کہ ٹکراؤ

مولانا جلال الدین رومی (۱۲۰۷-۱۲۷۳) کا درجہ مسلمانوں میں بہت اونچا ہے۔ تقریباً ۲۶ ہزار اشعار پر مشتمل ان کی مثنوی معنوی مسلمانوں کے درمیان تقدس کی حد تک مقبول ہے۔ یہ مثنوی صدیوں تک ایک رہنما کتاب کی حیثیت سے علما کے درمیان پڑھی جاتی رہی ہے۔

۱۲۵۸ میں تاتاریوں نے بغداد کو تباہ کر دیا۔ اور عباسی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ انھوں نے مسلم دنیا پر اپنی ظالمانہ حکومت قائم کر دی۔ اس وقت مولانا روم کی عمر تقریباً پچاس سال تھی۔ انھوں نے اپنی مثنوی کے ذریعہ مسلمانوں کو روحانی اور اخلاقی سبق دیا۔ اور انہیں اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔

اس کے ساتھ، ساتھ انھوں نیوقت کے مسائل میں بھی مسلمانوں کو رہنمائی دی۔ انھوں نے اپنی فارسی مثنوی میں حکایت اور تمثیل کی زبان میں مسلمانوں کو بتایا کہ ان حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ایک سبق آموز کہانی شیر اور خرگوش کی کہانی ہے۔ جو مثنوی کے دفتر اول میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے:

جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ وہ ہر روز اپنی بھوک مٹانے کے لیے جانوروں پر حملہ کرتا تھا۔ اور پکڑ کر انہیں اپنی خوراک بناتا تھا، اس کے نتیجہ میں تمام جانور مستقل طور پر خوف اور دہشت میں پڑے رہتے تھے۔

آخر انھوں نے اس کا ایک حل نکالا۔ انھوں نے شیر سے بات کر کے اس کو اس پر راضی کیا کہ وہ ان پر حملہ نہ کرے۔ وہ خود اپنی طرف سے ایک جانور اس کے پاس بھیج دیا کریں گے۔

اس تجویز پر عمل ہونے لگا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ ہر روز قرعہ کے ذریعہ یہ طے کیا

www.urdukitabain.blogspot.com

جاتا کہ آج کونسا جانور شیر کی خوراک بنے گا۔ جس جانور کے نام قرعہ نکلتا اس کو شیر کے پاس بھیج دیا جاتا۔ اس طرح تمام جانور امن کے ساتھ جنگل میں رہنے لگے۔ آخر کار قرعہ ایک خرگوش کے نام نکلا۔ یہ خرگوش پہلے سے سوچے ہوئے تھا کہ جب میرے نام قرعہ نکلے گا۔ تو میں اپنے آپ کو شیر کی خوراک بننے نہیں دونگا۔ بلکہ تدبیر کے ذریعہ خود شیر کو ہلاک کر دونگا۔

سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق خرگوش ایک گھنٹہ کی تاخیر سے شیر کے پاس پہنچا۔ شیر بہت بھوکا تھا، وہ تاخیر کی بنا پر اس کے اوپر بگڑ گیا۔ نیز ایک چھوٹا سا خرگوش دیکھ کر اس کو اور بھی زیادہ غصہ آیا۔ خرگوش نے نرمی اور لجاجت سے کہا کہ جناب، بات یہ ہے کہ آپ کی سلطنت میں ایک اور شیر آ گیا ہے۔ جانوروں نے آپ کی آج کی خوراک کے لیے دو خرگوش بھیجے تھے۔ مگر دوسرا شیر ہمارے اوپر جھپٹا۔ ایک کو تو اس نے پکڑ لیا ۔میں کسی طرح بھاگ کر آپ کے پاس آیا ہوں۔

اب شیر کا غصہ دوسری طرف مڑ گیا۔ اس نے چلا کر کہا کہ دوسرا شیر کون ہے۔ جس نے اس جنگل میں آنے کی جرات کی۔ مجھے اس کے پاس لے چلو تا کہ میں اس کا قصہ تمام کر دوں۔ اب خرگوش کے ساتھ شیر روانہ ہوا۔ خرگوش نے شیر کو ادھر اُدھر گھمایا۔ اور آخر میں اس کو ایک کنویں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ اور کہا کہ حضور وہ شیر اس کے اندر موجود ہے۔ آپ خود اس کو دیکھ لیں۔

شیر نے کنویں کے اوپر سے جھانکا تو نیچے پانی میں اس کو اپنا عکس نظر آیا۔ اس نے سمجھا کہ خرگوش کا کہنا درست ہے۔ اور واقعتہً اس کے اندر ایک اور شیر موجود ہے۔ شیر غرایا تو دوسرا شیر بھی غرا، اٹھا۔ اپنی سلطنت میں اس طرح کا ایک اور شیر کا گھس آنا اس کو برداشت نہ ہوا۔ وہ چھلانگ لگا کر مفروضہ شیر کے اوپر کود پڑا۔ اور پھر کنویں میں پڑا، پڑا مر گیا۔

اس طرح ایک خرگوش نے تدبیر کی طاقت سے شیر جیسے دشمن کا خاتمہ ہوگیا۔ مولانا روم آخر میں کہتے ہیں۔ کہ اس کی تدبیر کا جال گویا شیر کا پھندا تھا۔ کیسا عجیب تھا۔ وہ خرگوش جو ایک شیر کو اچک لے گیا۔

دام مکر او کمند شیر بود۔۔۔ طرفہ خرگوشے کہ شیرے رار بود۔

یہ حکایت کی زبان میں ایک رہنمائی تھی۔ جو مولانا روم نے اپنے زمانہ کے مسلمانوں کو دی۔

مولانا روم نے مسلمانوں کو مجاہدانہ اقدام پر نہیں ابھارا۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ جنگل کے تمام باسیوں کو چاہیے کہ وہ متحد ہو کر شیر کے اوپر حملہ کردیں۔ اگر انھوں نے شیر کو مار ڈالا تو وہ غازی کا لقب پائیں گے۔ اور اگر شیر ان کو مارنے میں کامیاب ہوگیا تو تب بھی کوئی نقصان نہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں وہ سب کے سب شہید قرار دیے جائیں گے۔ اور جس کو شہادت کا درجہ ملے۔ اس کو بہت بڑا درجہ مل گیا۔

مولانا روم نے اس کے برعکس مسلمانوں کو حکیمانہ تدبیر کی طرف رہنمائی دی۔ انھوں نے موت کی بجائے زندگی کا طریقہ بتایا۔ ان کی بتائی ہوئی حکیمانہ تدبیر میں انسان کو ابتدأً چھوٹا بننا پڑتا ہے۔ مگر آخری مرحلہ میں پہنچ کر وہ بڑائی اور فتح کے بلند مقام کو پالیتا ہے۔

مولانا روم کی یہ نصیحت حال کے لیے بھی اتنی ہی کارآمد ہے جتنی وہ ماضی کے لیے کارآمد تھی۔

دوسرا موقع

ریڈرز ڈائجسٹ فروری ۱۹۸۷ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔اس کا عنوان ہے:

(Dareto change your life) اپنی زندگی کو بدلنے کی جرأت کرو۔اس مضمون میں کئی ایسے واقعات دیے گئے ہیں۔جن میں ایک شخص کو ابتداً، ناکامی پیش آئی۔وہ نقصانات اور مشکلات سے دوچار ہوا۔مگر اس نے حوصلہ نہیں کھویا۔ایک موقع کھونے کے باوجود اس کی نظر دوسرے موقع پر لگی رہی۔یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ایک بار ناکام ہو کر اس نے دوسری بار کامیابی حاصل کر لی۔

زندگی سیکنڈ چانس (دوسرے موقع) کو استعمال کرنے کا نام ہے۔۔۔یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جو فرد کے لیے بھی اتنی ہی صحیح ہے۔جتنی قوم کے لیے۔پوری تاریخ اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔دور اول میں اسلام کو مکہ میں موقع نہ مل سکا۔اس کے بعد اسلام نے مدینہ کے موقع کو استعمال کر کے اپنی تاریخ بنائی۔مغربی قومیں صلیبی جنگوں میں اپنے لیے موقع نہ پا سکیں تو انھوں نے علمی مواقع کو استعمال کر کے دوبارہ کامیابی کا مقام حاصل کیا، وغیرہ۔

موجودہ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی پہلے موقع کو کھو دیتا ہے۔کبھی اپنے ناقص تجربہ کی وجہ سے کبھی دوسروں کی سرکشی کی وجہ سے۔مگر پہلے موقع کو کھونے کا مطلب ایک موقع کو کھونا ہے۔نہ کہ سارے مواقع کو کھونا۔پہلا موقع کھونے کے بعد اگر آدمی مایوس نہ ہو تو جلد ہی وہ دوسرا موقع پا لے گا۔جس کو استعمال کر کے وہ دوبارہ اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔

جن مواقع پر دوسرے لوگ قابض ہو چکے ہیں۔ان کو ان سے چھیننے کی کوشش کرنا عقل مندی نہیں۔عقل مندی یہ ہے کہ جو مواقع ابھی باقی ہوں۔ان پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

www.urdukitabain.blogspot.com

ٹائمس آف انڈیا ۱۳ اپریل ۱۹۸۹ (سیکشن ۲، صفحہ ۴) میں نیو یارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے ۔۔۔ سپر کمپیوٹر میں امریکہ سے آگے بڑھ جانے کے لیے جاپان کی کوشش۔:

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سپر کمپیوٹر کے میدان میں امریکہ کا طویل مدت کا غلبہ اب مشتبہ ہو گیا ہے۔ امریکہ کی ایک کارپوریشن کے تجزیہ کاروں نے مطالعہ کے بعد یہ اعلان کیا ہے کہ جاپان کا بنایا ہوا ایک سپر کمپیوٹر ۱۹۹۰ میں مارکیٹ میں آجائے گا۔ یہ دنیا کی سب سے زیادہ تیز کام کرنے والی مشین ہو گی۔

جاپانیوں نے اس کمپیوٹر کا نام ایس، ایس، ایکس (s.s.x) رکھا ہے۔ اس کی رفتار اتنی زیادہ ہے کہ وہ ایک سیکنڈ میں سائنٹفیک قسم کے حساب سے ۲۰ بلین آپریشن کر سکتا ہے ۔ یہ جاپانی کمپیوٹر امریکہ کے تیز ترین کمپیوٹر سے ۲۵ فی صد زیادہ تیز رفتار ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی مزید خصوصیت یہ ہے کہ کامل صحت کارکردگی کے ساتھ نسبتاً وہ کم خرچ بھی ہے۔

اس سپر کمپیوٹر کی اہمیت صرف سائنٹفک ریسرچ، تیل کی تلاش اور موسمی پیشین گوئی جیسی چیزوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ نیشنل سیکورٹی کے لیے بھی بے حد اہم سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ نیوکلیر ہتھیاروں کی تیاری میں بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔

نئے جاپانی کمپیوٹر نے دنیا کو ایک نئے صنعتی دور میں پہنچا دیا۔ موجودہ کمپیوٹر جو کسی زمانہ میں جدید سمجھے جاتے تھے۔ اب وہ روایتی اور تقلیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ جاپان کی اس ایجاد نیا س کو خود فوجی میدان میں بھی برتری عطا کر دی۔

امریکہ نے سپر بم بنا کر جاپان کو تباہ کر دیا تھا۔ مگر وہ جاپان سے یہ امکان نہ چھین سکا۔ کہ وہ سپر کمپیوٹر بنا کر دوبارہ نئی زندگی حاصل کر لے۔ اور صرف ۴۵ سال کے اندر تاریخ کا رخ موڑ دے۔ تخریب خواہ، وہ کتنی ہی بڑی ہو۔ وہ تعمیر نو کے مواقع کو ختم

نہیں کرتی۔ اور تعمیر کی طاقت، بہرحال تخریب کی طاقت سے زیادہ ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کامیابی کا ٹکٹ

امریکہ میں ایشیائی ملکوں سے آئے ہوئے جو لوگ آباد ہیں۔ان کو عام طور پر ایشیائی امریکی (Asian American) کہا جاتا ہے۔یہ لوگ زیادہ تر ۱۹۶۵ کے بعد یہاں آئے تھے۔امریکہ میں ان کی موجودہ تعداد تقریباً ۲ فی صد ہے۔ان میں کچھ یہودی ہیں۔کچھ بدھسٹ، کچھ کنفیوشش کو ماننے والے ہیں۔اور اسی طرح بعض دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

امریکہ میں اپنے مستقبل کی تعمیر کا مطلب اگر وہ یہ سمجھتے۔کہ ان کے فرقہ کا آدمی صدر کے عہدہ تک پہنچ جائے تو انہیں امریکہ میں اپنے لیے ترقی کا دروازہ بالکل بند نظر آتا۔کیونکہ صدر کے عہدہ کے لیے امریکہ کا پیدائشی شہری ہونا ضروری ہے۔اور ایشیائی لوگ اس تعریف میں نہیں آتے،صدارت کو اپنا نشانہ بنانے کی صورت میں۔ایشیائی مہاجرین یا تو مایوسی کا شکار رہتے۔یا اس بات کی ناکام مہم چلاتے کہ امریکی دستور میں ترمیم کرکے صدارت کی اس شرط کو ختم کیا جائے۔تاکہ ان کا آدمی بھی صدر کے عہدہ کے لیے جائز امیدوار بن کر کھڑا ہو سکے۔

مگر ایشیائی امریکیوں نے اس قسم کی حماقت نہیں کی۔انھوں نے اپنے واقعی حالت کے اعتبار سے امریکہ کا جائزہ لیا تو انھیں نظر آیا کہ یہاں ان کے جیسی اقلیت کے لیے اگرچہ صدارتی عہدہ تک پہنچنے کے مواقع نہیں ہیں۔

مگر اعلیٰ تعلیمی عہدوں تک پہنچنے کے مواقع پوری طرح موجود ہیں۔انھوں نے پایا کہ تعلیم ان کے لیے کامیابی کے ٹکٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔

انھوں نے اپنی ساری طاقت تعلیم کے حصول میں لگادی۔چنانچہ انھیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔حتیٰ کہ تعداد میں ۲ فی صد ہوتے ہوئے وہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بیس فی صد سیٹوں تک پر قابض ہو گئے۔

یہی دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔اس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ مواقع آدمی کے لیے کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔اور کچھ مواقع اس کے لیے کھلے ہوئے نہیں ہوتے۔آدمی کی بہترین عقل مندی یہ ہے کہ وہ کھلے ہوئے مواقع کو استعمال کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔اگر اس نے بند دروازوں سے سر ٹکرایا تو دروازہ تو نہیں کھلے گا۔البتہ اس کا سر ضرور ٹوٹ جائے گا۔خاص طور پر تعلیم آج کی دنیا میں کامیابی کی ٹکٹ ہے۔اور اس ٹکٹ کو حاصل کرنے کے مواقع ہر آدمی کے لیے ہر جگہ کھلے ہوئے ہیں۔

یہ اصول جو افراد کی ترقی کا راز ہے۔وہی ملکوں اور قوموں کی ترقی کا راز بھی ہے۔اس سلسلہ میں جاپان ایک قابل تقلید مثال پیش کرتا ہے۔

جاپان کے بارہ میں ایک امریکی مصنف کی کتاب چھپی ہے۔جس کا نام ہے جاپان نمبر ایک کی حیثیت سے، ڈھائی سو صفحہ کی اس کتاب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ جاپان کس طرح دوسری جنگ عظیم میں مکمل شکست سے دوچار ہونے کے بعد دوبارہ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ خود اپنے فاتح امریکہ کے لیے چیلنج بن گیا۔مصنف کے الفاظ میں جاپانی لوگ تبدیلی کے آقا بن گیے۔بجائے اس کے کہ وہ اس کا شکار بن جائیں۔دوسرے مملک کو بیرونی اثرات نے برباد کر دیا، مگر جاپان نے اس سے طاقت پائی۔

مصنف کے نزدیک جاپان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس نے فوجی اور سیاسی میدان میں شکست کھانے کے بعد اپنے میدان عمل کو بدل دیا۔اور اپنی ساری توجہ علم کے میدان میں لگا دی۔اس کتاب کے تیسرے باب میں مصنف نے بتایا ہے کہ جاپان کی موجودہ کامیابی کا واحد عامل اگر کسی چیز کو قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف ایک ہے۔اور وہ ہے جاپانی قوم میں علم کی تلاش کا لامتناہی جذبہ۔اس سلسلہ میں مصنف نے

لکھا ہے کہ

جب باہر کا کوئی آدمی جاپان آتا ہے تو اکثر جاپانی جبلی طور پر یہ سوچتے ہیں۔ میں اس سے کیا بات سیکھ سکتا ہوں۔ اور تین ملین جاپانی جو آجکل ہر سال باہر کی دنیا کا سفر کرتے ہیں۔ وہ جب باہر پہنچتے ہیں تو یہ کوشش کرتے ہیں کہ انھیں کوئی نیا تصور ہاتھ آ جائے۔ جس کو واپس جا کر وہ اپنے ملک میں استعمال کر سکیں۔

www.urdukitabain.blogspot.com
''کتاب زندگی'' ۔۔ ''مولانا وحید الدین خان'' ۔۔ انٹرنیٹ ایڈیشن سال 2006

مٹھاس کا اضافہ

ٹائمس آف انڈیا کے ضمیمہ بابت ۱۸۔۲۴ مارچ ۱۹۸۹ (صفحہ ٦) پر ایک سبق آموز واقعہ شائع ہوا ہے۔ ایران کے پارسی جب ہندوستان آئے تو وہ ہندوستان کے مغربی ساحل پر اترے۔ اس وقت یادورانا گجرات کا راجہ تھا۔ پارسی جماعت کا پیشوا راجہ سے ملا۔ اور اس سے یہ درخواست کی کہ وہ ان لوگوں کو اپنی ریاست میں ٹھہرنے کی اجازت دے۔ راجہ نے اس کے جواب میں دودھ سے بھرا ہوا گلاس پارسی پیشوا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری ریاست پہلے ہی آدمیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں مزید لوگوں کو ٹھہرانے کی گنجائش نہیں۔

پارسی پیشوا نے لفظوں میں اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے صرف یہ کیا کہ ایک چمچہ شکر لے کر دودھ میں ملایا۔ اور گلاس کو راجہ کی طرف لوٹا دیا۔ یہ اشاراتی زبان میں اس بات کا اظہار تھا۔ کہ ہم لوگ آپ کے دودھ پر قبضہ کرنے کی بجائے اس کو میٹھا بنا دیں گے۔ ہم آپ کی ریاست کی زندگی میں شیرینی کا اضافہ کریں گے۔ اس کے بعد راجہ نے انھیں گجرات میں قیام کی اجازت دے دی۔

اس واقعہ پر اب ایک ہزار سال کی مدت گزر چکی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پارسیوں کے رہنما نے جو بات کہی تھی۔ اس کو پارسی قوم نے پورا کر دکھایا۔ پارسی اس ملک میں مطالبہ اور احتجاج اور، ایجی ٹیشن کا جھنڈا لے کر کھڑے نہیں ہوئے۔ بلکہ انھوں نے اپنی خاموش محنت سے اس ملک کی ترقی میں اضافہ کیا۔ پارسیوں نے دوسروں سے زیادہ محنت کی۔ وہ تعلیم تجارت اور صنعت میں آگے بڑھے۔ انھوں نے ملک کی دولت اور ملک کی ترقی کو بڑھایا۔ اس ملک میں جہاں بہت سے لوگ لینے والے گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پارسیوں نے عمل کے ذریعہ اپنے لیے دینے والے گروہ کا درجہ حاصل کیا ہے۔ یہی زندگی کا راز ہے۔ اس دنیا میں دینے والا پاتا ہے۔ یہاں اس

آدمی کو باعزت جگہ ملتی ہے۔ جو لوگوں کے دودھ میں اپنی طرف سے مٹھاس کا اضافہ کرے، اس کے برعکس جن لوگوں کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے صرف کڑواپن ہو، انھیں بھی اس دنیا میں وہی چیز ملتی ہے جو انھوں نے دوسروں کو دی ہے۔

اگر آپ دنیا میں کچھ پانا چاہتے ہیں تو عطیہ کارڈ لے کر نکلیے۔ اگر آپ مطالبہ کارڈ لے کر نکلے تو یہاں آپ کو کچھ ملنے والا نہیں۔

۲۴ اگست ۱۹۸۸ کو مسٹر پی ڈی ملہوترا (پیدائش ۱۹۳۵) سے ملاقات ہوئی۔ وہ ساہتیہ اکیڈمی (نئی دہلی) میں تقریباً ۳۰ سال سے پبلی کیشنز منیجر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک روز مجھے دفتر میں دیر ہو گئی۔ گھر جانے کے لیے باہر نکلا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں اپنے سکوٹر پر چلتے ہوئے ایک سڑک پر پہنچا تو وہاں پولیس کے آدمی نے مجھے گھیر لیا۔ اس نے کہا اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھاؤ۔

مسٹر ملہوترا نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ڈرائیونگ کارڈ کے ساتھ ایک اور کارڈ نکل آیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں کارڈ لیتے ہوئے پوچھا کہ یہ دوسرا کارڈ کیا ہے۔ یہ دراصل آنکھ کے عطیہ کا کارڈ تھا۔ اس کارڈ پر آدمی کے دستخط کے ساتھ اس کی طرف سے یہ الفاظ درج ہوتے ہیں۔ کہ میں نے اپنی آنکھیں قوم کو عطیہ دی ہیں۔ براہ کرم میری موت پر سب سے قریبی آنکھ کے ہسپتال کو فوری اطلاع کر دیں۔ اور میری خواہش کو پورا کرنے میں ان کی مدد کریں۔ شکریہ:

پولیس کا آدمی پہلے بڑی رکھائی سے بات کر رہا تھا۔ مگر آنکھ کے عطیہ کا کارڈ دیکھتے ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے مزید جانچ کیے بغیر کہا۔۔ جائیے۔ جائیے۔

آنکھ کا عطیہ موجودہ زمانے میں ایک شریفانہ فعل سمجھا جاتا ہے۔ ٹی وی پر ان کی اپیل ان جذباتی لفظوں میں آتی ہے۔ دنیا میں ایک ہی چیز ہے جو آپ کسی کو دے سکتے ہیں۔ پولیس والے نے جب مسٹر ملہوترا کے پاس آنکھ کے عطیہ کا کارڈ دیکھا تو وہ سمجھا

کہ یہ ایک شریف اور ہمدرد انسان ہے۔ آنکھ کے عطیہ کا کارڈ مسٹر ملہوترا کے لیے اس بات کی پہچان بن گیا کہ وہ دوسروں کو دینے والے آدمی ہیں۔ اس چیز نے پولیس کے دل کو ان کے حق میں نرم کر دیا۔

اس دنیا میں دینے والے کو دیا جاتا ہے۔ جو دوسروں کو دے وہ دوسروں سے پاتا ہے حتیٰ کہ وہ اس وقت بھی پانے کا مستحق بن جاتا ہے۔ جب کہ اس نے ابھی عملاً نہ دیا ہو۔ اس نے ابھی صرف دینے کا ارادہ کیا ہو۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

مستقبل پر نظر

پبلی لیس سائرس (Pubilius Syrus) ایک لاتینی مصنف ہے۔اس کا زمانہ پہلی صدی قبل مسیح ہے۔وہ رومی عہد میں شام کے علاقے میں پیدا ہوا۔اور روم میں وفات پائی۔اس کا ایک قول انگریزی ترجمہ میں اس طرح نقل کیا گیا ہے۔۔عقل مند آدمی مستقبل کی اس طرح حفاظت کرتا ہے۔جیسے کہ وہ حال ہو۔

نادان آدمی کی نظر حال پر ہوتی ہے۔عقل مند آدمی کی نظر مستقبل پر۔نادان آدمی اپنے آج کے حالات میں ایک ناپسندیدہ چیز دیکھتا ہے۔وہ اس سے لڑنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔عقلمند آدمی دوراندیشی سے کام لیتا ہے۔وہ سوچتا ہے ہماری آج کی لڑائی کا انجام کل کس انداز میں نکلے گا۔

نادان آج کو دیکھ کر اقدام کرتا ہے۔عقل مند وہ ہے جو مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔

ہر اقدام اپنے نتیجہ کے اعتبار سے مستقبل کا واقعہ ہے۔اقدام آج کیا جاتا ہے۔مگر اس کا نتیجہ ہمیشہ آیندہ نکلتا ہے۔اس لیے یہی درست بات ہے کہ عملی اقدام کو آئندہ کے معیار سے جانچا جائے۔آج کی کاروائی کے ٹھیک یا بے ٹھیک ہونے کا فیصلہ اس اعتبار سے کیا جائے کہ کاروائی جب اپنے انجام پر پہنچے گی تو اس کا حاصل کس صورت میں ہمارے سامنے آئے گا۔

ایک شخص کو بھڑ نے کاٹ لیا۔اب وہ غصہ ہو کر ایسا کرے کہ بھڑوں کو سزا دینے کے لیے اپنا ہاتھ بھڑ کے چھتہ میں ڈال دے۔اگر کوئی آدمی ایسا کرے تو اس کی یہ شکایت بے معنی ہوگی کہ پہلے تو ایک بھڑ نے اس کو معمولی طریقہ پر کاٹا تھا۔اب سینکڑوں بھڑیں اس سے لپٹ گئیں۔اور اس کے سارے جسم کو ڈنک مار کر زخمی کر دیا۔

یہ دنیا دانش مندوں کے لیے ہے۔نادانوں کے لیے یہاں اس کے سوا کوئی انجام

www.urdukitabain.blogspot.com

نہیں کہ وہ بے سوچے سمجھے ایک اقدام کرے۔اور جب اس کا برا انجام سامنے آئے تو اس کے خلاف احتجاج کرنے بیٹھ جائے۔

آج کا مصرف صرف آج کو قربان کرنا نہیں۔بلکہ آج کو استعمال کرنا ہے۔

جو لوگ اس حکمت کو جانیں وہی اس دنیا میں بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ۔۔اچھا سپاہی جنگ کے پہلے ہی دن لڑ کر مر نہیں جاتا۔بلکہ وہ زندہ رہتا ہے تاکہ اگلے دن وہ دشمن سے لڑ سکے۔

یہ قول صرف بڑی،بڑی معروف جنگوں کے لیے نہیں۔وہ روزانہ پیش آنے والے مقابلوں کے لیے بھی ہے۔اگر کسی کے ساتھ آپ کی ان بن ہو جائے اور آپ فوراً ہی اس کے ساتھ آخری لڑائی لڑنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو آپ ایک بڑے سپاہی ہیں۔آپ اپنی زندگی میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر حالات میں آدمی پہلے دن زیادہ موثر لڑائی لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔اس لیے عقل مند وہ ہے جو پہلے دن لڑائی کو اوائیڈ کرے۔وہ لڑائی کے میدان سے ہٹ کر اپنے آپ کو مضبوط بنانے کی کوشش کرے۔تاکہ یا تو اس کے مقابلہ میں اس کا حریف اتنا کمزور ہو جائے کہ وہ لڑائی کے بغیر ہتھیار ڈال دے۔یا وہ خود اتنا طاقتور ہو جائے کہ وہ ہر معرکہ کو کامیابی کے ساتھ جیت سکے۔

اس اصول کی بہترین مثال اسلام کی تاریخ ہے۔پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ مدت کا نصف سے زیادہ حصہ مکہ میں گزارا۔یہاں آپ کے مخالفین نے ہر قسم کا ظلم کیا مگر آپ نے ان سے ٹکراؤ نہیں کیا۔آپ یک طرفہ طور پر صبر کرتے رہے۔مدینہ کی طرف ہجرت کر کے جب پھر انھوں نے ظلم کیا تو آپ نے اپنی فوج کو منظم کر کے ان سے جنگ کی۔اس کے بعد دوبارہ آپ حدیبیہ کے موقع پر جنگ سے رک گئے۔اس کے بعد جلد ہی وہ وقت آیا۔کہ دشمن نے کسی لڑائی کے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔اور اپنی

www.urdukitabain.blogspot.com

شکست مان لی۔

پہلے دن آپ نے دشمن کے خلاف صبر کیا۔ دوسرے دن آپ نے دشمن سے مسلح مقابلہ کیا اور اس کے اوپر کامیابی حاصل کی۔ حدیبیہ کے دوسرے دن تو مقابلہ کی نوبت ہی نہ آئی۔ دشمن نے بلا مقابلہ شکست مان کر اپنے ہتھیار رکھ دیے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

بیس سال بعد

کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔۔۔ چھ لفظ کے اس جملہ کو آج ایک شخص چھ سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنی زبان سے ادا کر سکتا ہے۔ مگر اس واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے کولمبس کو ۲۰ پر مشقت سال صرف کرنے پڑے۔

کرسٹوفر کولمبس ۱۴۵۱ کو اٹلی میں پیدا ہوا۔ ۱۵۰۶ میں اسپین میں اس کی وفات ہوئی۔ امریکہ کی دریافت حقیقۃً یورپ کے لیے مشرق کا سمندری راستہ دریافت کرنے کی ایک ضمنی کوشش تھی۔ کولمبس نے ۱۴۸۴ میں پرتگال کے شاہ جان دوم سے درخواست کی کہ وہ اس بحری سفر کے لیے اس کی مدد کرے۔ مگر شاہ پرتگال نے اس کو بے فائدہ سمجھ کر مدد کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد کولمبس نے کسیٹلی کی ملکہ ازبیلا سے مدد کی درخواست کی۔ یہاں بھی اس کو مثبت جواب نہیں ملا۔ تاہم کولمبس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ آٹھ سال بعد ملکہ نے اس کو کشتیاں اور ضروری سامان مہیا کر دیا۔

کولمبس نے تین کشتیوں کے ساتھ اپنا پہلا سفر ۱۴۹۲ کو شروع کیا۔ تاہم اس سفر میں وہ امریکہ کے سفر تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ہر قسم کی مشکلات اور آزمائشوں کے باوجود کولمبس اپنی کوششوں میں لگا رہا۔

آخر کار چوتھے سفر کے بعد وہ نئی دنیا کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ (10/691) کولمبس سے پہلے دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کولمبس کی دریافت نے نئی اور پرانی دونوں دنیاؤں کو ملا کر ایک کر دیا۔ یہ بلاشبہ ایک عظیم دریافت تھی۔ مگر یہ دریافت صرف اس وقت ممکن ہو سکی جب کولمبس اور اس کے ساتھی بے حوصلہ ہوئے بغیر ۲۰ سال تک اس جان جوکھم منصوبہ کی تکمیل میں لگے رہے۔

یہی اس دنیا میں کامیابی کا طریقہ ہے۔ اس دنیا میں ہر کامیابی ۲۰ سالہ محنت مانگتی ہے

www.urdukitabain.blogspot.com

۔اس کے بغیر یہاں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی ۔

اس دنیا میں ہر کامیابی لمبی جدوجہد کے بعد حاصل ہوتی ہے۔آدمی پہلے کم پر راضی ہوتا ہے۔اس کے بعد وہ زیادہ تک پہنچتا ہے۔

نیل آرم اسٹرانگ پہلے شخص ہیں جنھوں نے چاند کا سفر کیا۲۱ جولائی ۱۹۶۹ کو انھوں نے ایگل نامی چاندگاڑی سے اتر کر چاند کی سطح پر اپنا قدم رکھا۔اس وقت زمین اور چاند کے درمیان برابر مواصلاتی ربط قائم تھا۔چاند پر اترنے کے بعد انھوں نے زمین والوں کو جو پہلا پیغام دیا وہ یہ تھا کہ ایک شخص کے اعتبار سے یہ ایک چھوٹا سا قدم ہے مگر انسانیت کے لیے یہ ایک عظیم چھلانگ ہے۔

آرم سٹرانگ کا مطلب یہ تھا کہ میرا اس وقت چاند پر اترنا بظاہر صرف ایک شخص کا چاند پر اترنا ہے۔مگر وہ ایک نئے کائناتی دور کا آغاز ہے۔ایک شخص کے بحفاظت چاند پر اترنے سے یہ ثابت ہوگیا کہ انسان کے لیے چاند کا سفر ممکن ہے۔یہ دریافت آئندہ آگے بڑھے گی۔یہاں تک کہ وہ وقت آئے گا جب کہ عام لوگ ایک سیارہ سے دوسرے سیارہ تک اسی طرح سفر کرنے لگیں گے۔جس طرح وہ موجودہ زمین کے اوپر کرتے ہیں۔

ہر بڑا کام موجودہ دنیا میں اسی طرح ہوتا ہے۔ابتداً ایک فرد یا چند افراد قربانی دے کر ایک دریافت تک پہنچتے ہیں۔اس طرح وہ انسانی سفر کے لیے ایک نیا راستہ کھولتے ہیں۔یہ ابتدائی کام بلاشبہ انتہائی مشکل ہے۔وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے کھسکانے کے ہم معنی ہے۔مگر جب یہ ابتدائی کام ہو جاتا ہے۔تو اس کے بعد سارا معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔اب ایک ایسا کشادہ راستہ لوگوں کے سامنے آجاتا ہے۔کہ انسانی قافلے بڑی تعداد میں اس پر سفر کرسکیں۔

کسان جب زمین میں ایک بیج ڈالتا ہے۔تو وہ گویا زراعت کی طرف ایک چھوٹا قدم

www.urdukitabain.blogspot.com

ہوتا ہے۔تاہم اس چھوٹے قدم کے ساتھ ہی زرعی سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔یہ سفر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت آ جاتا ہے۔کہ اس کے کھیتوں میں ایک پوری فصل کھڑی ہوئی نظر آئے۔یہی طریقہ تمام انسانی معاملات کے لیے درست ہے۔خواہ وہ زراعت اور باغبانی ہو یا کوئی اور معاملہ۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

چیلنج نہ کہ ظلم

ایڈمنڈ برک (Edmund Berke) کا قول ہے کہ جو شخص ہم سے لڑتا ہے۔ وہ ہمارے اعصاب کو مضبوط کرتا ہے۔ اور ہماری استعداد کو تیز بناتا ہے۔ ہمارا مخالف ہمارا مددگار ہے۔

یہ عین وہی بات ہے جو شیخ سعدی نے گلستان کی ایک کہانی کے تحت تمثیلی طور پر اس طرح کہی ہے کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ بلی جب عاجز ہو جاتی ہے
تو وہ اپنے چنگل سے شیر کی آنکھ نکال لیتی ہے۔

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود ۔۔۔ بر آرد بہ چنگال چشم پلنگ

دوسروں کی طرف سے آپ کے خلاف کوئی واقعہ پیش آئے تو اس کے ردعمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اس کے ظلم کو سمجھیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اس کو چیلنج قرار دیں ظلم سمجھنے کی صورت میں شکایت کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ اور چیلنج سمجھنے کی صورت میں مقابلہ کا۔

شکایتی ذہن کو اپنے کرنے کا کام صرف یہ نظر آتا ہے۔ کہ وہ فریق ثانی کے خلاف چیخ و پکار شروع کر دے۔ وہ اس کے خلاف اپنے تمام احتجاجی الفاظ استعمال کر ڈالے۔ اس کے برعکس مقابلہ کا ذہن عمل کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ حالات کو سمجھ کر جوابی طریقہ تلاش کرنے میں لگ جاتا ہے۔

تاکہ حکمت اور تدبیر کے ذریعہ فریق ثانی کے مخالفانہ منصوبوں کو ناکام بنا دے۔

شکایت اور احتجاج کا ذہن آدمی کو ایسے راستوں کی طرف لے جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنی بچی ہوئی قوت بھی بے فائدہ ہنگاموں میں ضائع کر دے۔

جب کہ چیلنج اور مقابلہ کا ذہن آدمی کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔

وہ اس کو نیا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ وہ اس کو اتنا عظیم بنا دیتا ہے کہ کمزور بھی طاقتور پر

www.urdukitabain.blogspot.com

غالب آجائے۔اور بلی بھی شیر کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دے۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔یہاں شکایت کا ذہن آدمی کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔اور تدبیر کا ذہن تعمیر وترقی کی طرف۔

آپ راستہ چل رہے ہیں۔درمیان میں ایک جھاڑی سے آپ کا دامن الجھ جاتا ہے۔ایسے وقت میں آپ کیا کرتے ہیں۔آپ شکایت کی بجائے تدبیر کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔آپ جھاڑی کے خلاف احتجاج نہیں کرتے۔بلکہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کون سی صورت اپنائیں جس سے مسئلہ حل ہو جائے۔

عقل مند آدمی جانتا ہے کہ یہی طریقہ اس کو انسان کے معاملہ میں بھی اختیار کرنا ہے۔انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ایسا ہوتا ہے۔کہ کسی شخص سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔کسی سے کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے۔کسی شخص کے متعلق ہمارا احساس ہوتا ہے کہ اس نے ہمارا حق ہم کو نہیں دیا۔ایسے ہر موقع پر دوبارہ ہمیں شکایت کی بجائے تدبیر کا انداز اپنانا چاہیے۔

زندگی کا ہر مسئلہ چیلنج ہے نہ کہ ایک شخص کے اوپر دوسرے شخص کی زیادتی ہے۔آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ پیش آئے۔اور آپ اس کو زیادتی سمجھیں۔تو اس سے شکایت اور احتجاج کا ذہن پیدا ہوگا۔حتیٰ کہ یہ ذہن آپ کو یہاں تک لے جا سکتا ہے۔کہ آپ مایوسی کا شکار ہو جائیں۔آپ یہ سمجھ لیں۔کہ موجودہ ماحول میں آپ کے لیے کچھ کرنا ممکن ہی نہیں۔شکایت کا ذہن مایوسی کی طرف لے جاتا ہے۔اور مایوسی کا ذہن نفسیاتی خودکشی تک۔

اس کے برعکس اگر آپ کا یہ حال ہو کہ جب کوئی مسئلہ پیش آئے تو آپ اس کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھیں۔تو اس سے آپ کی سوئی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہونگی۔آپ کے اندر حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگا۔اول الذکر میں اگر آپ کا ذہن منفی رخ پر

چل رہا تھا تو اب آپ کا ذہن تمام تر مثبت رخ پر چل پڑے گا۔۔۔یہی ایک لفظ میں موجودہ دنیا میں کامیابی اور ناکامی کا راز ہے۔اس دنیا میں جو شخص مسائل سے شکایت اور احتجاج کی غذا لے۔اس کے لیے یہاں بربادی کے سوا، کوئی اور چیز مقدر نہیں۔اس کے برعکس جس شخص کا حال یہ ہو کہ مسائل کا سامنا پیش آنے کے بعد اس کا ذہن تدبیر تلاش کرنے میں لگ جائے۔وہ لازماً کامیاب ہو کر رہے گا، کیونکہ اس دنیا میں ہر مسئلہ کا ایک حل ہے۔اور ہر مشکل کی ایک تدبیر۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

غیر معمولی انسان

وان وورسٹ (Bruce van voorst) ایک امریکی جرنلسٹ ہے۔ اس نے جنگی رپورٹر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ڈامی نیکن کی جنگ (Dominican Republic) کی جنگ ایرانی انقلابیوں کی شاہ کے خلاف جنگ عراق اور ایران کی جنگ، اور خلیجی جنگ (1991) میں اس نے میدان جنگ میں پہنچ کر براہ راست رپورٹنگ کی ہے۔

ٹائم میگزین (۴ فروری ۱۹۹۱) میں وان وورسٹ کے کچھ تجربات شائع کیے گئے ہیں۔ اس نے جو باتیں کیں۔ ان میں سے ایک بات جنگ کے وقت فوجیوں کی صفت اور سلیت کے بارہ میں تھی۔ اس نے کہا جب جنگی مقابلہ جاری ہو تو فوجی حیرت انگیز طور پر اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ مشکلات سے بے پرواہ ہو کر اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ جنگ میں یہ فوجی عام فوجی نہیں ہوتے۔ وہ سب کے سب غیر معمولی لوگ بن جاتے ہیں۔

امریکی صحافی نے جو بات فوجیوں کے بارہ میں کہی ہے۔ وہ ہر انسان اور ہر مقابلہ کے لیے یکساں طور پر صحیح ہے۔ انسان کے اندر پیدائشی طور پر بیشمار صلاحیتیں ہیں۔ عام حالات میں یہ صلاحیتیں سوئی ہوئی رہتی ہیں۔

مگر جب کوئی خطرہ پیش آتا ہے۔ جب چیلنج کی صورت حال سامنے آتی ہے تو اچانک انسان کی تمام سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اس سے پہلے اگر اس کے پاور ہاؤس کا ایک بلب جل رہا تھا تو اب اس کے تمام بلب بیک وقت جل اٹھتے ہیں۔ اب اس کی عقل زیادہ گہری سوچ کا ثبوت دیتی ہے۔ اس کا جسم مزید طاقتوں کا محرک ہو جاتا ہے۔ اس کی پوری ہستی ہیروانہ کردار کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ چیلنج بظاہر ایک رکاوٹ ہے۔ مگر اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ اعلیٰ ترین ترقی کا سب سے بڑا زینہ

ہے۔مقابلہ پیش آنے سے پہلےہر انسان ایک معمولی انسان ہے۔مگر مقابلہ پیش آنے کے بعد ہر انسان غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔

جہاں اسکوپ نہ ہو وہاں زیادہ اسکوپ ہوتا ہے۔جہاں بظاہر مواقع نہ ہوں۔وہاں اور زیادہ بڑے مواقع آدمی کے لیے چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔

ایک مسلم نوجوان ہیں۔ان کے کچھ رشتہ دار امریکہ میں رہتے ہیں۔وہ امریکہ گیے۔وہاں تعلیم حاصل کی۔دو سال تک امریکہ میں ملازمت بھی کی۔پھر انہیں خیال آیا کہ اپنے ملک میں آئیں۔اور یہاں اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔چنانچہ وہ ہندوستان واپس آگیے۔

ان سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا۔میں ہندوستان آکر ذہنی خلفشار میں مبتلا ہوگیا ہوں۔یہاں جو میرے دوست اور رشتہ دار ہیں۔

وہ سب کہہ رہے ہیں کہ تم نے بہت نادانی کی کہ تم امریکہ چھوڑ کر ہندوستان آگئے۔وہاں تم کو ترقی کے بڑے،بڑے مواقع مل سکتے تھے۔یہاں تو تمہارے لیے کوئی اسکوپ نہیں،

میں نے جواب دیا کہ آپ کے دوست اور رشتے دار سب الٹی باتیں کر رہے ہیں۔میں کہتا ہوں ہندوستان میں اسکوپ نہیں،اسی لیے تو یہاں اسکوپ ہے ۔ہندوستان میں آپ کے لیے ترقی کے وہ تمام مواقع ہیں

جو امریکہ میں ہیں۔بلکہ یہاں آپ امریکہ سے بھی زیادہ ترقی کر سکتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ترقی کا تعلق دو چیزوں سے ہے۔ایک خارجی مواقع دوسرے اندرونی امکانات۔خارجی مواقع سے مراد وہ مواقع ہیں۔جو آپ کے وجود کے باہر خارجی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔اندرونی امکانات سے مراد وہ فطری استعداد ہے جو آپ کے ذہن اور آپ کے جسم

کے اندر اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہے۔

عام طور پر لوگوں کی نگاہ دنیا کے خارجی مواقع پر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں ملک میں مواقع ہیں اور فلاں ملک میں مواقع نہیں ہیں۔ مگر ترقی کے لیے اس سے بھی زیادہ اہمیت ان صلاحیتوں کی ہے جو فطرت سے ہر آدمی کو ملی ہوئی ہیں۔ کوئی بھی آدمی ان سے خالی نہیں۔

جب زندگی کی مشکلیں آدمی کو چیلنج کرتی ہیں تو اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ حالات کا جھٹکا انھیں جگا کر متحرک کر دیتا ہے۔ یہ بیداری کسی انسان کی زندگی میں اس کی ترقی کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ امریکہ میں یہ اسکوپ ہے کہ وہاں خارجی مواقع موجود ہیں۔ ہندوستان میں یہ اسکوپ ہے۔ کہ یہاں چیلنج کی صورت حال پائی جاتی ہے۔ جو آدمی کی فطری صلاحیتوں کو آخری حد تک جگا دیتی ہے۔ اور پہلے اسکوپ کے مقابلے میں دوسرا اسکوپ بلاشبہ کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

وقت کی اہمیت

لارڈ چسٹر فیلڈ (Lord chesterfield) ۱۶۹۴ میں لندن میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۷۳ میں وہیں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے اپنے لڑکے فلپ اسٹین ہوپ کے نام بہت سے خطوط لکھے تھے۔

ان خطوط میں زندگی کی کامیابی کا آرٹ بتایا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ خطوط چھاپ دیے گئے تھے۔

ایک خط میں لارڈ چسٹر نے کہا۔ میں نے تم سے کہا ہیکہ تم منٹوں کی حفاظت کرو۔ کیونکہ گھنٹے اپنے آپ ہی اپنی حفاظت کرلیں گے۔

اگر آپ اپنے منٹ کو ضائع نہ کریں تو گھنٹہ اپنے آپ ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔ کیونکہ منٹ، منٹ کے ملنے سے ہی گھنٹہ بنتا ہے۔ جس آدمی نے جزو کا خیال رکھا۔ اس نے گویا کل کا بھی خیال رکھا۔ کیونکہ جب بہت سا جز اکٹھا ہوتا ہے تو وہی کل بن جاتا ہے۔

بیشتر لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ زیادہ کی فکر میں کم کو بھولے رہتے ہیں۔ وہ اپنے ذہن کو بہت کی طرف اتنا زیادہ لگا دیتے ہیں۔ کہ تھوڑے کی طرف سے ان کی نگاہیں ہٹ جاتی ہیں۔ مگر آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں کچھ بھی نہیں ملتا۔

اپنے ملے ہوئے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیجیے۔ لمحوں کا استعمال کر کے آپ مہینوں اور سالوں کے مالک بن سکتے ہیں۔ اگر آپ نے لمحوں کو کھویا تو اس کے بعد آپ یقیناً مہینوں اور سالوں کو بھی کھودیں گے۔

اگر آپ روزانہ اپنے ایک گھنٹہ کا صرف پانچ منٹ کھوتے ہیں تو رات دن کے درمیان آپ نیر وزانہ ۲ گھنٹہ کھودیا۔ مہینہ میں ۶۰ گھنٹہ اور سال میں ۷۲۰ گھنٹے آپ کے ضائع ہو گئے۔ اسی طرح ہر آدمی اپنے ملے ہوئے وقت کا بہت سا حصہ ضائع کر دیتا

ہے۔ ۸۰ سال کی عمر پانے والا آدمی اپنی عمر کے ۴۰ سال بھی استعمال نہیں کر پاتا۔

وقت آپ کا سب سے بڑا سرمایا ہے۔ وقت کو ضائع ہونے سے بچایئے۔

ہر بڑی کامیابی چھوٹی، چھوٹی کامیابی کے مجموعے کا نام ہے۔ چھوٹی کامیابی پر راضی ہو جایئے۔ اس کے بعد آپ بڑی کامیابی بھی ضرور حاصل کر لیں گے۔

مولوی لطف اللہ ایک معمولی ٹیوٹر تھے۔ وہ ۱۸۰۲ میں مالوہ کے قدیم شہر دھارانگر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کسی انگریزی درس گاہ میں ایک دن بھی نہیں پڑھا۔ مگر ان کی خود نوشت انگریزی سوانح عمری ۱۸۵۷ میں لندن میں چھپی۔ لندن کے پبلشر اسمتھ ایلڈر اینڈ کمپنی نے اس کا نام یہ رکھا۔

(Autobiography of Lutufullah:A Mohammedan Gentleman)

اس کتاب کے ساتھ ایک انگریز مصنف مسٹر ایسٹ وِیک کا دیباچہ شامل ہے۔ انھوں نے دیباچہ میں مصنف کی صحیح انگریزی کی تعریف کی ہے۔

انھوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ کہ ایک ہندوستانی نے بدیسی زبان میں اتنی ضخیم کتاب کس طرح لکھی۔

مولوی لطف اللہ نے یہ صلاحیت کیسے پیدا کی۔ کہ وہ انگریزی زبان میں ایک ایسی کتاب لکھیں جو لندن سے چھپے، اور انگریز ادیب اسکی زبان کی تعریف کرے۔ اس کا راز اردو کے اس مشہور مقولہ میں چھپا ہوا ہے۔ تھوڑا تھوڑا بہت ہو جاتا ہے۔

مولوی لطف اللہ نے انگریزی زبان صرف اپنی محنت سے سیکھی۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کو ہندوستانی، فارسی اور مرہٹی زبانیں سکھاتے تھے۔ ان کے انگریز شاگردوں کی تعداد سو سے اوپر تھی۔ انگریزوں سے تعلق کے نتیجہ میں ان کے اندر انگریزی سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے ذاتی مطالعہ سے انگریزی زبان پڑھنا

شروع کی۔

اور آٹھ سال کی لگاتار محنت کے نتیجہ میں اس پر پوری قدرت حاصل کر لی۔انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس آٹھ سال کی مدت میں۔کوئی ایک رات ایسی نہیں گزری، جب کہ سونے سے پہلے میں نے انگریزی کے دس لفظ یاد نہ کیے ہوں۔اور ڈاکٹر گل کرسٹ کی قواعد کی کتابوں کے چند صفحے توجہ سے پڑھ کر ذہن میں محفوظ نہ کیے ہوں، دس لفظ بظاہر بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔مگر دس لفظ روزانہ کی رفتار کو جب آٹھ سال تک پھیلا دیا جائے تو وہ ایک شخص کو غیر زبان کا ایسا ادیب بنا دیتے ہیں۔کہ اہل زبان بھی اس کی زبان دانی کا اعتراف کریں۔

شیر کا طریقہ

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ مارچ ۱۹۹۱) میں شیر کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ شیر جنگل کی گھاس پر چلنا پسند نہیں کرتے۔ انہیں اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی کانٹا ان کے نرم پاؤں میں نہ چبھ جائے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ کھلے راستوں پر یا سڑکوں پر چلتے ہیں

شیر اور دوسرے تمام جانور فطرت کے مدرسہ کے تربیت یافتہ ہیں۔ وہ ہمیشہ اس طریقہ پر چلتے ہیں۔ جو ان کے خالق نے براہ راست طور پر انہیں بتایا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ شیر کا مذکورہ طریقہ فطرت کا پسندیدہ طریقہ ہے۔ شیر کے لیے یہ احتیاطی طریقہ اسکی طینت میں رکھ دیا گیا ہے۔ اور انسان کے لیے شریعت کی زبان میں یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی ہے۔ کہ اپنے بچاؤ کا انتظام رکھو۔

اللہ تعالیٰ نے جس خاص مصلحت کے تحت موجودہ دنیا کو بنایا ہے۔ اس کی بنا پر یہاں صاف ستھرے راستے بھی ہیں۔ اور کانٹے دار جھاڑیاں بھی۔ یہ کانٹے دار جھاڑیاں لازماً اس دنیا میں رہیں گی۔ ان کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ اب یہاں جو کچھ کرنا ہے وہ وہی ہے جو خدا کے سکھائے ہوئے طریقہ کے مطابق شیر کرتا ہے۔ یعنی کانٹے دار جھاڑیوں سے اپنے آپ کو بچایا جائے۔ اور صاف اور کھلا راستہ تلاش کر کے اس پر اپنا سفر جاری کیا جائے۔

شیر جنگل کی گھاس سے اعراض کرتے ہوئے چلتا ہے۔ ہم کو انسانوں کے فتنہ سے اعراض کرتے ہوئے اپنا سفر حیات طے کرنا ہے۔

ہم کو چاہیے کہ اپنے کسی عمل سے دوسروں کو غصہ نہ دلائیں۔ اور اگر دوسرے لوگ ہم پر غضبناک ہو جائیں تو صبر کے ذریعے ان کے غصہ کو ٹھنڈا کریں۔ اور حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو ان کے غضب کا شکار ہونے سے بچائیں۔

www.urdukitabain.blogspot.com

جنگل کا بادشاہ جو کچھ کرتا ہے ۔وہ بزدلی نہیں ہے ۔ بلکہ عین بہادری ہے ۔اس طرح ایک انسان اپنے سماج میں یہی طریقہ اختیار کرے ۔تو وہ بزدلی نہیں ہوگا۔ بلکہ عین بہادری ہوگا۔اعراض کا طریقہ شیر کا طریقہ ہے

نہ کہ گیدڑ کا طریقہ۔

خداوند عالم کا ایک ہی قانون ہے ۔ جو انسانوں سے بھی مطلوب ہے ۔اور غیر انسانوں سے بھی ،اور وہ ہے نا خوشگوار باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔

گلاب کے پھولوں کا ایک باغ ہے ۔آپ اس میں داخل ہوتے ہیں اس کی خوبصورت پتیاں اوراس کے خوشبودار پھول آپ کو متاثر کرتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے کانٹے آپ کو لگ جاتے ہیں ۔آپ کا ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے ۔یا آپ کے کپڑے کانٹوں میں پھنس جاتے ہیں ۔

اب ایک صورت یہ ہے کہ گلاب کے باغ میں کانٹوں کی موجودگی کو آپ باغبان کا فعل قرار دیں ۔دوسری صورت یہ ہے کہ آپ یہ جانیں کہ یہ کانٹے قانون قدرت کا نتیجہ ہیں ۔اگر آپ کانٹوں کی موجودگی کا سبب باغبان کو سمجھیں ۔تو آپ کے اندر نفرت اور شکایت کا ذہن ابھرے گا ۔اور اگر آپ اس کو قانون قدرت کا نتیجہ سمجھیں تو آپ کانٹوں کی موجودگی کو بطور حقیقت تسلیم کرتے ہوئے یہ کوشش کریں گے کہ اس سے اعراض کرتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کریں ۔ایک تشخیص سے احتجاج کا ذہن ابھرے گا اور دوسری تشخیص سے تدبیر تلاش کرنے کا۔

ہندوستان میں اکثریتی فرقہ کی طرف سے جو قابل شکایت بات پیش آتی ہے ۔ان کو مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے انسان کا پیدا کردہ مسئلہ سمجھتے ہیں ۔اس لیے وہ احتجاج کی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہیں ۔مگر یہ سراسر عبث ہے ۔یہ ایسا ہی ہے جیسے گلاب کے کانٹوں کے خلاف شوروغل کیا جائے ۔گلاب کے درخت میں کانٹے بہر

حال رہیں گے۔اسی طرح انسان سماج میں ایک سے دوسرے کو تلخ باتیں بھی ضرور پیش آئیں گی۔

ان تلخ اور قابل شکایت باتوں کا حل صرف ایک ہے۔ان سے اعراض کرنا۔ان کو نظر انداز کوتے ہوئے اپنے سفر حیات پر رواں دواں رہنا۔اس قسم کے سماجی مسائل خود خدا کے تخلیقی منصوبہ کا حصہ ہیں۔اس لیے وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔البتہ ان کو موجودگی کو گوارہ کر کے ہم اپنی زندگی کے سفر کو ضرور جاری رکھ سکتے ہیں۔

نادان آدمی ناموافق باتوں سے الجھتا ہے۔دانش مند آدمی ناموافق باتوں سے دامن بچاتے ہوئے گزر جاتا ہے۔یہی ایک لفظ میں۔اس دنیا میں ناکامی اور کامیابی کا راز ہے۔یہاں الجھنے کا نام ناکامی ہے اور نظر انداز کرنے کا نام کامیابی ہے۔

خون کی بجائے پانی

محمد افضل لادی والا (۳۵ سال) بمبئی کے رہنے والے ہیں۔ ۲۴ فروری 1991 کی ملاقات میں انھوں نے اپنا ایک واقعہ بتایا۔ ۲۲ جنوری 1991 کو رنگ بھون (دھوبی تلاؤ) میں ایک کلچرل پروگرام تھا۔ افضل صاحب نے اس میں شرکت کی۔ ساڑھے گیارہ بجے رات کو یہ پروگرام ختم ہوا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ بمبئی اسٹیشن پر پہنچے۔ اور ٹرین کے ذریعہ کرلا آئے۔ اس وقت تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت ہو چکا تھا۔ اسٹیشن سے رہائش گاہ (ہل پلاؤ) تک تقریباً دو کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ انھوں نے چاہا کہ تھری وھیلر کے ذریعہ گھر کے لیے روانہ ہوں۔ تھری وھیلر کے انتظار میں وہ سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں ایک تھری وھیلر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس وقت ان کے منہ میں پان تھا۔ تھری وھیلر کو آواز دینے کے لیے انھوں نے جلدی میں پان کو تھوکا۔ اتفاق سے عین اسی وقت ایک مسافر سائیڈ میں

آ گیا۔ اور افضل صاحب کا پان پورا کا پورا اس کے پاؤں پر جا گرا۔

مسافر آگ بگولہ ہو گیا۔ طیش میں آکر اس نے کہا، پان کھاتے ہو اور پان کھانے کی تمیز بھی نہیں۔ مگر افضل صاحب جو الرسالہ کے مستقل قاری بھی ہیں۔ انھوں نے گرم الفاظ کا جواب ٹھنڈے الفاظ سے دیا۔ انھوں نے کہ میں اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہوں۔ پان کھانا بھی غلط اور پان کھا کر میں نے جو کچھ کیا، وہ بھی غلط، وہ آدمی تیز ہوتا گیا۔ مگر افضل صاحب نے اس کی اشتعال انگیز باتوں کا جواب دینے کی بجائے کہا کہ مجھے معاف کیجیے۔ اس نے کہا کہ یہ اچھا ہے۔ کہ کسی کے ساتھ کچھ بھی کر دو، اس کے بعد کہا کہ معاف کر دو۔

افضل صاحب نے کہا کہ بھائی میں رسمی معافی نہیں مانگ رہا ہوں، میں دل سے معافی مانگ رہا ہوں۔ اب آپ مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کے پاؤں دھوؤں۔ افضل

صاحب نے جب پاؤں دھونے کی بات کی تو وہ آدمی کچھ نرم پڑا۔کچھ اور باتوں کے بعد آخر کار وہ راضی ہوا کہ افضل صاحب اس کا پاؤں دھودیں۔قریب ہی ایک چائے وغیرہ کا ہوٹل تھا، افضل صاحب فوراً اس کے پاس گئے اور کہا چچا ایک گلاس پانی دینا۔ افضل صاحب گلاس لے کر آئے تو وہ آدمی بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔اس نے کہا مجھ کو دیجیے میں اپنے ہاتھ سے دھولیتا ہوں۔

آدمی نے اپنے ہاتھ میں گلاس لے کر دھویا۔ایک گلاس سے پوری صفائی نہیں ہوئی تو افضل صاحب دوڑ کر گئے اور ایک گلاس پانی مزید لے آئے۔یہاں تک کہ اس کا پاؤں پوری طرح صاف ہو گیا۔یہ واقعہ ریلوے اسٹیشن کے باہر پیش آیا۔گفتگو کے دوران افضل صاحب نے کہا۔بھائی صاحب آپ تو میم ہیں۔اگر آپ کاف ہوتے تب بھی مجھے یہی کرنا تھا۔

کیونکہ اسلام نے ہم کو ایسا ہی حکم دیا ہے۔یہ سن کر وہ آدمی افضل صاحب سے لپٹ گیا۔اس نے کہا بھائی صاحب میں کاف ہی ہوں۔اور آپ جیسا مسلمان مجھے اپنی زندگی میں پہلی بار ملا ہے۔اور اگر دوسرے مسلمان بھی آپ جیسے ہو جائیں تو سارا جھگڑا ختم ہو جائے۔

اب وہ آدمی بالکل بدل گیا۔پہلے اس کے اندر غصہ اور انتقام بھڑ کا تھا۔اب وہ شرمندہ ہو کر کہنے لگا۔بھائی مجھ کو معاف کرنا میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔میری وجہ سے آپ کو پانی لانا پڑا۔آپ کا تھری وہیلر بھی چھوٹ گیا، افجل صاحب نے کہا مجھ کو شرمندہ نہ کیجیے۔اس معاملہ میں اصل غلطی تو میری تھی۔اور میں جو پانی لایا تو وہ میرا فرض تھا جو میں نے ادا کیا۔واقعہ کے شروع میں جو آدمی دوسرے کو غلط بتا رہا تھا۔واقعہ کے آخر میں وہ خود اپنی غلطی مان کر شرمندہ ہو گیا۔اور معافی مانگنے لگا۔

جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت بمبئی کے علاقے جو گیشوری میں زبردست کشیدگی

تھی۔ یہ مقام کرلا سے تقریباً ۱۵ کیلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ان حالات میں اگر افضل صاحب اشتعال کے جواب میں اشتعال کا انداز اختیار کرتے تو وہی ہوتا جو اس طرح کے مواقع پر دوسری بہت سی جگہوں پر ہو چکا ہے۔ یعنی فرقہ وارانہ فسادات اور جان و مال کی تباہی۔ اس کے بعد شاید ایسا ہوتا کہ افضل صاحب خدانخواستہ گھر کی بجائے اسپتال لے جائے جاتے۔ اور علاقہ میں ہندو مسلم فساد برپا ہو کر سینکڑوں خاندانوں کو برباد کر دیتا۔

افضل صاحب نے یہ واقعہ بتاتے ہوئے کہا۔ اس وقت مجھے الرسالہ کی بات یاد آئی۔ یہ الرسالہ کے دیے ہوئے ذہن کا نتیجہ تھا کہ میں اشتعال کے موقع پر مشتعل ہونے سے بچ گیا۔ اور نتیجۃً اس کے برے انجام سے بھی۔ میرے گلاس بھر پانی نے سینکڑوں لوگوں کو اس بھیانک انجام سے بچا لیا۔ کہ ان کا خون سڑکوں پر بہایا جائے۔ ایک قسم کے الفاظ بول کر آپ آدمی کے ذہن کو غصہ کا تنور بنا سکتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے الفاظ بول کر

آدمی کے بھڑکتے ہوئے غصہ کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔ الفاظ آگ کا کام بھی کرتے ہیں اور برف کا بھی۔ یہ بولنے والے کے اوپر ہے کہ وہ دونوں میں سے اپنے لیے کس چیز کا انتخاب کرتا ہے۔

آسان حل

الطاف حسین پانی پتی (۱۸۳۷-۱۹۱۴) ایک انقلابی ذہن کے آدمی تھے۔انھوں نے اردو ادب میں اصلاح کی تحریک چلائی، انھوں نے قدیم اردو شاعری پر سخت تنقید کی ۔انھوں نے کہا کہ اردو شاعری مبالغہ اور عشق و عاشقی اور فرضی خیال آرائی کا مجموعہ ہے ۔اس کی بجائے اس کو بامقصد شاعری ہونا چاہیے۔اس کا ایک نمونہ انھوں نے خود مسدس کی صورت میں پیش کیا۔

حالی کی یہ تنقید ان لوگوں کو بہت بری لگی ۔جو اردو شاعری پر ناز کرتے تھے۔اور اس کو اپنے لیے فخر بنائے ہوئے تھے۔چنانچہ حالی کے خلاف نہایت نازیبا قسم کے مضامین شائع ہونا شروع ہوئے ۔لکھنؤ کا اخبار اودھ پنچ اکثر نہایت برے انداز میں ان کر خلاف لکھتا۔اور اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کرتا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے۔۔۔میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے۔

حالی نے ان بیہودہ مخالفتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے ۔آخر کار چند سال کے بعد وہ لوگ تھک کر چپ ہو گئے۔کسی نے حالی سے سوال کیا ۔کہ آپ کے مخالفین کیسے خاموش ہو گئے۔اس کے جواب میں حالی نے کسی کا نام لیے بغیر یہ شعر پڑھا۔

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے سب چپ۔۔سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

جھوٹی مخالفتوں کا سب سے زیادہ آسان اور کارگر جواب یہ ہے کہ اس کا جواب نہ دیا جائے ،جھوٹی مخالفت ہمیشہ بے بنیاد ہوتی ہے۔اس کے لیے مقدر ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ ڈھے پڑے ۔ایسی مخالفت کا جواب دینا گویا اس کی عمر لمبی کرنا ہے۔اگر آدمی صبر کر لے تو بے جڑ درخت کی طرح ایک روز وہ اپنے آپ گر پڑے گی۔وہ بھی دیر تک

خدا کی زمین پر قائم نہیں رہ سکتی۔

جھوٹ کا سب بڑا قاتل وقت ہے۔آپ آنے والے وقت کا انتظار کیجیے۔اور اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وقت نے اس فتنہ کو زیادہ کامل طور پر ہلاک کر دیا ہے۔جس کو آپ صرف ناقص طور پر ہلاک کرنے کی تدبیر کر رہے تھے۔

اس تدبیر کا تعلق کسی ایک معاملہ سے نہیں۔جس معاملہ میں بھی خاموش انتظار کی یہ تدبیر اختیار کی جائے گی۔آخر کار وہ کارگر ثابت ہوگی۔

کچھ عیسائیوں نے دہلی کے پلوں اور دیواروں پر کالے رنگ سے انگریزی میں یہ فقرہ لکھ دیا کہ مسیح جلد آنے والے ہیں۔اس کے بعد کچھ ہندو نوجوانوں میں جوش پیدا ہوا۔انھوں نے مذکورہ فقرے کے آگے ہر جگہ یہ الفاظ لکھ دیئے کہ ہندو بننے کے لیے۔جملہ کی ساخت بتاتی ہے کہ یہ پڑھے لکھے ہندو کا فعل نہیں تھا۔کیونکہ انگریزی کے اعتبار سے صحیح جملہ یوں ہوگا۔(To become Hindu)

اس قسم کا واقعہ اگر کسی شہر میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آتا تو فوراً کچھ سطحی قسم کے لوگ یہ کہنا شروع کر دیتے کہ یہ توہین رسول ہے۔یہ مسلمانوں کی دل آزاری ہے۔یہ ہماری ملی غیرت کو چیلنج ہے۔اس کے بعد کچھ مسلم نوجوان مشتعل ہو کر جوابی کاروائی کرتے۔اور پھر شہر کے اندر ہندو مسلم فساد ہو جاتا۔اب نام نہاد مسلم لیڈر بیانات دے کر انتظامیہ کا نکما پن ثابت کرتے۔ریلیف فنڈ کھول کر کچھ لوگ ملی خدمات کا کریڈٹ لینا شروع کر دیتے۔مسلمانوں کے اخبارات میں گرما گرم سرخیاں چھپتیں،جس کے نتیجہ میں ان کی اشاعت بڑھ جاتی۔اور جہاں تک مسلم عوام کا تعلق ہے ان کے حصہ میں اس کے سوا اور کچھ نہ آتا کہ ان کی بربادی میں مزید اضافہ ہو جائے۔

مگر عیسایوں نے اس اشتعال انگیز کاروائی کا کوئی نوٹس نہ لیا،۔نتیجہ یہ ہوا کہ یہ واقعہ

محض ایک بے واقعہ بن کر رہ گیا۔

۱۹ فروری ۱۹۹۰ کی صبح کو میں اوبرائے ہوٹل (نئی دہلی) کے پاس فلائیور پر کھڑا ہوا اس کی دیواروں پر یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پل کے دونوں طرف کی کشادہ سڑک پر سواریاں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ کسی کو بھی یہ فرصت نہ تھی کہ وہ ٹھہر کر پل کے اوپر لکھے ہوئے ان الفاظ کو پڑھے۔ یہ الفاظ پل کی دیواروں پر نا قابل التفات نشان کے طور پر صرف اس بات کے منتظر تھے کہ بارش کا پانی اور ہواؤں کا جھونکا ان کو مٹا دے۔ اس سے پہلے کہ کوئی ان کو پڑھے یا ان سے کوئی اثر قبول کرے۔

جو اشتعال انگیزی اتنی بے حقیقت ہو۔ اس پر جو لوگ مشتعل ہو کر فساد کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔ وہ بلا شبہ تمام نادانوں سے زیادہ نادان ہیں۔

علم کی اہمیت

جیفرسن (Thomas Jefferson) امریکہ کا تیسرا صدر تھا۔ وہ ۱۷۴۳ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۲۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ۱۸۰۱ سے ۱۸۰۹ تک امریکہ کا صدر رہا۔ جیفرسن نہایت قابل آدمی تھا۔ وہ انگریزی، لاطینی، یونانی، فرانسیسی، اسپینی، اطالوی، اور اینگلوسیکسن زبانیں جانتا تھا۔ مورخین اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک انتہائی غیر معمولی قسم کا صاحب علم آدمی تھا۔

اس نے اپنی طویل عمر میں فلسفہ اور سائنس سے لے کر مذہب تک تقریباً تمام علوم کا گہرا مطالعہ کیا۔ آخر عمر میں اس نے یہ کوشش کی کہ وہ انجیل کا تجزیہ کرے۔ اور یہ معلوم کرے کہ حضرت مسیح نے واقعۃً کہا تھا۔ اور بیان کرنے والوں نے ان کے بارے میں کیا بیان کیا۔

جیفرسن نے آخری عمر میں یہ وصیت کی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر جو کتبہ لگایا جائے۔ اس میں یہ نہ لکھا جائے کہ وہ امریکہ کا صدر تھا بلکہ یہ لکھا جائے کہ وہ ورجینا یونیورسٹی کا بانی تھا۔ چنانچہ اس کی وصیت کے مطابق اس کی قبر پر جو کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس میں یہ الفاظ درج ہیں۔

Here was buried Thomas Jefferson.....father of University of verGina

حقیقت یہ ہے کہ علم سب سے بڑی دولت ہے۔ جو لوگ علم کی اہمیت کو جان لیں ان کو امریکہ کی صدارت بھی ہیچ معلوم ہوگی۔

علم سب سے بڑی دولت ہے۔ علم ہی وہ واحد چیز ہے۔ جس سے آدمی کبھی نہیں اکتاتا۔ جس کی حد کبھی کسی کے لیے نہیں آتی۔ علم ہر معاملہ میں کارآمد ہے۔ وہ ہر میدان میں کامیابی کا زینہ ہے۔ علم سے آدمی کو وہ شعور ملتا ہے۔ جس سے وہ دنیا

کو جانے۔ جس سے وہ باتوں کو ان کی گہرائی تک سمجھ سکے۔ علم ایسا سکہ ہے جس سے آپ دنیا کی ہر چیز خرید سکتے ہیں۔

علم ہر قسم کی ترقی کا راز ہے۔ فرد کے لیے بھی اور قوم کے لیے بھی، جس کے پاس علم ہو اس کے پاس گویا ہر چیز موجود ہے۔

جناب عبدالرحمٰن انتولے (بیرسٹر ایٹ لا، اور سابق چیف منسٹر مہاراشٹر) نے ۵ فروری ۱۹۸۷ کی ملاقات میں ایک واقعہ بتایا۔ غالباً ۱۹۵۴ کی بات ہے۔ اس وقت وہ لندن میں کونسل آف لیگل ایجوکیشن میں قانون کے طالب علم تھے۔ ایک لیکچر کے دوران ایک قانونی مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے انگریز پروفیسر نے انھیں یہ واقعہ سنایا۔

پروفیسر نے بتایا کہ ایک بڑا صنعتی کارخانہ چلتے، چلتے اچانک بند ہو گیا۔

کارخانہ کے انجینئر اس کو دوبارہ چلانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر ایک بڑے اکسپرٹ کو بلایا گیا۔ وہ آیا تو اس نے کارخانے کا ایک راونڈ لیا۔ اس نے اس کی مشینیں دیکھیں۔ اس کے بعد وہ ایک جگہ رک گیا۔ اس نے کہا ایک ہتھوڑا لاؤ۔ ہتھوڑا لایا گیا تو اس نے ایک مقام پر ہتھوڑے سے مارا۔ اس کے بعد مشین حرکت میں آ گئی۔ اور کارخانہ چلنے لگا۔

مذکورہ ایکسپرٹ نے واپس جا کر ایک سو پونڈ کا بل بھیج دیا۔ کارخانے کے منیجر کو یہ بل بہت زیادہ معلوم ہوا۔ اس نے ایکسپرٹ کے نام اپنے خط میں لکھا کہ آپ نے تو کوئی کام کیا نہیں۔ یہاں آ کر آپ نے صرف ہتھوڑا مار دیا۔ اس کے لیے ایک سو پونڈ کا بل ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ براہ کرم آپ ہمارے نمائندہ کو مزید اور زیادہ بہتر تفصیلات عطا فرمائیں۔

اس کے جواب میں مذکورہ اکسپرٹ نے لکھا۔ میں نے جو بل روانہ کیا ہے۔ وہ بالکل

صحیح ہے۔اصل یہ ہے کہ ۹۹ پونڈ اور ۱۹ شیلنگ تو یہ جاننے کے لیے ہیں۔کہ مشین میں غلطی کیا ہے۔اور ایک شلنگ ہتھوڑا اٹھا کر مارنے کے لیے:

اس دنیا میں سب سے زیادہ قیمت علم کی ہے۔سو میں اگر ایک محنت کی قیمت ہو تو سو میں ننانوے علم کی قیمت قرار پائے گی۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

محرومی کے بعد بھی

سموئیل بٹلر (Samuel Butler) انیسویں صدی کا مشہور مصنف ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ زندگی اس فن کا نام ہے کہ ناکافی مقدمات سے کافی نتائج اخذ کیے جائیں۔

سموئیل بٹلر نے یہ بات فطری تعقل کے تحت کہی ہے مگر زندگی کے بارے میں شریعت نے جو تصور دیا ہے، وہ بھی عین یہی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے۔ کہ اس دنیا میں خدا نے جو نظام بنایا ہے۔ اس میں آسانی کے ساتھ مشکل لگی ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار ایک پہاڑی راستے کو دیکھا۔

جس کا نام لوگوں نے الضیقہ (دشوار) رکھ دیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں اس کا نام تو الیسریٰ (آسان) ہے۔ گویا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی عسر میں یسر کو دریافت کرے۔ وہ دشوار گزار راستے کو آسان راستے کے روپ میں دیکھ سکے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی اس تعلیم کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ آپ ک وسخت ترین مشکلات پیش آئیں۔ مگر آپ نے حکیمانہ تدبیر سے ان کو اپنے حق میں آسان بنا لیا۔ آپ نے ڈس ایڈوانج کو ایڈوانج میں تبدیل کر دیا۔ ایک مستشرق مسٹر کیلیٹ نے آپ کی اس صفت کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے مشکلات کا سامنا اس عزم کے ساتھ کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں۔:

دنیا میں ایک طرف انسان ہے جو دوسرے انسان کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف خدا کا نظام ہے جس نے ہر مشکل کے ساتھ اس کا حل بھی رکھ دیا ہے۔ ایسی حالت میں انسانی مشکلات پر شور کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ آدمی نے انسان کے عمل کو دیکھا مگر وہ خدا کے عمل کو نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ اگر وہ خدا کے عمل کو دیکھتا تو شکایت کرنے کی بجائے وہ اس کو استعمال کرنے میں لگ جاتا۔

www.urdukitabain.blogspot.com

اس دنیا میں ہر ناکامی کے بعد ایک نئی کامیابی کا امکان آدمی کے لیے باقی رہتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ آدمی اس امکان کو استعمال کر کے دوبارہ اپنے آپ کو کامیاب بنا لے۔

الرسالہ (دسمبر ۱۹۸۸) میں کناڈا کے کھلاڑی بن جانسن کا قصہ چھپ چکا ہے۔ دوڑ کے عالمی مقابلہ میں اس نے اول درجہ کی کامیابی حاصل کی۔ مگر اگلے ہی دن اس کا جیتا ہوا گولڈ میڈل اس سے چھین لیا گیا۔ مزید اس کے بارے میں یہ سخت فیصلہ کیا گیا کہ وہ اگلے دو سال تک کھیل کے مقابلہ میں حصہ نہ لے سکے گا۔ بن جانسن کے لیے یہ اس کی زندگی کا شدید ترین حادثہ تھا۔ تاہم اس نے ظالم ججوں کے خلاف احتجاج میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اس نے ازسرنو اپنی تیاری کا منصوبہ بنایا۔

اٹلی کے ٹیلی وژن نیٹ ورق نے نومبر ۱۹۸۸ میں بن جانسن کا ایک باتصویر انٹرویو اس کی رہائش گاہ (ٹورانٹو) پر لیا۔ جس کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوئی۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۹ نومبر ۱۹۸۸) کے مطابق، ایک سو میٹر دوڑ کے عالمی چمپئن بن جانسن نے ٹیلی ویژن کیمرہ کے سامنے روتے ہوئے کہا، کہ انھوں نے جان بوجھ کر کھیل کے اصول کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ تاہم وہ اپنی تیاری جاری رکھے ہوئے ہے۔ اور وہ بارسلونہ (اسپین) میں ۱۹۹۲ میں ہونے والے اولمپک کھیلوں میں واپس آنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا ان کا عالمی ریکارڈ ٹریک پر ۱۳ سال کی مسلسل محنت کا نتیجہ تھا۔ بظاہر وہ بہت افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔ سیول اولمپک کے بعد پیش آنے والے مشکل لمحات کا ذکر کرتے ہوئے وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑے۔ انٹرویو لینے والے مسٹر گیانی منولی نے کہا کہ شوٹنگ کا کام پانچ منٹ تک روک دینا پڑا۔ کیونکہ بن جانسن اپنی سسکیوں پر قابو نہیں پا سکے تھے۔

بن جانسن نے بتایا کہ ٹریک پر واپس آنے کے لیے وہ ہفتہ میں چھ دن چار گھنٹے روزانہ

ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔انھوں نے کہا میرا کام صرف دوڑنا ہے۔بھیٹے رہنے کی بات میں سوچ بھی نہیں سکتا۔میری یہ خواہش ہے کہ میں دوبارہ مقابلہ میں حصہ لوں۔انھوں نے میرا سونے کا تمغہ مجھ سے لیا۔نہ کہ میری رفتار:

چھیننے والا ہمیشہ آپ کی کوئی چیز چھنتا ہے۔نہ کہ خود آپ کو۔آپ کا وجود پوری صلاحیتوں کے ساتھ پھر بھی آپ کو حاصل رہتا ہے۔اس حسل شدہ متاع کو استعمال کیجیے۔اور پھر ہر محرومی کے بعد آپ اپنی ایک نئی تاریخ بنا سکتے ہیں۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

مشتعل نہ کیجیے

ہندوستان میں سب سے زیادہ شیر گیر کے جنگل میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں ان کے لیے بہت بڑا کھلا پارک بنایا گیا ہے۔ جس کو Gir forest sanctuary کہا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہاں ۲۰ سے بھی کم تعداد میں شیر پائے جاتے تھے۔ مگر مئی ۱۹۹۰ کی گنتی کے مطابق اب وہاں ۲۸۰ شیر ہیں۔ ان شیروں کی وجہ سے انسانی زندگی کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست ۱۹۹۰) کی ایک رپورٹ کے مطابق پچھلے دو برسوں میں ان شیروں نے علاقہ کے ۱۱۶ آدمی مار ڈالے اور ۱۴۰ آدمیوں کو زخمی کیا۔

ان حادثات کے بعد مسٹر روی چیلم کی قیادت میں ایک ٹیم کو مقرر کیا گیا۔ تا کہ وہ صورت حال کے بارے میں تحقیق کرے۔ انھوں نے تحقیق کے بعد یہ بتایا ہے کہ شیروں نے اگرچہ بہت سے انسانوں کو نقصان پہنچایا ہے اور ان پر حملے کیے۔ مگر یہ حملے محض شیر کی درندگی کی بنا پر نہ تھے۔ ریسرچ کرنے والوں نے انسان کے اوپر شیر کے اکثر حملوں کا سبب اشتعال انگیزی کو قرار دیا ہے۔

شیر ایک خونخوار درندہ ہے۔ وہ انسان کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ مگر شیر اپنی ساری درندگی کے باوجود اپنی فطرت کے ماتحت رہتا ہے۔ اور اس کی فطرت یہ ہے کہ وہ اشتعال انگیزی کے بغیر کسی انسان کے اوپر حملہ نہ کرے۔

یہ قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ جو یہ بتاتی ہے۔ درندہ انسانوں کے ظلم سے کیسے بچا جائے۔ درندہ انسان کے ظلم سے بچنے کی واحد یقینی تدبیر یہ ہے کہ اس کو اس کی فطرت کی ماتحتی میں رہنے دیا جائے۔

اشتعال دلانے سے پہلے ہر انسان اپنی فطرت کے زیر حکم رہتا ہے۔ اور اشتعال دلانے کے بعد ہر آدمی اپنی فطرت کے حکم سے باہر آجاتا ہے۔ گویا فطرت خود ہر آدمی

کو ظلم وفساد سے روکے ہوئے ہے۔ایسی حالت میں آپ کو جوابی کارروائی کرنے کی کیا ضرورت۔

مشتعل ہونے سے پہلے شیر ایک بے ضرر حیوان ہے۔ مشتعل ہونے کے بعد شیر ایک آدم خور حیوان بن جاتا ہے۔آپ شیر کو مشتعل نہ کیجیے۔اور پھر آپ اس کے نقصان سے محفوظ رہیں گے۔

نرمی اور تحمل کوئی بزدلی کی بات نہیں۔یہ زندگی کا ایک اہم اصول ہے۔جو خود خالق قدرت نے تمام مخلوق کو سکھایا ہے۔

عربی کا ایک مثل ہے: التسامح رباح۔یعنی معاملات میں نرمی اور وسعت ظرف کا طریقہ ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔

یہ مثل انسانی تجربات سے بنی ہے۔انسان نے ہزاروں برس کے دوران دونوں قسم کا تجربہ کیا۔نرم رویہ کا بھی اور سخت رویہ کا بھی۔آخر کار تجربات سے ثابت ہوا کہ سخت رویہ الٹا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔اس کے مقابلہ میں نرم رویہ ایسا نتیجہ پیدا کرتا ہے جو آپ کے لیے مفید ہو۔

ریلوے اسٹیشن پر دو آدمی چل رہے تھے۔ایک آدمی آگے تھا دوسرا آدمی پیچھے۔پیچھے والے کے ہاتھ میں ایک بڑا بکس تھا۔تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس کا بکس اگلے آدمی کے پاؤں ٹکرایا۔وہ پلیٹ فارم پر گر پڑا۔

پیچھے والا آدمی فوراً ٹھہر گیا۔اور شرمندگی کے ساتھ بولا کہ مجھے معاف کیجیے آگے والے آدمی نے اس کو سنا تو وہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔اس نے کہا کوئی ہرج نہیں۔اور پھر دونوں اٹھ کر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی ناخوشگوار صورت پیش آئے تو دونوں بگڑ جائیں۔ایک کہے تم اندھے ہو دوسرا کہے کہ تم بدتمیز ہو،تم کو بولنا نہیں آتا۔وغیرہ۔اگر

دونوں اس قسم کی بولی بولنے لگیں تو بات بڑھے گی۔ یہاں تک کہ دونوں لڑ پڑیں گے۔ پہلے اگر ان کے جسم پر مٹی لگ گئی تھی تو اب ان کے جسم سے خون بہے گا۔ پہلے اگر ان کے کپڑے پھٹے تھے تو اب ان کی ہڈیاں توڑی جائیں گی۔

خواہ گھر کا معاملہ ہو یا گھر کے باہر کا معاملہ ہو۔ خواہ ایک قوم کے افراد کا جھگڑا ہو یا دو قوموں کے افراد کا جھگڑا۔ ہر جگہ نرم روی اور عالی ظرفی سے مسئلے ختم ہوتے ہیں۔ اور اس کے برعکس رویہ اختیار کرنے سے مسئلے اور بڑھ جاتے ہیں۔

نرم روی کا طریقہ گویا آگ پر پانی ڈالنا ہے اور شدت کا طریقہ گویا آگ پر پٹرول چھڑکنا ہے۔ پہلا طریقہ آگ کو بجھاتا ہے۔ اور دوسرا طریقہ آگ کو مزید بھڑکا دیتا ہے۔

دشمن میں دوست

ڈاکٹر سید عبد اللطیف (۱۸۹۱ـ۱۹۷۱) میں کرنول (دکن) میں پیدا ہوئے ۔وہ اپنے انگریزی ترجمہ قرآن اور دوسری خدمات کی وجہ سے کافی مشہور ہیں ۔وہ مقامی ہائی سکول میں اپنے والد کی اطلاع کے بغیر داخل ہو گیے تھے ۔والد کو انگریز اور انگریزی تعلیم سے سخت نفرت تھی ۔ان کو معلوم ہوا تو غصہ ہو گیے ۔اور درشت لہجے میں پوچھا کہ انگریزی پڑھ کر کیا کرے گا ۔دبلے پتلے، پست قامت لڑکے نے جواب دیا : انگریزی پڑھ کر قرآن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کروں گا ۔1915 میں انھوں نے بی ۔اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا ۔۱۹۲۰ میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے ۔۱۹۲۲ میں ان کے لیے نیا تعلیمی موقع پیدا ہوا ۔جب کہ جامعہ عثمانیہ کے چار استادوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجنا طے پایا ۔اور ان کے لیے ریاست کی طرف سے ۳۰ ہزار روپے کا بلا سودی قرضہ منظور کیا گیا ۔ان میں سے ایک سید عبد اللطیف بھی تھے ۔

لندن پہنچ کر وہ بی ۔اے (آنرز) میں داخلہ لینا چاہتے تھے ۔مگر کنگس کالج کے صدر شعبہ انگریزی، اور دوسرے انگریز اساتذہ آپ کی صلاحیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ کو بی ۔اور ایم اے سے مستثنیٰ کرتے ہوئے براہ راست پی ،ایچ ،ڈی کرنے کی اجازت دے دی ۔آپ کا مقالہ کا عنوان اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات طے پایا ۔مقالہ کی تیاری کی مدت تین سال مقرر کی گئی ۔مگر آپ نے دو سال میں پی ،ایچ ،ڈی کے مقالہ کی تکمیل کر لی ۔کنگس کالج کے ذمہ داروں نے اس کو منظور کرتے ہوئے آپ کو ڈاکٹریٹ کا مستحق قرار دیا ۔سید عبد اللطیف مقررہ مدت سے ایک سال پہلے ڈاکٹر ہو کر واپس آ گئے ۔یہاں آپ کو فوراً جامعہ عثمانیہ کا پروفیسر بنا دیا گیا ۔(انجمن از، حسن الدین احمد، آئی اے ،ایس ۔)

۱۹۲۲ میں انگریز کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا تھا۔مگر اسی دشمن نے مسلمان طالب علم کے ساتھ فیاضی کا وہ معاملہ کیا۔جس کی مثال مسلم اداروں میں بھی مشکل سے ملے گی۔حقیقت یہ ہے کہ دشمن انسان کے اندر بھی دوست انسان موجود ہوتا ہے۔مگر اس دوست انسان کو وہی لوگ پاتے ہیں۔جو دوستی اور دشمنی سے اوپر اٹھ کر انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنا جانتے ہوں۔

عام مزاج یہ ہے کہ لوگ اپنوں کو اپنا اور غیروں کو غیر سمجھتے ہیں۔مگر کھلے دل والے انسان کے لیے ہر کوئی اس کا اپنا ہے کوئی اس کا غیر نہیں۔

سوامی رام تیرتھ (۱۸۷۳۔۱۹۰۶) نہایت قابل آدمی تھے۔ان کا ایک بامعنی قول ہے۔زندگی کے سب دروازوں پر لکھا ہوا ہوتا ہے۔کھینچو۔مگر اکثر ہم اسے دھکا دینا شروع کر دیتے ہیں۔

سوامی رام تیرتھ، روانی کے ساتھ انگریزی بولتے تھے۔وہ دھرم کے پرچار کے لیے ۱۹۰۳ میں امریکہ گیے۔ان کا جہاز سان فرانسسکو کے سمندری ساحل پر لنگر انداز ہوا۔وہ اترے تو ایک امریکی از راہ تعارف ان کے قریب آیا۔اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی۔

آپ کا سامان کہاں ہے امریکی نے پوچھا۔

میرا سامان بس یہی ہے،سوامی رام تیرتھ نے جواب دیا،،،

اپنا روپیہ پیسہ آپ کہاں رکھتے ہیں،،،،،

میرے پاس روپیہ پیسہ ہے ہی نہیں۔،،،،،

پھر آپ کا کام کیسے چلتا ہے،،،،،،

میں سب سے پیار کرتا ہوں،بس اسی سے میرا کام چل جاتا ہے۔،،،،،

تو امریکہ میں آپ کا کوئی دوست ضرور ہوگا،،،،،

ہاں ایک دوست ہے اور وہ دوست یہ ہے""""

سوامی رام تیرتھ نے یہ کہا اور اپنے دونوں بازو امریکی شخص کے گلے میں ڈال دیے ۔امریکی ان کی اس بات سے بہت متاثر ہوا،اس کے بعد وہ امریکی ان کا اتنا گہرا دوست بن گیا کہ وہ انھیں اپنے گھر لے گیا،اور سوامی رام تیرتھ جب تک امریکہ میں رہے وہ برابر،ان کے ساتھ رہا۔اور ان کی خدمت کرتا رہا۔حتیٰ کہ وہ ان کا شاگرد بن گیا۔

اس دنیا میں محبت سب سے بڑی طاقت ہے۔محبت کے ذریعہ آپ اپنے مخالف کو جھکا سکتے ہیں۔اور ایک اجنبی شخص کو اپنا بنا سکتے ہیں۔بشرطیکہ آپ کی محبت سچی محبت ہو وہ دکھاوے اور نمائش کے لیے نہ ہو۔

ناکامی میں کامیابی

موہن سنگھ اوبرائے ۱۵ اگست ۱۹۰۰ کو جہلم کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ پشاور میں ٹھیکہ داری کا کام کرتے تھے۔ مگر مسٹر اوبرائے ابھی صرف چھ مہینے کے تھے کہ ان کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد مسٹر اوبرائے بے وسیلہ ہو کر رہ گئے۔ بڑی مشکلوں سے انھوں نے سرگودھا سے میٹرک کیا۔ اور لاہور سے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ مالی دشواری کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

مسٹر اوبرائے نے اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں جو ٹائمس آف انڈیا کے سنڈے ایڈیشن (۱۲ اگست ۱۹۹۰) میں چھپے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ انٹر میڈیٹ کے بعد جب میں نے دیکھا کہ اب میں مزید تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا تو یہ میری زندگی میں بری تشویش کا لمحہ تھا۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ موجودہ تعلیمی لیاقت کے ذریعہ میں کوئی سروس حاصل نہیں کر سکتا،،

سروس سے محرومی انہیں بزنس کے میدان میں لے گئی۔ یہ کاروباری جدوجہد کی ایک لمبی کہانی ہے۔ جس کو مذکورہ اخبار میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۲۴ میں وہ معمولی طور پر ایک ہوٹل کے کام میں شریک ہوئے۔ ۱۹۳۹ میں جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو وہ کلکتہ میں اپنا ایک ہوٹل شروع کر چکے تھے۔ ان کا کام بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ آج ایک ہوٹل ایمپائر کے مالک ہیں۔ ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں میں ان کے ہوٹل اوبرائے کے نام سے قائم ہیں۔ اس کے علاوہ سنگاپور سعودی عرب، سری لنکا، نیپال، خلیج مصر، اور افریقہ میں ان کے بڑے، بڑے ہوٹل کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

مسٹر اوبرائے کو سروس کے میدان میں جگہ نہ ملی تو انھوں نے بزنس کے میدان میں اس

سے زیادہ بڑی جگہ اپنے لیے حاصل کرلی۔یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔یہاں کامیاب وہ ہوتا ہے جو گرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کی صلاحیت کا ثبوت دے سکے۔اگر ایک میدان میں آپ کو مواقع نہ ملیں تو دوسرے میدان میں محنت شروع کر دیجیے۔عین ممکن ہے کہ آپ دوسرے میدان میں وہ سب کچھ پا لیں۔جس کی امید آپ پہلے میدان میں کیے ہوئے تھے۔ڈاکٹر سالم علی (۱۹۸۷۔۱۸۹۶)کو علم طیور میں غیر معمولی مقام ملا۔ہندوستان نے انہیں پدما بھوشن کا خطاب دیا۔برطانیہ نے انھیں گولڈ میڈل سے نوازا۔ہالینڈ نے انہیں گولڈ آرک عطا کیا۔عالمی ادارہ وائلڈ لائف نیان کو انعام کے طور پر ۵۰ ہزار ڈالر دیئے۔ہندوستان کی تینوں یونیورسٹیوں نے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔وہ راجیہ سبھا کے ممبر بنا دیئے گئے۔ڈاکٹر سالم علی کو یہ غیر معمولی کامیابی ایک غیر معمولی ناکامی کے ذریعہ ہوئی۔وہ بمبئی کے ایک گنجان علاقہ واڑی میں پیدا ہوئے۔بی،اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں روزگار کی ضرورت ہوئی۔مگر جب وہ روزگار کی تلاش میں نکلے تو ان کے الفاظ میں،،،،ہر ادارے اور ہر دفتر میں ان کے لیے جگہ نہیں کا بورڈ لگا ہوا تھا۔اس ناکامی نے ان کے لیے نئی کامیابی کے راستے کھول دیئے۔

ایک روز انھوں نے ایک چھوٹی چڑیا پکڑی،اس کو دیکھا تو اس میں غیر معمولی خصوصیت نظر آئی۔اس کی گردن پیلے رنگ کی تھی۔انھوں نے اس کی تحقیق شروع کر دی۔انھوں نے علم طیور پر بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ان کی دلچسپی بڑھتی گئی۔یہاں تک کہ انھوں نے ایک دستی دوربین حاصل کرلی۔اب ان کا کام یہ ہو گیا کہ ادھر ادھر جا کر چڑیوں کا مشاہدہ کریں۔اور ان کے حالات اپنی ڈائری میں لکھیں۔آخر کار انھوں نے علم طیور میں اتنی مہارت حاصل کرلی۔کہ خود اس فن کو نئی جہتوں اور وسعتوں سے آشنا کیا۔ان کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ایک کتاب میں

انھوں نے برصغیر ہند کی بارہ سو چڑیوں کے حالات لکھے۔ان کی دوسری کتاب طیور ہند ہے جو گیارہ بار چھپ چکی ہے۔اور عالمی سطح پر پڑھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سالم علی کو زمینی ادارہ میں جگہ نہیں ملی تھی تو انھوں نے آسمانی مشاہدہ میں اپنے لیے زیادہ بہتر کام تلاش کیا۔ان کو ملکی ملازمت میں نہیں لیا گیا تھا مگر اپنی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے وہ عالمی اعزاز کے مستحق قرار پائے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

فاصلہ پر رہو

سڑک پر بیک وقت بہت سی سواریاں دوڑتی ہیں۔آگے سے پیچھے دائیں سے بائیں۔اس لئے سڑک کے سفر کو محفوظ حالت میں رکھنے کے لیے بہت سے قاعدے بنائے گئے ہیں۔یہ سڑک کے قاعدے سڑک پر ہر جگہ لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔تا کہ سڑک سے گزرنے والے لوگ انہیں پڑھیں۔اور ان کی رہنمائی میں اپنا سفر طے کریں۔

دہلی کی ایک سڑک سے گزرتے ہوئے اسی قسم کا ایک قاعدہ بورڈ پر لکھا ہوا نظر سے گزرا۔اس کے الفاظ یہ تھے،،،فاصلہ برقرار رکھو:

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ ان دولفظوں میں نہایت دانائی کی بات کہی گئی ہے۔یہ ایک مکمل حکمت ہے۔اس کا تولق سڑک کے سفر سے بھی ہے اور زندگی کے عام سفر سے بھی۔

موجودہ دنیا میں کوئی آدمی اکیلا نہیں ہے۔ہر آدمی کو دوسرے بہت سے انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنا کام کرنا پڑتا ہے۔ہر آدمی کے سامنے اس کا ذاتی انٹرسٹ ہے۔ہر آدمی اپنے اندر ایک انا لیے ہوئے ہے۔ہر آدمی دوسرے کو پیچھے کر کے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔

یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ ہم زندگی کے سفر میں،،،فاصلہ پر رہو کے اصول کو ہمیشہ پکڑے رہیں۔ہم دوسروں سے اتنے فاصلے پر رہیں کہ اس سے ٹکراؤ کا خطرہ مول لیے بغیر ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔

اسی حکمت کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔اگر آپ اعراض کی اس حکمت کو ملحوظ نہ رکھیں تو کہیں آپ کا فائدہ دوسرے سے ٹکرا جائے گا۔کہیں آپ کا ایک سخت لفظ دوسرے کو مشتعل کرنے کا سبب بن جائے گا۔کہیں آپ کی بے احتیاطی غیر ضروری طور پر

دوسروں سے آپ کو الجھا دے گی۔

اس کے بعد وہی ہوگا جو سڑک پر ہوتا ہے۔یعنی حادثہ۔سڑک کا حادثہ آدمی کے سفر کو روک دیتا ہے۔بعض اوقات خود مسافر کا خاتمہ کر دیتا ہے۔اسی طرح زندگی میں مذکورہ اصول کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی ترقی کا سفر رک جائے گا۔یہ بھی ممکن ہے کہ آپ خود زندگی سے محروم ہو جائیں۔آپ تاریخ کے صفحہ سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں۔

ماضی اور حال میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔جب بھی کسی شخص نے اپنی مقررہ حد کو پار کیا۔وہ لازمی طور پر برے انجام کا شکار ہوا۔

نتیین والیا ایک تین سالہ بچہ ہے۔وہ اپنے والدین (وجے پال والیا اور سونیتا) کے ساتھ شاہدرہ میں رہتا ہے۔بچہ کو چڑیا گھر دیکھنے کا شوق تھا۔اس کے والدین اس کو دہلی کا چڑیا گھر دکھانے کے لیے لے گئے۔مختلف جانوروں کو دیکھتے ہوئے یہ لوگ وہاں پہنچے، جہاں سفید شیر کا پنجرہ ہے۔وہ شیر اور اس کے بچے کو دیکھنے کے لیے رکے۔یہاں نتیین ریلنگ کے اندر داخل ہو گیا۔اور پنجرہ میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔شیرنی (نیما) نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ اپنے منہ میں لے لیا۔لوگوں نے اس کو لکڑی سے مار کر ہٹایا۔مگر اس دوران وہ بچے کا ہاتھ کندھے تک چبا چکی تھی۔آپریشن کے بعد بچہ زندہ رہا۔مگر وہ ساری عمر کے لیے اپنے دائیں ہاتھ سے محروم ہو چکا تھا۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ مارچ ۱۹۸۸) کے رپورٹر کے مطابق، بچہ کے والدین اس حادثہ کی ذمہ داری چڑیا گھر کے کارکنوں پر ڈالی۔انھوں نے کہ اس وقت پنجرہ کے پاس کوئی چوکیدار موجود نہ تھا۔

اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو وہ اس کی ذمہ داری اپنے سے باہر دوسرے لوگوں پر ڈال دیتے ہیں۔مگر موجودہ دنیا میں اس قسم کی

کوشش سراسر بے فائدہ ہے۔یہاں حادثات سے صرف وہ شخص بچ سکتا ہے۔جو اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔جو شخص خود بے قابو ہو جائے وہ لازماً حادثہ سے دوچار ہوگا۔خواہ دوسروں کو ذمہ دار ٹھرانے کے لیے اس نے ڈکشنری کے تمام الفاظ دہرا ڈالے ہوں۔

چڑیا گھر میں خونخوار جانور کے کٹھرے سے چار فٹ کے فاصلہ پر ریلنگ لگی ہوئی ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ جانور کے مقابلہ میں آدمی کو ایک محفوظ فاصلہ پر رکھا جائے۔اسی طرح زندگی کے ہر موڑ پر ایک ریلنگ کھڑی ہوتی ہے۔جو شخص ریلنگ کو حد سمجھ کر وہاں ٹھہر جائے۔وہ محفوظ رہے گا۔اور جو شخص ریلنگ کو پار کر جائے۔وہ اپنے آپ کو حاڈچات سے نہیں بچا سکتا۔نہ چڑیا گھر کے اندر نہ چڑیا گھر کے باہر۔

مقابلہ کی اہمیت

جے آر ڈی ٹاٹا (J.r d.TaTa) ہندوستان کے چند انتہائی بڑے صنعت کاروں میں سے ہیں۔ بوقت تحریر ان عمر ۸۵ سال کی ہے۔ اب بھی وہ ہوائی جہاز چلاتے ہیں۔ اور برف پر اسکیٹنگ کرتے ہیں۔ اتنی بڑی عمر میں ان کی اس صحت کا راز کیا ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا۔

جو چیز مجھ کو برابر جوان رکھتی ہے، ان میں سے ایک یہ حقیقت ہے کہ میں خطرات میں جینے کے لیے تیار رہتا ہوں۔ بزنس، کھیل، شادی، ہر چیز میں رسک (ہندوستان ٹائمس آف انڈیا ۱۳ جولائی ۱۹۹۱)

انگریزی کا مثل ہے کہ رسک نہیں تو کامیابی بھی نہیں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ رسک اور خطرات کیوں آدمی کو کامیابی اور ترقی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسک آدمی کی قوتوں کو جگاتا ہے۔ وہ ایک معمولی انسان کو غیر معمولی انسان بنا دیتا ہے۔

آدمی اگر خطرات کا سامنا نہ کرے، وہ رسک کی صورتوں سے دور رہے تو وہ سست اور کاہل انسان بن جاتا ہے۔ اس کی فطری صلاحیتیں خوابیدگی کی حالت میں پڑی رہیں گی۔ وہ ایسا بیج ہوگا جو پھٹا نہیں کہ درخت بنے، وہ ایسا ذخیرہ آب ہوگا جس میں موجیں نہیں اٹھیں۔ جو طوفان کی صورت اختیار کرے۔

مگر جب آدمی کو خطرات پیش آتے ہیں۔ جب اس کی زندگی رسک کی حالت سے دو چار ہوتی ہے تو اس کی شخصیت کے اندر چھپی ہوئی فطری استعداد جاگ اٹھتی ہے۔ حالات کا دباؤ اس کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ متحرک ہو جائے۔ وہ اپنی ساری طاقت اپنے کام میں لگا دے۔

ہر آدمی کے اندر اتھاہ صلاحیتیں ہیں مگر یہ صلاحیتیں ابتدائی طور پر سوئی ہوئی ہوتی

ہیں۔وہ کبھی جگائے بغیر نہیں جاگتیں۔ان صلاحیتوں کو جگانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔وہ یہ کہ انھیں چیلنج سے سابقہ پڑے۔انھیں خطرات کا سامنا کرنا پڑے۔

عافیت کی زندگی بظاہر سکون کی زندگی ہے۔مگر عافیت کی زندگی کی یہ مہنگی قیمت دینی پڑتی ہے کہ آدمی کی شخصیت ادھوری رہ جائے۔وہ اپنی امکانی ترقی کے درجہ تک نہ پہنچ سکے۔

۶ جنوری ۱۹۹۰ کو اخبارات جو خبر لائے،ان میں سے ایک خبر یہ تھی کہ اظہر الدین کو اتفاق رائے سے قومی ٹیم کا کیپٹن مقرر کیا گیا ہے۔وہ نیوزی لینڈ جانے والے کرکٹ ٹیم کے کپتان ہونگے۔یہ بات کرکٹ حلقوں کے لیے انتہائی تعجب خیز تھی کیونکہ عام خیال تھا کہ یہ عہدہ سرکاری کانت کو دیا جائے گا۔جو شارجہ کپ،نہرو کپ،اور پاکستان کے دورہ جانے والی حالیہ ٹیم کے کپتان رہے ہیں۔۲۷ سالہ اظہر الدین کو ان کی مہارت کی وجہ سے وِنڈر بوائے کہا جاتا ہے۔اظہر الدین ہندوستانی کرکٹ کے دوسرے کم عمر کپتان ہیں۔ان سے قبل منصور علی پٹودی ۲۱ سال کی عمر میں قومی ٹیم کے کپتان بنائے گئے تھے۔

اظہر الدین کو جس چیز نے اس اعلی عہدے پر پہنچایا وہ ان کی یہ صلاحیت ہے کہ چیلنج پیش آنے پر وہ بے ہمت نہیں ہوتے بلکہ مزید طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔دسمبر ۱۹۸۹ میں دورہ پاکستان کے آغاز میں اظہر الدین کا ٹسٹ کیریر خطرے میں پڑ گیا،کیونکہ فیصل آباد ٹسٹ کی پہلی باری میں وہ کوئی خاص سکور نہ کر سکے تھے بلکہ صفر پر ہی آؤٹ ہو گئے تھے۔

لیکن دوسری باری میں شاندار سینچری بنا کر انھوں نے اپنا ٹسٹ کیریر تباہ ہونے سے بچا لیا۔

ٹائمس آف انڈیا (۶ جنوری ۱۹۹۰) کی رپورٹ کے مطابق سلیکشن کمیٹی کے چیرمین

مسٹر راج سنگ دونگر نے کہا کہ اظہر الدین کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ چیلنج کا مقابلہ کرنے کو محبوب سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ پاکستان کے پہلے دورہ میں دیکھا گیا، جہاں وہ پہلے ٹسٹ میں چنے نہ جانے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اور یہ قیادت کی نہایت اہم خصوصیت ہے۔

یہ دنیا چیلنج کی دنیا ہے۔ یہاں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ جو چیلنج کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ یہ صفت کسی آدمی کے اندر جتنی زیادہ ہوگی۔ اتنی ہی زیادہ کامیابی وہ اس دنیا میں حاصل کرے گا۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

ضمیر کی طاقت

ابوالبرکات علوی (۶۳ سال) نظام پور ضلع اعظم گڑھ (یو پی) کے رہنے والے ہیں۔ ۲۹ اگست ۱۹۲۹ کی ملاقات میں انھوں نے اپنے علاقے کا ایک واقعہ بتایا۔ جس میں بہت بڑا سبق ہے۔

اعظم گڈھ کے شمال مغرب میں ایک گاؤں ریدا ہے۔ جو مجھوئی ندی کے کنارے فیض آباد کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں چار گھر مسلمانوں کے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کے دوسو گھر آباد ہیں۔ نومبر ۱۹۸۷ میں

ایسا ہوا کہ باہر سے ایک نیل گائے آیا، اور گنے کے کھیت میں داخل ہو گیا۔

ایک مقامی مسلمان جھنو درزی نے چاہا کہ اس کا شکار کیا جائے، انھوں نے پڑوس کے گاؤں مخدوم پورہ میں ایک مسلمان کو اس کی خبر کی، جس کے پاس بندوق ہے۔ وہ اپنی بندوق لے کر آئے اور گائے پر فائر کیا۔

اگر نیل گائے موقع پر مر گیا ہوتا تو کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ مگر نشانہ صحیح نہ لگا۔ نیل گائے زخمی ہو گیا۔ اور خون بہاتا ہوا بھاگا۔ ہندوؤں نے جب جا بجا خون دیکھا تو مشتعل ہو گئے۔ ان کو معلوم ہوا کہ جھنو درزی نے مخبری کر کے نیل گائے پر گولی چلوائی ہے، تو انھوں نے گاؤں میں پنچایت کی اور جھنو کو بلا کر اس کو یہ سزا دی کہ تم نے جو قصور کیا ہے اس کے بدلے تم پر ہزار روپیہ جرمانہ کیا جاتا ہے۔

اس گاؤں میں کوئی سطحی لیڈر جھنو درزی کو بہکانے کے لیے موجود نہ تھا۔ اور نہ مسلمانوں کا وہاں زور تھا۔ جو جھنو درزی کو جھوٹے بھرم میں مبتلا کرے۔

چنانچہ فطرت نے جھنو درزی کی رہنمائی کی، وہ لوگوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور کہا مجھے پنچوں کا فیصلہ منظور ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس نقد روپیہ موجود نہیں۔ مگر میں اپنے گھر کا سامان بیچ کر اس کو ادا کر دوں گا۔

تین دن گزرے تھے کہ ہندوں کا ضمیر جاگ اٹھا۔انھوں نے دوبارہ اپنے لوگوں کی پنچایت بلائی اور آپس می کہا۔یہاں مسلمان بہت تھوڑے اور کمزور ہیں۔باہر کے لوگ جب سنیں گے تو ہم کو بہت گرا ہوا سمجھیں گے کہ ہم نے ان سے جرمانہ وصول کیا۔اور ہماری بے عزتی ہوگی۔کہ ہم نے مسلمانوں کو کمزور پا کر انھیں دبا لیا۔اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ جھنو درزی سے جرمانہ نہ لیا جائے۔چنانچہ اس متفقہ فیصلہ کے مطابق جھنو درزی کا جرمانہ معاف کر دیا گیا۔

ہر انسان کے اندر ضمیر ہے یہ ضمیر فریق ثانی کے اندر آپ کا نمائندہ ہے۔اس فطری نمائندہ کو استعمال کیجیے۔اور پھر آپ کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

سی،الیف،ڈول (C.F.Dole) نے کہا ہے کہ۔۔۔مہربانی کا برتاؤ دنیا میں سب سے بڑی عملی طاقت ہے۔

یہ محض ایک شخص کا قول نہیں،یہ ایک فطری حقیقت ہے۔انسان کے پیدا کرنے والے نے انسان کو جن خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا۔ان میں سے اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ کسی آدمی کے ساتھ برا سلوک کیا جائے تو وہ بپھر اٹھتا ہے۔اور اگر اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے تو وہ احسان مندی کے احساس کے تحت سلوک کرنے والے کے آگے بچھ جاتا ہے۔

اس عام فطری اصول میں کسی بھی شخص کا کوئی استثنا نہیں۔حتیٰ کہ دوست اور دشمن کا بھی نہیں،آپ اپنے ایک دوست سے کڑوا بول بول لئے۔اس کو بے عزت کیجیے۔اس کو تکلیف پہنچایئے۔آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد وہ فوراً ساری دوستی کو بھول گیا ہے۔اس کے اندر اچانک انتقامی جذبہ جاگ اٹھے گا۔وہ ہی شخص جو اس سے پہلے آپ کے اوپر پھول برسا رہا تھا،اب وہ آپ کے اوپر آگ اور کانٹے برسانے کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔

www.urdukitabain.blogspot.com

اس کے برعکس ایک شخص جس کو آپ اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔اس سے میٹھا بول بولیے۔اس کی کوئی ضرورت پوری کر دیجیے۔اس کے کسی مشکل کے وقت اس کے کام آجائیے۔حتیٰ کہ پیاس کو وقت اس کو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیجیے۔اچانک آپ دیکھیں گے کہ اس کا پورا مزاج بدل گیا ہے۔جو شخص اس سے پہلے آپ کا کھلا دشمن دکھائی دے رہا تھا۔وہ آپ کا دوست اور خیر خواہ بن جائے گا۔

خدا نے انسان کی فطرت میں یہ مزاج رکھ کر ہماری عظیم الشان مدد کی ہے۔اس فطرت نے نہتے انسان کو بھی تسخیری ہتھیار دے دیا ہے۔اس دنیا میں شیر اور بھیڑیے کو مارنے کے لیے گولی کی طاقت چاہیے۔مگر انسان کو زیر کرنے کے لیے کسی گولی کی ضرورت نہیں۔اس کے لیے حسن سلوک کی ایک پھوہار ہی کافی ہے۔کتنا آسان ہے انسان کو اپنے قابو میں لانا۔مگر نادان لوگ اس آسان ترین کام کو بھی مشکل ترین کام بنا لیتے ہیں۔

دماغی اضافہ

سر سی، وی، رمن (۱۸۸۸-۱۹۷۰) ہندوستان کے مشہور سائنس دان تھے۔ وہ ترو چر اپلی میں پیدا ہوئے۔ اور بنگلور میں ان کی وفات ہوئی۔ آخر وقت میں وہ رمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر تھے۔ اس کے علاوہ وہ بہت سے علمی عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۳۰ میں ان کو فزکس کا نوبل پرائز دیا گیا۔ رمن کے بارہ میں ایک معلوماتی مضمون سنڈے ریویو (۱۷ مارچ ۱۹۹۱) میں چھپا ہے اس کا اقتباس یہ ہے:

رمن کا یقین تھا کہ سائنس دماغ سے آتی ہے نہ کہ ساز و سامان سے۔ ان کے ایک شاگرد نے ایک بار شکایت کی، کہ اس کے پاس ریسرچ کا کام کرنے کے لیے صرف ایک کیلوواٹ کا لیمپ ہے۔ جب کہ بیرونی ملکوں میں اس کے برابر کے ایک طالب علم کے پاس ۱۰ کیلوواٹ کا لیمپ ہوتا ہے۔ رمن نے اس طالب علم کو جواب دیا۔ کہ تردد نہ کرو، تم اپنے مسئلہ کی تحقیق میں ۱۰ کیلوواٹ کا دماغ رکھ لو۔

یہ بات نہایت درست ہے۔ اس دنیا میں ہر کام کا تعلق دماغ سے ہے۔ سامان کی کمی کو دماغ سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ مگر دماغ کی کمی کو سامان سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔

دو سو اور تین سو سال پہلے مغرب میں جو سائنسدان پیدا ہوئے، ان میں سے کسی کے پاس وہ اعلیٰ سامان نہیں تھا، جو آج کسی یونیورسٹی میں ایک ریسرچ کے طالب علم کے پاس ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے کم سامان کے ساتھ کام کیا، مثلاً نیوٹن نے کروسین کے لیمپ کے ذریعہ کام کیا۔ کیونکہ اس وقت بجلی کا کام ہی شروع نہیں ہوا تھا وغیرہ۔ مگر یہی سائنسدان تھے، جنھوں نے جدید مغربی سائنس کی بنیادیں قائم کیں۔

اس اصول کا تعلق ہر انسان سے ہے۔ جب بھی کسی شخص کو محسوس ہو کہ اس کے پاس سرمایا یا وسائل یا ساز و سامان کی کمی ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنی محنت کو بڑھا لے۔ اس کی دماغی محنت اس کے لیے ہر دوسری کمی کی تلافی بن جائے گی۔

www.urdukitabain.blogspot.com

فطرت نے دماغ کی صورت میں انسان کو حیرت انگیز طاقت دی ہے۔دماغ کو استعمال کرکے آدمی اپنی ہر کمی کی تلافی کرسکتا ہے۔

مسٹر کامل علیگ (پیدائش ۱۹۵۸) نے یکم فروری ۱۹۸۹ کی ملاقات میں اپنا ایک واقعہ بتایا، وہ پہلے سگریٹ پیتے تھے۔۱۹۸۴ سے انھوں نے مکمل طور پر سگریٹ کو چھوڑ دیا ہے، ۱۹۷۶ سے ۱۹۸۱ تک وہ تعلیم کے سلسلہ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تھے۔اس زمانہ میں وہ چین سموکر تھے۔

ایک روز کا واقعہ ہے۔امتحان کا زمانہ قریب تھا۔وہ رات کو دیر تک پڑھنے میں لگے رہے یہاں تک کہ رات کو ایک بجے کا وقت ہوگیا۔اس وقت انھیں سگریٹ کی طلب ہوئی۔دیکھا تو دیا سلائی ختم ہو چکی تھی۔ہیٹر بھی بگڑا ہوا تھا،ایک طرف اندر سے سگریٹ کی سخت طلب اٹھ رہی تھی۔

دوسری طرف کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی۔جس سے سگریٹ کو جلایا جاسکے۔

تقریباً آدھ گھنٹہ تک ان کے دماغ پر یہ سوال چھایا رہا۔وہ اسی سوچ میں پڑے رہے کہ سگریٹ کو کس طرح جلایا جائے۔آخر ایک ترکیب ان کے ذہن میں آئی۔ان کے کمرہ میں بجلی کا سو واٹ کا بلب لٹک رہا تھا،انھوں نے سوچا کہ اس جلتے ہوئے بلب میں اگر کوئی ہلکی چیز لپیٹ دی جائے تو وہ کچھ دیر بعد گرم ہوکر جل اٹھے گی۔انھوں نے ایک پرانا کپڑا لیا اور جلتے ہوئے بلب کے گرد لپیٹ دیا۔تقریباً پانچ منٹ گزرے ہونگے کہ وہ کپڑا جل اٹھا،کمال صاحب نے فوراً اس سے اپنا سگریٹ سلگایا اور اس کے کش لینے لگے۔

اس کا نام دماغی محنت ہے۔عام لوگ محنت کے نام سے صرف جسمانی محنت کو جانتے ہیں۔مگر محنت کی زیادہ بڑی قسم وہ ہے۔جس کا نام دماغی محنت ہے۔دنیا کی تمام بڑی،بڑی ترقیاں وہی ہیں جو دماغی محنت سے حاصل کی گئی ہیں۔جسمانی محنت پھاوڑا

چلانے یا ہتھوڑا مارنے کا کام انجام دے سکتی ہے۔ مگر ایک سائنٹفک فارم یا جدید طرز کا ایک کارخانہ بنانے کا کام صرف دماغی محنت کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ جسمانی محنت اگر آپ کو ایک روپیہ فائدہ دے سکتی ہو تو آپ دماغی محنت کے ذریعہ ایک کروڑ روپیہ کما سکتے ہیں۔ جسمانی محنت صرف یہ کر سکتی ہے کہ وہ دوڑ کر بازار جائے اور ایک دیا سلائی خرید کر لائے۔ اور اس کے ذریعہ اپنا سگریٹ سلگائے مگر دماغی محنت ایسی حیرت انگیز طاقت ہے جو دیا سلائی کے بغیر آپ کے سگریٹ کو سلگا دے۔ جو ظاہری آگ کے بغیر آپ کے گھر کو روشن کر دے۔

تاریخ کا سبق

سر ٹامس رو (Sir Thomas Roe) سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں لندن سے ہندوستان آیا۔ اور یہاں تین سال (۱۶۱۸۔۱۶۱۵) تک رہا۔ اس نے مغل حکمران جہانگیر سے تعلق پیدا کیا۔ دوسری اعلیٰ صفات کے ساتھ اس کی ایک صفت یہ تھی کہ وہ ترکی زبان جانتا تھا۔

اور جہانگیر سے براہ راست گفتگو کرسکتا تھا۔

سر ٹامس رو (۱۶۴۴۔۱۵۸۱) جب ہندوستان آیا، اس وقت جہانگیر اجمیر میں تھا۔ ٹامس رو، اجمیر پہنچا اور تین سال تک یہاں رہا۔ جہانگیر کبھی کبھی اس کو اپنے دربار میں بلاتا۔ اور اس سے ادھر ادھر کی گفتگو کرتا۔ ٹامس رو، نے اندازہ کیا کہ جہانگیر کو فن مصوری سے بہت دل چسپی ہے۔ اس نے ایک روز جہانگیر کی خدمت میں ایک تصویر پیش کی۔ جہانگیر کو یہ تصویر بہت پسند آئی۔

ٹامس رو نے محسوس کیا کہ وہ جس وقت کا منتظر تھا وہ وقت اب اسکے لیے آگیا ہے۔ اس نے بادشاہ سے ایک ایسی چیز مانگی جو بظاہر بہت معمولی تھی۔ یہ چیز تھی ہندوستان کے ساحلی شہر سورت میں فیکٹری (تجارتی ادارہ) لگانے کی اجازت۔ بادشاہ نے ایک فرمان لکھ دیا۔ جس کے مطابق انگریز (ایسٹ انڈیا) کمپنی کو سورت میں اپنا تجارتی ادارہ قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔

ہندوستان کے ایک شہر میں تجارتی ادارہ کھولنے کی اجازت بظاہر بہت معمولی بات تھی۔ کیونکہ اس وقت ہندوستان کا وسیع ملک مغل حکمران ہی کے حصہ میں تھا، عظمت وشان اور قوت و طاقت کے تمام مظاہر پر دوسروں کا قبضہ بدستور باقی تھا۔ مگر سورت میں تجارتی ادارہ قائم کرنا انگریز کو وہ سرا دے رہا تھا۔ جو بالآخر اس کو تمام دوسری چیزوں پر قبضہ دلا دے۔ چنانچہ انگریزوں نے اس کم تر چیز کو قبول کرلیا۔ اور اس کے بعد تاریخ

نے بتایا کہ جو کم تر پر راضی ہو جائے وہ آخر کار برتر پر بھی قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

یہ تاریخ کا سبق ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس تاریخ سے سبق حاصل کریں۔

اس دنیا میں اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ کو معاملہ کا ابتدائی سرا مل جائے۔ابتدائی سرا جس کے ہاتھ میں آجائے وہ آخر کار انتہائی سرے تک پہنچ کر رہے گا۔

ہندوستان کی آزادی کی تحریک ۱۷۹۹ میں شروع ہوئی۔جب کہ سلطان ٹیپو جنگ کرتے ہوئے مارے گئے۔اس کے بعد انگریزوں سے لڑنا ،انگریز شخصیتوں پر بم مارنا،ان پر حملہ کرنے کے لیے بیرونی حکومتوں کو ابھارنا،جیسے ہنگامے سو سال سے زیادہ مدت تک جاری رہے۔

اس قسم کی تدبیریں اپنی نوعیت میں پر شور تھیں،چنانچہ ان کا نام آتے ہی انگریز فوراً چوکنا ہو جاتا تھا۔اور ان کو پوری طاقت سے کچل دیتا تھا۔اس کے بعد گاندھی سیاست میں آئے تو اچانک صورت حال بدل گئی۔پچھلے لوگ ہنسا کے ذریعہ آزادی کا مطالبہ کرتے تھے،گاندھی نے اس کے برعکس آہنسا کے طریقہ کو اختیار کیا۔انھوں نے آزادی کی تحریک کو ایسی بنیاد پر چلانے کا اعلان کیا۔جو انگریزوں کو نا قابل لحاظ دکھائی دے۔

گاندھی کے اس طریقہ کا ایک جزو،وہ ہے جس کو ڈانڈی مارچ کہا جاتا ہے۔گجرات کے ساحل پر قدیم زمانے سے نمک بنایا جاتا تھا۔انگریزی حکومت نے گجرات میں نمک بنانے کی صنعت کو سرکاری قبضہ میں لے لیا۔گاندھی اس قانون کی پر امن خلاف ورزی کے لیے سابر متی سے پیدل روانہ ہوئے۔اور ۲۴ دن میں ۲۴۰ میل کا سفر طے کر کے ڈانڈی کے ساحل پر پہنچے،اور نمک کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ میں لے کر سرکاری قانون

کی خلاف ورزی کی۔

گاندھی نے جب اپنے منصوبہ کا اعلان کیا۔ تو انگریز عہدیداروں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس موقع پر ایک انگریز افسر نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تھا، کہ ان کو اپنا نمک بنانے دو۔ مسٹر گاندھی کو چٹکی بھر نمک سے بہت زیادہ بڑی چیز درکار ہو گی۔ کہ وہ برطانوی شہنشاہیت کو زیر کر سکیں۔:

موجودہ دنیا میں کامیاب اقدام وہ ہے جو دیکھنے میں نا قابل لحاظ دکھائی دے۔ مگر حقیقتۂ وہ نا قابل تسخیر ہو۔ جو حریف کو بظاہر چٹکی بھر نمک نظر آئے، مگر انجام کو پہنچے تو وہ پہاڑ بھر نمک بن جائے۔

اتحاد کی طاقت

ٹائیکو براہے ۱۵۴۶ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۶۰۱ میں پراگ میں اس کی وفات ہوئی۔ جوہانس کپلر (Johannes Kepler) ۱۵۷۱ میں پیدا ہوا۔ اور رومبرگ میں ۱۶۳۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ دونوں فلکیات کے شعبے میں تحقیق کر رہے تھے۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی اس حیثیت میں نہیں تھا کہ وہ عالم افلاک میں کوئی بڑی حقیقت دریافت کر سکے۔

ٹائیکو براہے اور کپلر دونوں ہم عصر تھے۔ مگر ایک چیز دونوں کے لیے کسی بڑی فلکیاتی دریافت میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنے موضوع کے ہر گوشہ پر مہارت نہ رکھتا تھا، ٹائیکو براہے نے کثرت سے فلکیات کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ اپنے مشاہدات کو قلم بند کرتا رہتا تھا۔ فلکیاتی مشاہدات کے بارہ میں یہ تحریری ذخیرہ اس کے پاس کافی مقدار میں جمع ہو گیا تھا۔ مگر علم الافلاک کا دوسرا پہلو ریاضی سے تعلق رکھتا تھا۔ اور ٹائیکو براہے ریاضی میں کمزور تھا۔ اس بنا پر اس کو یہ قدرت حاصل نہ تھی کہ اپنے مشاہدات کو ریاضی کی کلیات میں مربوط کر سکے۔

دوسری طرف کپلر کا معاملہ یہ تھا کہ وہ فلکیاتی مشاہدہ میں کوئی مہارت نہ رکھتا تھا۔ وہ بہت کم مشاہدہ کرتا تھا۔ اس کے زمانہ میں اگرچہ دوربین دریافت ہو چکی تھی۔ مگر عملاً وہ دوربین سے کام نہ لے سکا تھا۔ اس کی خصوصیت صرف یہ تھی کہ وہ ریاضیات کا ماہر تھا، اور حسابی طور پر اس نے فلکیات کے بارہ میں بہت سے قیمتی نظریات وضع کیے تھے

یہاں ٹائیکو براہے کی فراخ دلی نے کام کیا، ٹائیکو براہے اور کپلر میں اگرچہ ذاتی اختلافات تھے۔ حتیٰ کہ کپلر نے ایک خط میں اس پر منافقت کا الزام لگایا تھا۔ اور اس کو بہت برا بھلا کہا تھا۔ مگر ٹائیکو براہے اپنی تیز مزاجی کے باوجود کپلر پر غصہ نہیں ہوا۔ آخر وقت میں اس نے سوچا کہ میرے علمی ذخیرے کا سب سے بہتر وارث کپلر ہی ہو سکتا

www.urdukitabain.blogspot.com

ہے۔چنانچہ اس نے کیپلر کی گستاخیوں کو بھلاتے ہوئے اس کو اپنے پاس بلایا۔اور ۱۶۰۱ میں اپنی موت سے پہلے اپنا پورا تحریری ذخیرہ بلا معاوضہ کیپلر کے حوالہ کر دیا۔

جب ٹائیکو براہے کے مشاہدات کا سارا سرمایہ کیپلر کے پاس آ گیا۔تو کیپلر کی کمی کی تلافی ہو گئی۔اب اس نے اپنے دماغ کی تمام ریاضیاتی قوت کو ان مشاہدات کے ساتھ مربوط کرنے میں لگا دیا۔اس کا نتیجہ ان تین کلیات کی صورت میں نکلا جو کیپلر کے سہ گانہ قوانین حرکت کے نام سے مشہور ہیں۔ان قوانین کو استعمال کرتے ہوئے بعد میں سر آئزک نیوٹن (۱۶۴۳۔۱۷۲۷) نے قوت کشش کے بارہ میں اپنی دریافت مکمل کی۔یہی موجودہ دنیا میں کسی بڑی کامیابی کا راز ہے۔ہر آدمی کی اپنی محدودیت ہوتی ہے۔اس بنا پر کوئی بھی شخص تنہا کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا

کوئی بڑا کام اس وقت انجام پاتا ہے۔جب کہ کئی لوگ اپنی صلاحیتوں اور اپنی کوششوں کو ایک رخ پر لگانے کے لیے راضی ہو جائیں۔متحدہ کوششوں کے بغیر اس دنیا میں کسی بڑے واقعہ کو ظہور میں لانا ممکن نہیں۔

مگر متحدہ کوشش کی ایک قیمت ہے۔اور وہ قیمت ہے۔۔اختلاف کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اتحاد کی بات پر ایک دوسرے سے جڑنا،اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ متحد ہو جانا،

انسان کے اندر اختلاف کا پایا جانا لازمی ہے۔اس دنیا میں اخلاص کے باوجود لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔اختلاف سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں۔ایسی حالت میں عملی بات صرف یہ ہے کہ لوگ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا حوصلہ پیدا کریں۔اجتماعی مفاد کے لیے انفرادی مفاد کو بھلا دیں۔بڑی چیز کی خاطر چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کر دیں۔مقصد کے تقاضے کے لیے اپنی ذات کے تقاضوں کو دفن کر دیں۔

اسی کا نام بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی ہے۔ اور اس بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی کے بغیر اس دنیا میں کسی بڑے منصوبہ کو تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں۔

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

فطری ڈھال

۱۹۷۳ میں ہندوستان کے جنگلوں میں تقریباً ۱۸۰۰ سو شیر تھے۔ اس کے بعد شیر کی نسل بڑھانے کے لیے شیر منصوبہ شروع کیا گیا۔ یہ منصوبہ کامیاب رہا۔ چنانچہ اب شیروں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے۔ تاہم شیر کی تعداد بڑھنے سے خطرہ بھی بڑھ گیا ہے۔ یو، پی کی ترائی میں دھوا نیشنل پارک ہے۔ اسی طرح ہندوستان اور بنگلہ دیش کے درمیان سندر بن ہے۔ یہاں شیر اکثر باہر آکر گاؤں والوں کے مویشی مار ڈالتے ہیں۔

تاہم ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کہ شیر انسان کے اوپر حملہ کرے۔ شیر اگر انسان کے اوپر حملہ بھی کرتا ہے تو پیچھے کی طرف سے کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ شیر انسان کے چہرے سے ڈرتا ہے۔ ایک رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۸) میں بتایا گیا کہ سندر بن کے جنگل میں جو لوگ ضرورت کے تحت شیر کے مخصوص علاقہ میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سر کے پیچھے مکھوٹا ڈال لیتے ہیں۔ تاکہ سامنے کی طرح ان کے پیچھے بھی انسانی چہرہ دکھائی دے۔ اس تدبیر کی وجہ یہ ہے کہ شیر بہت کم ایسا کرتا ہے۔ کہ وہ سامنے سے انسان کے اوپر حملہ کرے۔

انسان کے چہرے میں فطری طور پر رعب کی صفت ہے۔ یہ رعب جس طرح جانوروں کے مقابلے میں ایک روک ہے۔ اسی طرح وہ انسانوں کے مقابلہ کے لیے بھی ایک روک ہے۔ شیر انسانی چہرے سے مرعوب ہو کر اس پر حملہ کی جرات نہیں کرتا۔ شیر انسان کے اوپر صرف اس وقت حملہ کرتا ہے۔ جب کہ انسان نے اپنی ناکافی کاروائی سے شیر کے اوپر یہ ظاہر کر دیا ہو، کہ وہ اس کے مقابلے میں کمزور ہے۔ یہی معاملہ انسانوں کے مقابلہ میں انسان کا بھی ہے۔ فطری حالت میں ایک انسان دوسرے انسان کے چہرے سے ہیبت زدہ رہتا ہے۔ یہ ہیبت صرف اس وقت ختم ہوتی ہے

www.urdukitabain.blogspot.com

۔جب کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آئے، جو فطری حالت کو توڑنے کا سبب بن جائے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔(خلق اللہ آدم علی صورتہ) یہ روایت اگر چہ باعتبار سند کمزور ہے۔مگر باعتبار معنی وہ درست ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کا چہرہ ساری معلوم کائنات میں سب سے زیادہ پر شوکت چیز ہے۔وہ اپنے اندر ایک برتر عظمت لیے ہوئے ہے۔

خدا نے آپ کے چہرہ اور آپ کی شخصیت کو آپ کے لیے ایک غیر مفتوح ڈھال بنا دیا ہے۔آپ ہر ضرورت کے موقع پر اسے استعمال کر سکتے ہیں۔مگر اس معاملہ میں آپ کی کامیابی کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ نے دوسروں کی نظر میں اپنی کیا تصویر بنائی ہے۔اگر آپ نے اپنے ماحول میں یہ تصویر بنائی ہو کہ آپ ایک سطحی اور بے قیمت انسان ہیں۔آپ صرف جھوٹی لڑائی لڑنا جانتے ہیں۔آپ اقدام کا نعرہ لگاتے ہیں۔اور دھمکی سن کر اقدام ملتوی کر دیتے ہیں۔ایسی حالت میں جب آپ دوسروں کے سامنے آئیں گے تو آپ کا آنا ایک بے وزن انسان کا آنا ہوگا۔اس وقت آپ گویا ایک ٹوٹی ہوئی ڈھال ہونگے۔جس کے اندر لوگوں کے لیے کوئی زور نہیں۔

اس کے برعکس اگر آپ نے اپنے آس پاس یہ تصویر بنائی ہے کہ آپ ایک بھاری بھر کم انسان ہیں۔آپ کے اعلیٰ اخلاق نے لوگوں کو آپ کا معترف بنا رکھا ہو۔ایسی حالت میں آپ کے سامنے آتے ہی لوگوں کی نظریں آپ کے لیے جھک جائیں گی۔آپ کا آنا، وہ آیا، اس نے دیکھا، اس نے فتح کر لیا کا ہم معنی بن جائے گا۔

آپ کا انسانی چہرہ آپ کے حق میں ایک مرعوب کن ڈھال ہے۔کوئی انسان آپ کے اوپر صرف اس وقت وار کرنے کی ہمت کرتا ہے۔جب کہ آپ اپنی کسی نادانی سے اس پر یہ ظاہر کر دیں کہ آپ اس سے کمزور ہیں۔دانش مندی کے ذریعہ اپنے رعب انسانی

کو قائم رکھیے، اور پھر کوئی شخص آپ کے اوپر وار کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

مقصد کا شعور

جاپان نے ۱۹۳۱ میں چین کے شمال مشرقی حصہ (منچوریا) پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں اپنی پسند کی حکومت قائم کر دی۔ اس کے بعد چین اور جاپان کے تعلقات خراب ہو گئے۔ ۷ جولائی ۱۹۳۷ کو بیجنگ (پیکنگ) کے پاس مارکو پولو برج کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ نے دبے ہوئے جذبات کو بھڑکا دیا۔ اور دونوں ملکوں کے درمیان فوجی ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ جو بالآخر دوسری جنگ عظیم تک جا پہنچا۔

اس وقت سے چین اور جاپان کے درمیان کشیدگی پائی جاتی ہے۔ چند سال پہلے چین اور جاپان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس کے مطابق جاپان کو چین میں ایک سٹیل مل قائم کرنا تھی۔ مگر معاہدہ کی تکمیل کے بعد چینی حکومت نے اسے اچانک منسوخ کر دیا۔

چین کے نئے وزیر اعظم ڈینگ ژاؤپنگ (Deng xiaoping) نے حال میں اشتراکی انتہا پسندی کو ختم کیا۔ اور کھلے دروازہ کی پالیسی اختیار کی۔ تو جاپان کے لیے دوبارہ موقع مل گیا۔ چنانچہ آج کل جاپان نے چین میں زبردست یورش کر رکھی ہے۔ آپ اگر جاپان سے چین جانا چاہیں تو آپ کو ہوائی جہاز میں اپنی سیٹ تین ماہ پیشگی بک کرانا ہوگی۔ جاپان سے چین جانے والے جہاز کیا یک، ایک سیٹ بھری ہوئی ہو تی ہے۔

چین میں تجارت کے زبردست امکانات ہیں۔ جاپان چاہتا ہے کہ ان تجارتی امکانات کو بھرپور استعمال کرے۔ اس مقصد کے لیے جاپان نے یک لخت طور پر ماضی کی تلخیوں کو بھلا دیا ہے۔ ایک سیاح کے الفاظ میں جاپان نے طے کر لیا ہے کہ وہ چین کی طرف سے پیش آنے والی ہر ایذا رسانی کو یک طرفہ طور پر برداشت کرے گا۔

مذکورہ سیاح نے لکھا ہے کہ میرے قیام ٹوکیو (جون ۱۹۸۵) کے زمانہ میں

ریڈیو بیجنگ نے اعلان کیا کہ چین ایک میوزیم بنائے گا۔ جس میں تصویروں کے ذریعے یہ دکھایا جائے گا، کہ جاپانیوں نے چینیوں کے اوپر ماضی میں کیا، کیا مظالم کیے ہیں۔ اس میوزیم کا افتتاح ۱۹۸۷ میں ہوگا۔ جب کہ مارکوپولو کے حادثہ کو پچاس سال پورے ہو جائیں گے۔ جاپانیوں سے اس خبر پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے خاموشی اختیار کی۔ جب زیادہ زور دیا گیا تو انھوں نے جواب دیا۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ ہمارے چینی دوستوں کا مہمیز لگانے کا طریقہ ہے۔ وہ ہمارے ضمیر کو متوجہ کر رہے ہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۳ جون ۱۹۸۵)

جاپان کے سامنے ایک مقصد تھا، یعنی اپنی تجارت کو فروغ دینا۔ اس مقصد نے جاپان کے اندر کردار پیدا کیا۔ اس کے مقصد نے اس کو حکمت، برداشت، اعراض کرنا، اور صرف بقدر ضرورت بولنا سکھایا۔ اس کے مقصد نے اس کو بتایا کہ کس طرح وہ ماضی کو بھلا دے۔ اور تمام جھگڑوں اور شکایات کو یک طرفہ طور پر دفن کر دے۔ تاکہ اس کے لیے مقصد تک پہنچنے کی راہ ہموار ہو سکے۔

با مقصد گروہ کی نفسیات ہمیشہ یہی ہوتی ہے، خواہ اس کے سامنے تجارتی مقصد ہو یا کوئی دوسرا مقصد، اور جب کوئی گروہ یہ صفات کھو دیتو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس گروہ نے مقصدیت کھو دی۔ اس کے سامنے چونکہ کوئی مقصد نہیں۔ اس لیے اس کے افراد کا کوئی کردار بھی نہیں۔ موجودہ زمانہ میں ہماری قوم کی سب سے بڑی کمزوری اس کی بے کرداری ہے۔ جس میدان میں بھی تجربہ کیجیے، آپ فوراً دیکھیں گے کہ لوگوں نے اپنا کردار کھو دیا ہے۔ ان کے اوپر کسی ٹھوس منصوبہ کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ جہاں بھی انہیں استعمال کیا جائے۔ وہ دیوار کی کچی اینٹ ثابت ہوتے ہیں۔ وہ دیوار کی پختہ اینٹ ہونے کا ثبوت نہیں دیتے۔

اس کمزوری کی اصل وجہ یہ ہے کہ آج ہماری قوم نے شعور کھو دیا ہے۔ وہ ایک بے

مقصد گروہ ہو کر رہ گیے ہیں۔ان کے سامنے نہ دنیا کی تعمیر کا نشانہ ہے۔اور نہ آخرت کی تعمیر کا نشانہ۔یہی ان کی اصل کمزوری ہے۔اگر لوگوں میں دوبارہ مقصد کا شعور زندہ کر دیا جائے تو دوبارہ وہ ایک جاندار قوم نظر آئیں گے۔وہ دوبارہ ایک باکردار گروہ بن جائیں گے۔جس طرح وہ اس سے پہلے ایک باکردار گروہ بنے ہوئے تھے۔قوم کے افراد کے اندر مقصد کا شعور پیدا کرنا ان کے اندر سب کچھ پیدا کرنا ہے۔مقصد آدمی کی چھپی ہوئی قوتوں کو جگا دیتا ہے۔وہ اس کو نیا انسان بنا دیتا ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

غلط فہمی

گرم علاقوں میں ایک خاص قسم کا پتنگا پایا جاتا ہے جس کو عبادت گزار مینٹس کہا جاتا ہے۔زیادہ صحیح طور پر اس کا نام شکاری مینٹس ہونا چاہیے

کیونکہ وہ کیڑے مکوڑوں کا شکار کر کے ان سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔

مینٹس کی دنیا بھر میں ایک ہزار قسمیں دریافت کی گئی ہیں۔وہ ایک انچ سے سات انچ تک لمبا ہوتا ہے۔اپنے ماحول کے اعتبار سے اس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔مثلاً بھورا،لال اور ہرا۔

ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے گھر کے پاس کھلی زمین میں اپنا کچن گارڈن بنایا ،چھوٹی ،چھوٹی کیاریوں میں دھنیا ،مرچ ،بینگن، ٹماٹر وغیرہ کی کاشت کی۔جب پودے بڑھے اور خوب سرسبز ہو گئے تو ایک روز اس نے دیکھا کہ اس کی کیاری کے اندر بڑے ،بڑے دو ہرے رنگ کے کیڑے موجود ہیں۔اس کو اندیشہ ہوا کہ یہ میری سبزیوں کو کھائیں گے۔اور ان کو نقصان پہنچائیں گے۔اس نے فوراً دونوں کیڑوں کو پکڑا،اور انھیں مار ڈالا۔

شام کو اس کا ایک دوست اس سے ملنے آیا۔وہ مقامی کالج میں علم نباتات کا استاد تھا۔اس نے اپنے دوست سے فاتحانہ انداز میں کہا کہ آج میرے کچن گارڈن میں دو بڑے ،بڑے کیڑے آگئے۔وہ میری سبزیوں کو کھانا چاہتے تھے۔مگر اس سے پہلے کہ وہ میری سبزیوں کو نقصان پہنچائیں میں نے انہیں مار کر ختم کر دیا۔

اس واقعہ کو اس نے کچھ اس انداز سے بیان کیا۔کہ دوست کو خیال آیا،کہ وہ نئے کیڑے کون سے ہیں۔اس نے پوچھا کہ وہ مرے ہوئے کیڑے کیا اب بھی موجود ہیں۔کہ میں انہیں دیکھوں،اس کے بعد آدمی نے اپنے دوست کو دونوں کیڑے دکھائے۔دوست نے کہا تم نے تو بڑی نادانی کی۔تم جانتے نہیں یہ تو مینٹس ہیں۔اور

مینٹس سبزی خور کیڑا نہیں۔ وہ تو مسلمہ طور پر ایک گوشت خور کیڑا ہے۔ وہ یہاں قدرت کی طرف سے تمہاری مدد کے لیے آیا تھا۔ اس کی فطرت کے خلاف تھا کہ وہ کسی سبزی کو کھائے۔ وہ تمہاری سبزیوں کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچاتا، وہ صرف ان کیڑوں کو کھاتا جو سبزیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور جن کو ختم کرنا تمہارے لیے سخت مشکل ہے۔ تم بھی کیسے نادان نکلے کہ اپنے فائدے اور نقصان کو نہ سمجھ سکے۔ تم نے اپنے ایک قیمتی چوکیدار کو مار ڈالا۔

دوست کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی اس آدمی کی زبان بند ہو گئی۔ اس کو اپنے کیے پر بے حد افسوس ہوا۔ یہاں تک کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ اور کئی دن تک کام کرنے کے قابل نہ رہا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلط فہمی کسی آدمی کو کتنی بڑی کوتاہیوں میں مبتلا کر سکتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص غلط فہمی میں مبتلا ہو کر دوسرے شخص کو جان سے مار ڈالے۔ حالانکہ یہ دوسرا شخص بالکل بے قصور ہو۔ وہ ایک آدمی کو بے عزت کرنے پر تل جائے، حالاں کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایسا آدمی ہو کہ اس کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آیا جائے۔

اس لیے شریعت میں یہ حکم ہے کہ رائے قائم کرنے یا کسی کے خلاف اقدام کرنے سے پہلے اس کے معاملہ کی پوری تحقیق کرو۔ ایسا ہرگز مت کرو کہ کسی کے خلاف ایک خبر سنو، اور فوراً اس کو مان لو۔ اور اس کے خلاف کوئی برا، اقدام کر بیٹھو عین ممکن ہے کہ تحقیق کے بعد تم کو معلوم ہو کہ جو خبر تم کو پہنچی وہ سراسر غلط اور بے بنیاد تھی۔

اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس ایک خبر لائے تو اس خبر کی پہلے اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا بیٹھو، اور پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے (الحجرات۔ ۶)

غلط خبر کو سن کر اس کے انجام سے بچنے کی تدبیر نہایت آسان ہے۔ وہ یہ کہ کسی بات کو سننے کے بعد اس وقت تک نہ مانا جائے جب تک براہ راست ذرائع سے اس کی تحقیق نہ کر لی جائے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

نفع بخشی کی طاقت

ہندوستان ٹائمس آف انڈیا (۲۰ جولائی ۱۹۹۰) کے نمائندہ مقیم ماسکو مسٹر بھابنی سین گپتا نے سویت یونین کے بارہ میں ایک رپورٹ شائع کی ہے ۔اس کا عنوان ہے ۔۔۔ایک نیا روس ابھر رہا ہے۔:

اس رپورٹ میں سوویتروس میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ آخر میں لکھتے ہیں ۔کہ بین الاقوامی معاملات کے ایک ممتاز روسی ماہر نے ماسکو میں مجھے بتایا کہ سوویت روس کا پہلا محبوب امریکہ نہیں ہوسکتا۔

اس کا پہلا محبوب متحدہ یورپ ہوگا،اور پھر جاپان ،اس کے بعد امریکہ اور چین ۔میں نے تعجب سے پوچھا،اور انڈیا کے بارےمیں آپ کا کیا خیال ہے ۔روسی عالم نے پر اطمینان لہجہ میں جواب دیا۔کہ انڈا کا معاملہ ایک مخصوص معاملہ ہے ۔انڈیا ہمارا پہلا ،دوسرا،یا تیسرا محبوب نہیں ۔انڈیا ہمارا دائمی محبوب ہے ۔

پچھلے چالیس سال سے ہماری خلومت ہم کو یقین دلا رہی ہے ۔کہ سویت روس ہمارا سب سے بڑا دوست ہے ۔مگر روسی عالم کا مذکورہ جواب بتاتا ہے،کہ اب سویت روس نے انڈیا کو رسمی تعلق کے خانہ میں ڈال دیا ہے ۔اس فرق کی وجہ بالکل سادہ ہے ۔پہلے روس کو ہماری ضرورت تھی ۔اب روس کو ہماری ضرورت نہیں رہی ۔سرد جنگ کی سیاست میں روس ہم کو امریکہ کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔اب روس اور امریکہ میں صلح ہوجانے کے بعد یہ حریفانہ سیاست مرگئی ۔اس لئے روس کی نظر میں ہماری اہمیت بھی ختم ہوگئی ۔اب روس کے لیے اہمیت صرف ان ملکوں کی ہے ۔جو جدید اقتصادی نظام میں اس کے مددگار بن سکیں ۔اور یہاں یورپ اور جاپان اسکے لیے مددگار ہیں نہ کہ انڈیا۔

کسی قوم یا فرد کی اہمیت کا راز یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں کی ضرورت بنادے

۔اس کے سوا ہر بنیاد فرضی ہے۔جو ہوا کے پہلے ہی جھونکے سے زمین بوس ہو جاتی ہے۔

ہندوستان ٹائمس (۲۸ دسمبر ۱۹۹۰) نے ایک ہندوستانی مقیم واشنگٹن مسٹر این، سی، من کی رپورٹ چھاپی ہے اس میں وہ لکھتے ہیں۔کہ عام طور پر لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں ہے، کہ جب روسی صدر میخائل گورباچوف نے راجیو گاندھی کی حکومت کے زمانہ میں انڈیا کا دورہ کیا۔اس وقت سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی نے انڈیا، چین، سویت یونین کے درمیان قریبی تعاون کی تجویز پیش کی تھی۔تا کہ امریکی دیو، اور شائد یورپ کے ابھرتے ہوئے اتحاد کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوستانہ دھڑا قائم کیا سکے، صدر گورباچوف نے بے رحمانہ صاف گوئیکے ساتھ اس کا جواب دیتے ہوئے کہا۔کہ اس وقت ہمیں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ نئی ٹکنالوجی ہے۔اور نئی ٹیکنالوجی ہمیں نہ چین دے سکتا ہے اور نہ انڈیا۔

پچھلے چالیس سال سیروں نے سرمایا دار مغرب کو اپنا دشمن سمجھ رکھا تھا۔اور سوشلسٹ انڈیا کو اپنا دوست بنائے ہوئے تھا مگر لمبے تجربہ کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ انڈیا سے اس کو کوئی فائدہ نہیں۔جب کہ سرمایہ دار مغرب اس کی ترقی میں نہایت اہم مددگار بن سکتا ہے۔اس نے انڈیا کو چھوڑ دیا اور اختلاف اور شکایت کو نظر انداز کرتے ہوئے سرمایہ دار مغرب سے دوستی کر لی۔

سرمایہ دار ملک نے اپنی نفع بخشی کی صلاحیت کے ذریعہ اپنے سب سے بڑے دشمن کو جیت لیا۔اور سوشلسٹ انڈیا کی غیر نفع بخشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو اپنے سب سے بڑے دوست سے محروم ہو جانا پڑا۔

یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا اصل راز ہے۔اس دنیا میں کامیابی نفع بخشیکی بنیاد پر ملتی ہے۔نہ کہ الفاظ کا گنبد کھڑا کرنے پر۔

یقینی حل

الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۶ کو پڑھ کر ایک صاحب نے طویل خط (۷ اکتوبر ۱۹۸۶) لکھا ہے۔اس کا ایک حصہ یہ ہے: آپ کا سفر نہ صرف معلوماتی ہے۔ بلکہ انداز بیان کے لحاظ سے بھی منفرد ہے۔اس بار بھی بمبئی کا سفرنامہ ایسا ہی ہے، اس سفر میں ہیرا لال ڈرائیور سے آپ کی ملاقات، اور ایکسیڈنٹ سے بچے رہنے کی تدبیر کے بارہ میں پوچھے گئے آپ کے سوال، کا جواب پڑھنے کو ملا۔ اور مجھے اس سے ملتا جلتا ایک قصہ یاد آ گیا ۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی پچپن سالہ زندگی میں ایک بھی ایکسڈنٹ نہیں کیا۔ ایک بار وہ محفوظ ڈرائیونگ پر لیکچر دیتے ہوئے بولا۔ مجھے یہ بتانے میں ایک منٹ کا وقت بھی نہیں لگے گا۔ کہ محفوظ ڈرائیونگ کس طرح کی جاتی ہے ۔اس کا طریقہ بہت آسان ہے۔ ڈرائیونگ کے وقت بس یہ بات ذہن میں رکھیے کہ آپ کے سوا دنیا کا ہر ڈرائیور پاگل ہے۔ (محی الدین محمد۔ حیدر آباد)

پاگل اس شخص کا نام ہے جو مرفوع القلم ہو۔ جس سے کسی قسم کی توقع نہ کی جا سکے۔ اور جہاں فریق ثانی کی طرف سے کوئی توقع نہ ہو۔ وہاں دو طرفہ بنیاد پر سوچنا بالکل بے معنی ہے۔ ایسے مواقع پر آدمی ہمیشہ یک طرفہ سوچتا ہے۔ اور یک طرفہ طور پر مسئلہ کا حل تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ ہر آدمی جانتا ہے کہ پاگل سے لڑنا نہیں ہے۔ بلکہ پاگل سے بچنا ہے۔ پاگل کے مسئلہ کا حل اس سے اعراض کرنا ہے۔ نہ کہ اس سے ٹکراؤ کرنا ۔جو ڈرائیور دوسرے کو پاگل سمجھ لے، وہ دوسروں کی شکایت نہیں کرے گا۔ وہ ساری توجہ خود اپنی طرف لگا دے گا۔ وہ کہیں اپنی گاڑی کو روک لے گا، کہیں وہ پیچھے ہٹ جائے گا، اور کنارے کی طرف سے اپنا راستہ نکالے گا۔ سڑک کا جو مسافر اس طرح یک طرفہ طور پر ذمہ داری اپنے اوپر ڈال لے ۔ وہ کبھی سڑک کے حادثہ سے دوچار

نہیں ہوسکتا۔

مذکورہ ڈرائیور نیا یک لفظ میں زندگی کا راز بتا دیا ہے۔اس کی مراد دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ۔آپ دوسروں سے کچھ امید نہ رکھیے۔ساری ذمہ داری یک طرفہ طور پر خود قبول کیجیے۔اوراس کے بعد آپ یقینی طور پر ایکسڈنٹ سے دوچار نہیں ہونگے۔

ڈرائیور نے جو بات سڑک پر حادثات سے بچنے کے بارہ میں کہی۔وہی وسیع تر زندگی میں حادثات سے بچنے کے بارے میں بھی درست ہے۔آپ اپنی زندگی میں یقینی طور پر سماجی حادثات سے بچ سکتے ہیں۔شرط یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو یک طرفہ طور پر اس کا ذمہ دار بنالیں۔یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں مسائل کا سب سے زیادہ یقینی حل وہ ہی ہے۔جس پر مذکورہ ڈرائیور نے عمل کیا۔اوراپنی ڈرائیونگ کی طویل زندگی میں حادثات سے محفوظ رہا۔

خالص طبی معنوں میں پاگل انسانوں کی تعداد ساری دنیا میں بمشکل ایک فیصد ہوگی مگر دوسرے اعتبار سے دنیا کے ۹۹ فی صد انسان امکانی طور پر پاگل ہیں۔عام حالات میں بظاہر لوگ بالکل ٹھیک نظر آتے ہیں۔مگر جب آدمی کے ذاتی مفاد کا معاملہ آجائے،جب اس کا انا کو ٹھیس لگے،جب فریق ثانی کی کسی بات پر اس کے اندر غصہ بھڑک اٹھے۔جب اس کا سابقہ کسی ایسے انسان سے پڑے،جس سے اس کی ان بن ہوگی ہو۔تو اس وقت شریف آدمی بھی غیر شریف بن جاتا ہے۔صحیح دماغ کا انسان بھی پاگل پن پر اتر آتا ہے۔

ایک بار حیدرآباد سے محبوب نگر جاتے ہوئے خود میرے ساتھ ایک سبق آموز واقعہ پیش آیا،ہماری گاڑی سڑک پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔کہ اچانک ایک بیل سڑک پر آگیا۔جو صاحب کار کو چلا رہے تھے انھوں نے یہ نہیں کیا کہ بیل کے خلاف احتجاج کریں یا بدستور اپنی گاڑی دوڑاتے رہیں۔انھوں نے فوراً بریک لگا کر گاڑی کو

روکا۔ اور ایک لمحہ رک کر اندازہ کیا کہ بیل کدھر جا رہا ہے۔ بیل نے جب سڑک کے آدھے سے زیادہ حصے کو پار کر لیا، اور یہ واضح ہو گیا کہ وہ مشرق کی طرف جا رہا ہے۔ تو انھوں نے اپنی گاڑی مغرب کی طرف گھمائی۔ اور بیل کے کنارے کی طرف سے راستہ نکال کر آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔

زندگی کے مسائل ہمیشہ یک طرفہ کارروائی کے ذریعہ حل ہوتے ہیں۔ جو لوگ دو طرفہ بنیاد پر مسئلہ حل کرنا چاہیں، موجودہ دنیا میں ان کے لیے اس کے سوا کچھ اور کوئی مقدر نہیں کہ وہ بے فائدہ احتجاج کرتے رہیں۔ اور اسی حال میں دنیا سے چلے جائیں۔

www.urdukitabain.blogspot.com

فتح بغیر جنگ

مسٹر رچرڈ نکسن ۱۹۶۸ سے ۱۹۷۴ تک امریکہ کے پریزیڈنٹ تھے۔انھوں نے اپنی یاداشتوں پر مشتمل ایک کتاب شائع کی،جس کا نام ہے ۱۹۹۹،جنگ کے بغیر فتح:

امریکنوں نے ۱۹۴۵ میں جاپان کے بڑے حصے کو تباہ کردیا۔پھر دوسری عالمی جنگ کے بعد انھوں نے زبردست اقتصادی امداد کے ذریعہ جاپان کی دوبارہ تعمیر کی۔جاپان کے ساتھ یہ معاملہ انھوں نے اپنے ذاتی مقصد کے لیے،ایک نمونہ کے ملک کے طور پر کیا۔اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس اشتراکی نظریہ کو غلط ثابت کرسکیں۔کہ غریبی کو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ختم نہیں کیا جاسکتا۔

چنانچہ جاپان میں قدیم بادشاہت کی جگہ جمہوریت لائی گئی۔امریکنوں نے خود وہاں کا دستور لکھ کر تیار کیا۔اس کا دفاع مکمل طور پر واشنگٹن کے تحت کردیا گیا۔

اس تجربہ کے بعد تلخ اقتصادی اختلافات کے بادل امریکہ اور جاپان کے تعلقات پر چھا گئے۔دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی توازن ہولناک حد تک بگڑ گیا۔۱۹۸۶ میں امریکہ نے جتنا سامان جاپان کے ہاتھ بیچا،اس کے مقابلہ میں جاپان نے ساٹھ بلین ڈالر کے بقدر زیادہ سامان امریکہ کے ہاتھ فروخت کیا۔واضح ہو کہ اس سال امریکہ کا کل تجارتی خسارہ ۱۷۰ بلین ڈالر تھا۔جاپان اس پوزیشن میں ہو چکا ہے کہ اس نے امریکی چاول کی خریداری کے لیے ۱۸۰ ڈالر فی ٹن کی پیش کش کو رد کردیا۔

جب کہ اسے اپنے ملک میں چاول پیدا کرنے کے لیے ۲۰۰۰ ہزار ڈالر فی ٹن خرچ کرنا پڑتا ہے۔اب امریکہ کو یہ شکایت ہے کہ جاپانیوں نے امریکی سامان کے لیے اپنی مارکیٹ کو بند کردیا ہے۔(ٹائمس آف انڈیا ۱۲،اپریل ۱۹۸۹)

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کی حیثیت فاتح اور غالب کی تھی۔اور جاپان کی حیثیت مفتوح اور مغلوب کی،مگر فاتح نے جو اقدامات اپنے مفاد کے لیے کیے،اس کو

www.urdukitabain.blogspot.com

مفتوح نے اپنے مفاد میں تبدیل کر لیا، یہی موجودہ دنیا کا امتحان ہے۔ اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ جو دشمن کے مخالفانہ منصوبوں میں اپنے لیے موافق پہلو تلاش کریں۔ جو دشمن کی تدبیروں کو زینہ بنا کر آگے بڑھ جائیں۔

اس دنیا میں شکست بھی فتح کا دروازہ کھولتی ہے۔ یہاں جنگ کے بغیر بھی کامیاب مقابلہ کیا جا سکتا ہے، مگر یہ سب کچھ دانش مندوں کے لیے ہے۔

نادانوں کے لیے خدا کی اس دنیا میں کوئی بھی حقیقی کامیابی مقدر نہیں۔ ان کے لیے فتح بھی شکست ہے اور شکست بھی شکست۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

سلیقہ مندی

کمانا مشکل ہے مگر خرچ کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے، جو شخص صحیح طور پر خرچ کرنا جانے، وہ کم آمدنی میں بھی زیادہ آمدنی والی زندگی گزار سکتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی صحیح طور پر خرچ کرنا نہ جانے، وہ زیادہ آمدنی میں بھی کم آمدنی والے مسائل میں مبتلا رہے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص سلیقہ اور کفایت سے خرچ کرنا جانے، اس کو گویا اپنی آمدنی کو بڑھانے کا ہنر آگیا، اس نے اپنی آمدنی میں بغیر مزید کمائی اضافہ کر لیا۔ خرچ کرنے سے پہلے سوچیے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آپ کمانے سے پہلے سوچتے ہیں۔ جو کچھ کیجیے منصوبہ بند انداز میں کیجیے۔ اور پھر آپ کبھی معاشی پریشانی میں مبتلا نہ ہونگے۔

فضول خرچی کا دوسرا نام معاشی تنگی ہے۔ اور کفایت شعاری کا دوسرا نام معاشی فارغ البالی، اس حقیقت کی وضاحت کے لیے یہاں دو واقعے نقل کیا جاتا ہے۔

مجھے ایک صاحب کا واقعہ معلوم ہوا ہے انھوں نے ایم، ایس، سی کیا۔ اس کے بعد ان کو چار سو روپیہ ماہوار کی نوکری ملی، انھوں نے طے کیا کہ اس رقم میں سے میں صرف دو سو روپیہ کو اپنی آمدنی سمجھوں گا۔ اور بقیہ دو سو کا پنے سیونگ اکاونٹ میں جمع کروں گا۔ ان کی تنخواہ بڑھتی رہی۔۔ ایک ہزار، دو ہزار، تین ہزار، ۴ ہزار، ۵ ہزار۔ مگر انھوں نے ہمیشہ کل تنخواہ کے نصف کو اپنی آمدنی سمجھا۔ اور بقیہ نصف کو ہر ماہ بینک میں جمع کرتے رہے۔

اس طرح کی دس سالہ زندگی گزارنے کے بعد انھوں نے اپنا اکاونٹ دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کے اکاونٹ میں ایک بڑی رقم جمع ہو چکی ہے۔ اب انھوں نے سروس چھوڑ کر بزنس شروع کر دیا۔ آج وہ اپنے بزنس میں کافی ترقی کر چکے ہیں۔ مگر زندگی کا

www.urdukitabain.blogspot.com

جو طریقہ ابتدا میں انھوں نے قائم کیا تھا اس پر وہ آج بھی قائم ہیں۔ وہ نہایت کامیابی کے ساتھ ایک خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔

اب اس کے برعکس مثال لیجیے، ایک صاحب کو وراثتی تقسیم میں یک مشت ایک لاکھ روپیہ ملا، انھوں نے اس کے ذریعہ سے کپڑے کی دکان کھولی، دکان بہت جلد کامیابی کے ساتھ چلنے لگی۔ مگر چند سال کے بعد ان کی دکان ختم ہوگئی۔

اس کی وجہ یہ تھی، کہ انھوں نے آمدنی اور لاگت کے فرق کو نہیں سمجھا۔ مثلاً ان کی دکان پر اگر پانچ ہزار روپیہ کا کپڑا بکے تو اس میں چار ہزار روپیہ لاگت کا ہوتا تھا۔ اور ۵۰۰ روپیہ آمدنی کا مگر وہ دکان میں آئی ہوئی رقم کو اس طرح خرچ کرنے لگے جیسے کہ ۵ ہزار کی پوری رقم آمدنی کی رقم ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ فضول خرچی کی بدترین شکل تھی۔ چنانچہ چند سال میں وہ دیوالیہ ہو کر ختم ہو گئے۔

اس دنیا میں سلیقہ مند زندگی کا نام خوشحالی ہے۔ اور بد سلیقہ زندگی کا نام بدحالی ہے۔

امید کا پیغام

قرآن میں بعض انسانی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔کہ اس طرح کی ناموافق صورت پیش آئے تو صبر اور توکل کا انداز اختیار کرو۔اللہ تمہارا نگہبان ہے،وہ تمہارے لیے مشکل کے بعد آسانی پیدا کر دے گا۔

جس طرح ہماری زمین مسلسل گردش کر رہی ہے۔اسی طرح انسان کے حالات بھی برابر بدلتے رہتے ہیں۔انسان کو چاہیے کہ کسی بھی حال میں مایوس نہ ہوں۔وہ ہمیشہ ناامیدی کے پہلو پر امید کے پہلو کو غالب رکھے۔

حال کی بنیاد پر وہ کبھی مستقبل کے بارہ میں اپنے یقین کو نہ کھوئے،

رات کے آنے کو اگر آج کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ اندھیرے کا آنا معلوم ہوگا۔مگر کل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ روشن صبح کے آنے کی تمہید بن جاتا ہے۔خزاں کا موسم بظاہر پت جھڑ کا موسم دکھائی دیتا ہے۔مگر مستقبل کی نظر سے دیکھیے تو وہ بہار کے سرسبز وشاداب موسم کی خبر دینے لگے گا۔

یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔یہ قانون عام مادی دنیا کے لیے بھی ہے،اور اسی طرح انسانوں کی زندہ دنیا کے لیے بھی۔اس میں کوئی تبدیلی ہونے والی نہیں۔

جب دنیا کی تخلیق اس ڈھنگ پر ہوئی ہے۔تو کوئی انسان اس دنیا میں مایوس کیوں ہو،جب یہاں ہر تاریکی آخر کار روشنی بننے والی ہے۔تو وقتی حالات سے گھبرانے کی کیا ضرورت،

آدمی اگر یہاں کسی مشکل میں پھنس جائے تو اس کو چاہیے کہ صبر وحکمت کے ساتھ اس سے نکلنے کی کوشش کرے۔اگر بالفرض اس کے پاس جدوجہد کرنے کی طاقت نہ ہو تب بھی اس کو چاہیے کہ وہ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے آنے والے کل کا انتظار کرے

۔

اس دنیا میں جس طرح محنت ایک عمل ہے۔ اسی طرح انتظار بھی ایک عمل ہے۔ جو شخص عمل کا ثبوت نہ دے سکے اس کو چاہیے کہ وہ انتظار کا ثبوت دے۔ اگر اس نے سچا انتظار کیا تو عین ممکن ہے کہ وہ انتظار کے ذریعہ بھی اس چیز کو پالے، جس کو دوسرے لوگ محنت کے راستہ سے تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ قدرت کا نظام خود اپنے آخری فیصلہ کو ظہور میں لانے کے لیے سرگرم ہے۔ بشرطیکہ آدمی مقررہ وقت تک اس کا انتظار کر سکے۔

عربی کا ایک مقولہ ہے، بہت سی نقصان دینے والی چیزیں نفع دینے والی ہوتی ہیں۔ یہ قول نہایت بامعنی ہے، وہ زندگی کی ایک اہم حقیقت کو بتاتا ہے۔ یہ کہ اس دنیا میں کوئی نقصان صرف نقصان نہیں یہاں ہر عسر کے ساتھ یسر ہے۔ یہاں ہر نقصان کے ساتھ ایک فائدہ کا پہلو لگا ہوا ہے، آدمی کو چاہیے کہ اس کو نقصان پیش آئے تو وہ مایوس ہو کر بیٹھ نہ جائے۔ بلکہ اپنے ذہن کو سوچ کے رخ پر لگائے۔ عین ممکن ہے کہ وہ ایسا امکان دریافت کر لے۔ جو نہ صرف اس کے نقصان کی تلافی کرے بلکہ اس کو مزید اضافہ کے ساتھ کامیاب بنا دے۔

ایک شخص دیہات میں ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوا۔ ۱۹۲۵ میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ جب کہ اس کی عمر صرف چھ سال تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد خاندان والوں نے اس کی جائداد پر قبضہ کر لیا۔ اس کو ایک معمولی مکان کے سوا کوئی اور چیز نہیں ملی۔

مجبور ہو کر وہ دس سال کی عمر میں کمانے کے لیے نکلا، وہ دیہات سے نکل کر شہر چلا گیا عرصہ تک وہ محنت مزدوری کرتا رہا۔ حالات نے اس کو دستکاری کے کام پر لگا دیا۔ اپنی محنت سے وہ ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک کارخانہ کھول لیا، اس کی ترقی جاری رہی۔ ۷۰ سال کی عمر میں جب وہ مرا تو وہ ایک بہت بڑا صنعتکار ہو چکا تھا۔ اس

نے اپنے پیچھے کروڑوں کی جائداد چھوڑی۔

اس آدمی کے ساتھ اگر عسر کی حالت پیش نہ آتی۔ دیہات میں اس کو اس کے تمام کھیتی تمل جاتے تو وہ اسی میں لگ جاتا، وہ ایک کسان کی حیثیت سے جیتا، اور کسان کی حیثیت سے مرتا۔ مگر عسر اور نقصان نے اس کو اوپر اٹھایا۔ اس کے تلخ تجربات نے اس کو زرعی دور سے نکال کر صنعتی دور میں پہنچا دیا۔

زندگی کے امکانات کی کوئی حد نہیں،،، ہر بار جب ایک امکان ختم ہوتا ہے تو وہیں زیادہ بڑا امکان آدمی کے لیے موجود رہتا ہے۔ پھر کوئی شخص مایوس کیوں ہو۔ پھر آدمی نقصان پر احتجاج کیوں کرے۔ کیوں نہ وہ نئے امکان کو استعمال کرے۔ جو اس کی شام کو دوبارہ ایک روشن صبح میں تبدیل کر دینے والا ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ جب ایک امکان کا سرا اس کے ہاتھ سے نکل جائے تو وہ کھوئی ہوئی چیز کا ماتم کرنے میں وقت ضائع نہ کرے۔ بلکہ نئے امکان کو دریافت کر کے اس کا استعمال شروع کر دے۔ عین ممکن ہے کہ اس تدبیر کے ذریعہ وہ پہلے سے بھی بڑی کامیابی اپنے لیے حاصل کر لے۔

کامیابی کا راز

ٹاٹا خاندان نے صنعت کے میدان میں ہندوستان میں غیر معمولی ترقی کی ہے، ان کا صنعتی پھیلاؤ اتنا زیادہ ہے کہ اس کو ٹاٹا انڈسٹریل ایمپائر کہا جاتا ہے۔ یہ ترقی انھیں اتفاقاً حاصل نہیں ہوگئی، بلکہ اس کے معلوم اسباب ہیں۔ ان اسباب میں نمایاں ترین وہ اخلاقی اوصاف ہیں۔ جس کا ثبوت وہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے دے رہے ہیں۔

ا۔ صنعتی کامیابی کی یہ کہانی گجرات کے ایک پارسی جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا سے شروع ہوتی ہے۔ انھوں نے ۱۸۶۸ میں بمبئی میں اکیس ہزار روپیہ کی لاگت سے اسٹیل کا ایک کارخانہ پلانٹ ٹاٹا کے نام سے قائم کیا، یہ ابتدا ترقی، کرتے، کرتے آج ایک انڈسٹریل ایمپائر بن چکی ہے۔ مگر ٹاٹا گروپ پورے استقلال اور اتحاد کے ساتھ اپنی مہم میں لگا ہوا ہے۔ کوئی بھی چیز اس کے استقلال اور اتحاد کو توڑنے والی نہ بن سکی۔

۲۔ جمشید جی کے بعد ان کے صاحبزادے جہانگیر رتن جی دادا بھائی ٹاٹا نے اس کاروبار کو بہت ترقی دی ہے۔ ان کو بجا طور پر عظیم بصیرت والا انسان کہا جاتا ہے۔ ان کی بصیرت اور دور اندیشی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ہوا بازی کی اہمیت کو سمجھا۔ وہ پہلے ہندوستانی پائلٹ ہیں۔ جن کو مارچ ۱۹۲۹ میں ہوائی جہاز چلانے کا لائسنس دیا گیا۔ انھوں نے ۱۹۳۲ میں پہلی ہوائی کمپنی ٹاٹا ایریز کے نام سے قائم کی۔ ۱۹۴۸ میں ہندوستانی حکومت نے اس کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اور اس کا نام ایرانڈیا رکھ دیا گیا۔

۳۔ جے آر ڈی ٹاٹا (۱۹۰۴) غیر معمولی وسعت ظرف کے مالک ہیں۔ ۱۹۳۰ میں آغا خان نے اعلان کیا، کہ انگلینڈ اور انڈیا کے درمیان جو شخص سب سے کم وقت میں جہاز اڑا

کرلے جائے گا۔اس کو وہ بہت بڑا انعام دیں گے ۔اس پر جے ڈی ۔ٹاٹا نے کراچی سے اپنا جہاز اڑایا۔ایک اور شخص لندن سے روانہ ہوا،درمیان میں دونوں تیل لینے کے لیے قاہرہ میں اترے۔

اس وقت ٹاٹا کومعلوم ہوا کہ ان کے حریف کو ایک پرزہ کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔اس کو اس وقت تک قاہرہ میں انتظار کرنا پڑے گا۔جب تک انگلینڈ سے وہ پرزہ نہ آجائے۔ٹاٹا کے لیے یہ سنہری موقع تھا کہ وہ بلا مقابلہ کامیابی حاصل کرلیں۔مگر انھوں نے وسعت ظرف سے کام لیتے ہوئے،وہ پرزہ اپنے پاس سے اپنے حریف کو دے دیا۔اس فیاضی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا حریف مقابلہ جیت گیا۔مگر ٹاٹا نے کبھی کسی قسم کے ملال کا اظہار نہیں کیا۔

انسانی احترام کے بارہ میں جے آر،ڈی ٹاٹا بے حد حساس ہیں،اختیارات کے باوجود وہ اپنی رائے دوسروں کے اوپر نہیں تھوپتے،بلکہ ہمیشہ دوسروں کو متاثر کرنے کا طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ایک بار ان کی کمپنی کے ڈائریکٹر نے ایک لفٹ پر یہ نوٹس لگادی کہ اس لفٹ کو صرف ڈائریکٹر حضرات ہی استعمال کرسکتے ہیں۔ٹاٹا کو معلوم ہوا تو وہ تیزی سے اس مقام پر پہنچے،اور خود اپنے ہاتھ سے نوٹس کو پھاڑ کر پھینک دیا۔(ہندوستان ٹائمس آف انڈیا ۳ فروری ۱۹۹۲)

اس دنیا میں کامیابی کا راز ایک،لفظ میں،بااصول ہونا ہے۔یہاں اصول کے مطابق زندگی گزارنے والا آدمی کامیاب ہوتا ہے۔اور اصول سے انحراف کرنے والا آدمی ناکام۔

اصول کی ہے،اصول دراصل حقائق سے مطابقت کرنے کا دوسرا نام ہے۔

حقائق اگر استقلال کا تقاضا کریں تو آدمی غیر مستقل مزاجی کے ساتھیہاں کامیاب نہیں ہوسکتا،حقائق اگر دوراندیش آدمی کا ساتھ دیتے ہوں،تو دوراندیشی کے خلاف

رویہ کا ثبوت دے کر یہاں کامیابی کا حصول ممکن نہیں ۔حقائق کا مطالبہ اگر یہ ہو کہ لوگوں کے مزاج کی رعایت کی جائے تو یہ ناممکن ہے ۔کہ ایک شخص لوگوں کے مزاج کے خلاف چلے اوراس کے باوجودوہ کامیاب ہو۔

نیز یہ کہ اصول کو مفادات سے بلند ہوکر اختیار کرنا چاہیے،اگر ایک شخص ایسا کرے کہ جہاں بظاہر فائدہ نظر آئے وہاں وہ اصول پسند بن جائے ۔اور جہاں فائدہ دکھائی نہ دے وہاں وہ اصول کو چھوڑ دے،تو ایسے شخص کو با اصول نہیں کہا جا سکتا،

جوشخص اصول کو مفادات کے تابع رکھے وہ اس دنیا میں چھوٹی کامیابی تو حاصل کر سکتا ہے،مگر یہاں بڑی کامیابی صرف اس انسان کے لیے مقدر ہے جو اصول کو اصول کے لیے اختیار کرے،جو مفادات کی پرواہ کیے بغیر اصول پر قائم رہنے والا ہو۔

تجربہ کی زبان سے

ایک پاکستانی مسلمان اپنے ہندوستانی عزیزوں سے ملنے کے لیے ہندوستان آتے رہتے ہیں، ان کا ہندوستان کا پتہ یہ ہے آغا غیاث الرحمان انجم، جان سنز کارپٹ، مینو فیکچررز، کمرشل اسٹریٹ، بنگلور، موصوف کا تفصیلی خط ہمیں معلوم ہوا ہے۔انھوں نے اس میں اپنے تین واقعات درج کیے ہیں، ان کے خط کا ابتدائی حصہ خود ان کے اپنے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے۔

میرا تعلق پاکستان ہے۔اپنے عزیزوں سے ملنے میں اکثر بنگلور آتا رہتا ہوں، اب کے بار انڈیا آیا تو الرسالہ کا شمارہ جنوری ۱۹۹۲ء دیکھنے کا اتفاق ہوا۔اس میں ایک واقعہ افضل صاحب کا، خون کے بجائے پانی، کے عنوان سے پڑھا تو میرے ذہن میں انڈیا کے تین ذاتی واقعات یاد آگئے جو اختصار کے ساتھ سپرد قلم کر رہا ہوں، ان واقعات سے میرا ئی یقین پختہ ہو گیا ہے۔ کہ دل میں اگر تنگی اور نفرت کی بجائے دوسروں کے لیے محبت اور کشادگی ہو، رویے میں سختی کی بجائے نرمی، زبان میں تلخی کی بجائے مٹھاس ہو تو پوری دنیا امن وآشتی سے مالا مال ہو سکتی ہے۔

پہلا واقعہ ۱۹۸۲ میں پیش آیا، میں، میری بیوی، بیٹی، اور نوعمر بیٹا بذریعہ ٹرین دہلی سے بنگلور جا رہے تھے۔جس بوگی میں ہمیں جگہ ملی وہ چھوٹی سی تھی۔اور اس میں تقریباً پندرہ مسافر اور تھے، جن کا تعلق بھارت اور ہندومت کے ساتھ تھا۔ان میں زیادہ تر نوجوان تھے جو بنگلور کے کسی تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور چھٹیاں گزارنے کے بعد واپس جا رہے تھے، ہماری روایتی سادگی اور بے تکلفی کے سبب یہ نوجوان بہت جلد ہم سے گھل مل گئے۔میری داڑھی اور میرے پریوار کی نمازوں کی پابندی دیکھ کر ہمارے بارے میں ان کا تاثر یہ تھا کہ ہم مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔لہذا، ادھر ادھر کی باتوں کے علاوہ دنیا کے موسم و حالات اور علاقائی سیاست

www.urdukitabain.blogspot.com

سے چلتے، چلتے مذہبی معاملات پر بھی ہونے لگی۔ان میں ایک ہندو نوجوان بات کرنے میں پیش، پیش تھا،اس کی گفتگو سے معلوم ہو رہا تھا۔کہ ذہین نوجوان ہے اور اپنے مذہب کے متعلق وسیع معلومات رکھتا ہے۔بہت سے سوالات اور جوابات کے بعد مذکورہ نوجوان نے ایک ایسا سوال کیا،جس کے جواب پر پوری بوگی کی فضا یکسر بدل گئی۔ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم سب مختلف نہیں بلکہ ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔اور ہمارے یہاں دوری اور دوئی نام کی کوئی شے نہیں۔

سوال یہ تھا کہ ہمارے کرشن مہاراج کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے۔میں نے جواب دیا کہ میں آپ کو ایک اصول بتاتا ہوں۔قران مجید اور حضور ﷺ کے مطابق کسی مسلمان کو نہ حق ہے اور نہ اجازت ہے کہ وہ کسی مذہب کے پیشواؤں اور قائدوں کو برا بھلا کہیں۔بلکہ حکم ہے کہ ہم ہر عقیدے اور دھرم کے پیشواؤں کا اور بزرگوں کا احترام کریں۔لہٰذا اس قانون کی رو سے ہم اس بات کے پابند ہیں کہ شری کرشن جی مہاراج اور دیگر مذاہب کے تمام پیشواؤں کا احترام کریں۔اور ان کی تعظیم کریں۔

یہ سننا تھا کہ نوجوان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔اور کہا:

اگر دنیا کے تمام مذہبی لوگ آپ جیسے ہو جائیں تو دنیا سے یہ لڑائی جھگڑے قتل و غارت گری،اور آئے دن کے فسادات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔

میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا،اگر یہ بات ہے تو آپ سب سے میرے ساتھ وعدہ کریں کہ تم پوری زندگی لوگوں کے دل سے کدورتیں اور دشمنیاں مٹاؤ گے۔اور ان کے دلوں میں باہمی صلح و محبت اور افہام تفہیم کے بیج بوؤ گے،تمام نوجوانوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا۔

اس طویل سفر کے دوران ساری گفتگو کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا،کہ ہم کو بنگلور اسٹیشن پر اترنا تھا،اور ان کو بنگلور اسٹیشن پر۔لہٰذا ہماری منزل پہلے آگئی۔جوں ہی ہماری گاڑی اسٹیشن پر

www.urdukitabain.blogspot.com

رکی تو ان نوجوانوں نے کسی قلی کو ہمارے سامان کے قریب نہ آنے دیا۔ اور نہ ہمیں ہمارے سامان کو ہاتھ لگانے دیا۔ بلکہ ہر نوجوان نے آگے بڑھ کر از خود قلیوں کی طرح ہمارا سامان اپنے ہاتھوں اور کندھوں پر اٹھایا۔ اور آن واحد میں پورا سامان پلیٹ فارم پر ڈھیر کر دیا۔ اور جب گاڑی چلی تو ایک، ایک نوجوان نے ہم کو سلام کیا۔ معانقہ کیا۔ ہمارے عزیزوں کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اپنے ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے گاڑی میں سوار ہوئے۔ اور اس سفر کی خوش گوار یادیں ہمارے دلوں میں چھوڑ کر جانب منزل روانہ ہو گئے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سبق آموز

امریکی میگزین ٹائم (۱۰ فروری ۱۹۹۲) کی کور سٹوری کا موضوع ہے ۔۔۔امریکہ کے بارہ میں جاپان کا ذہن، اور جاپان کے بارہ میں امریکہ کا ذہن:

اس رپورٹ کا خلاصہ، میگزین کے الفاظ میں، یہ ہے کہ امریکہ اور جاپان کی بظاہر نا اتفاقی ایک زیادہ گہری سچائی کو چھپائے ہوئے ہے ۔وہ یہ کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کو اپنی ضرورت سمجھتی ہیں۔

میگزین نے لکھا ہے کہ امریکہ اگرچہ اب بھی بہت طاقت ور اقتصادیات کا مالک ہے۔مگر اب وہ اپنے بارہ میں محسوس کرتا ہے ۔کہ وہ ایک تخفیف شدہ چیز ہے، پرانا دشمن سوویت یونین، اب ختم ہو گیا ہے۔جاپان کے مقابلہ میں امریکہ ۴۱ بلین ڈالر کے بقدر خسارہ میں ہے۔اس اعتبار سے کچھ امریکی جاپان کو اپنا نیا دشمن سمجھتے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ ختم ہوگئی تو امریکہ کی حیثیت غالب کی تھی اور جاپانکی حیثیت مغلوب کی، مگر آج یہ ترتیب الٹ گئی ہے۔اس کی وجہ تمام تر اخلاقی ہے۔امریکہ نے ہتھیار کے اعتبار سے جاپان کے اوپر غلبہ حاصل کیا تھا۔

مگر آخر کار کردار کی طاقت نے اپنا کام کیا ۔جاپان زیادہ بہتر کردار سے مسلح ہو کر امریکہ کے اوپر غالب آ گیا۔

میگزین کے مطابق، اکثر جاپانی اور اسی طرح بہت سے امریکی بھی، امریکہ کی اقتصادی مسائل کی ذمہ داری خود امریکہ کے اوپر ڈالتے ہیں،

مساوکونی ہیروجو ایک جاپانی انتھر وپولوجسٹ ہیں۔انھوں نے سوالیہ انداز میں کہا کہ ایمرسن کے قدیم عقیدہ کا کیا ہوا، جس میں کہا گیا تھا کہ اگر تم ایک اچھا چوہے دان بناؤ گے۔تو دنیا خود چل کر تمہارے دروازے تک پہنچ جائے گی۔انھوں نے کہا کہ یہی وہ چیز تھی جس نے امریکہ کو اس اقتصادی اور صنعتی طاقت تک پہنچایا، جیسا کہ وہ آج ہے

www.urdukitabain.blogspot.com

مگر ہم سے اکثر لوگ، صحیح یا غلط طور پر، یہ خیال رکھتے ہیں۔ کہ امریکہ اب ایسے اچھے چوہے دان نہیں دے رہا ہے جو جاپانی چوہے دان سے اچھا ہو۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ اب امریکہ میں کارکردگی کا معیار گھٹ گیا ہے۔

ایک اور جاپانی مبصر یوشیو ساکوراچینے امریکہ کی کمی کے بارہ میں عام جاپانی تاثر کو بتاتے ہوئے کہا ہے کہ امریکہ کے تجارتی مسئلہ کی جڑ امریکی کارکن کی کارکردگی کا ناقص معیار ہے۔:

دوسری عالمی جنگ میں امریکہ نے جاپان کے خلاف جو ظالمانہ سلوک کیا تھا، اگر جاپان یہ کرتا کہ وہ اپنے زبان و قلم کو امریکہ کے ظلم اور اس کی سازش کے خلاف پروپگنڈے میں لگا دیتا تو جاپان کچھ بھی حاصل نہ کرتا،

بلکہ جنگ کے بعد وہ جو کچھ اس کے پاس بچا تھا اسکو بھی وہ لفظی احتجاج کی مہم میں کھو دیتا،

جاپان نے امریکہ کے سلوک پر صبر کر لیا۔ اس نے امریکہ کے خلاف شوروغل کرنے کی بجائے خود تعمیری کو مشن بنا لیا۔ اس کا نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔ صرف چالیس سال کی مدت میں تاریخ بدل گئی۔ جو پیچھے تھا وہ آگے ہو گیا۔ اور جس نے آگے کی سیٹ پر قبضہ کر رکھا تھا اس کو مجبور ہو کر پچھلی سیٹ پر واپس جانا پڑا،

برداشت کا مسئلہ

نئی دہلی کے انگریزی روزنامہ دی پانیر (۲۴ جون ۱۹۹۲) نے جل دیپ لاہری کے حوالے سیا یک رپورٹ چھاپی ہے۔اس رپورٹ میں ایک سبق چھپا ہوا ہے، یہ سبق کہ بعض ناخوشگوار باتیں صرف اس قابل ہوتی ہیں کہ ان کو برداشت کرلیا جائے۔ایسی باتوں کو برداشت نہ کرنا صرف ان کی مقدار میں اضافہ کرنے کے ہم معنی ہے۔

یہ ۲۲ جون ۱۹۹۲ کی شام کا واقعہ ہے، راجدھانی ایکسپریس دہلی سے ہوڑہ کے لیے روانہ ہوئی۔ٹرین آگے بڑھی تو اس کی ایک کوچ کے (۴-سی) کے مسافروں کو محسوس ہوا کہ ان کی کوچ کا اے سی یونٹ کام نہیں کررہا ہے۔کوچ کے ستر مسافر اس پر برہم ہوگئے انھوں نے انجام پر زیادہ غور نہیں کیا۔بس زنجیر کو کھینچ کر ٹرین کو روکا اور اس کو پیچھے چلنے پر مجبور کردیا۔ٹرین واپر ہوکر پہلے اسٹیشن (تلک برج) کھڑی ہوگئی۔

ٹرین کے مسافر پلیٹ فارم پر اتر آئے، ان میں اور ٹران کے ذمہ داروں میں تکرار شروع ہوگئی۔مسافروں کی مانگ یہ تھی کہ مذکورہ ناقص کوچ کو نکال دیا جائے۔اور اس کی جگہ صحیح کوچ لگادی جائے۔دوسر طرف ریلوئے کے ذمہ داروں کا کہنا تھا کہ اس وقت فوری طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔کیونکہ قریب میں ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔

یہ بحث بے نتیجہ رہی، آخر کار ٹرین اپنی ناقص کوچ کے ساتھ دوبارہ آگے کی طرف روانہ ہوئی، البتہ اس بحث وتکرار میں غیر ضروری طور پر، راجدھانی ایکسپریس پانچ گھنٹہ کے لیے لیٹ ہوگئی۔

مزید یہ ہے کہ اس کی وجہ سے تلک برج اور نئی دہلی اسٹیشن کے درمیان ریل جام کا مسئلہ پیدا ہوگیا، اور پانچ آنے اور جانے والی ٹرینیں لیٹ ہوگئیں۔راجدھانی ایکسپریس کے دو مسافر جن کو وقت پر کلکتہ پہنچنا تھا، وہ اس صورت حال سے اتنا پریشان ہوئے کہ ٹرین کو چھوڑ کر پالم ایرپورٹ کی طرف بھاگے، تاکہ شام کا ہوائی جہاز پکڑ کر وقت پر

اپنی منزل کی طرف پہنچ سکیں۔

یہ معاملہ ذہنی پختگی اور نا پختگی کا ہے۔ ذہن کی نا پختگی نے یہ سارا معاملہ کھڑا کیا۔ اگر مذکورہ کوچ کے مسافر پختہ ذہن کے لوگ ہوتے تو نہ یہ مسلہ پیدا ہوتا، اور نہ سینکڑوں مسافروں کو یہ غیر ضروری مصیبت اٹھانی پڑتی۔

ذہن کی پختگی کیا ہے۔ ذہن کی پختگی کی یہ تعریف کی گئی ہے۔ کہ آدمی ایسی حقیقت قبول کرلے، جس کو وہ بدل نہیں سکتا، نا پختہ ذہن کے لوگ ایسی صورت حال پیش آنے پر چیخ اٹھتے ہیں۔ اور پختہ ذہن کے لوگوں کو ایسی صورت حال پیش آتی ہے تو وہ اس سے موافقت کرلیتے ہیں۔ تاکہ ان کا سفر حیات بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہ سکے،

مذکورہ ۰ ے مسافروں کے واقعہ پر غور کیجیے۔ تو معلوم ہوگا، کہ وہ ذہنی پختگی کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے، اگر وہ لوگ ایسا کرتے کہ وقتی طور پر ایر کنڈیشنز کی محرومی پر صبر کر لیتے تو ان کا مسلہ صرف ایک مسئلہ رہتا، یعنی وقتی طور پر تھوڑی سی گرمی برداشت کر لینا۔ مگر جب انھوں نے صبر نہیں کیا، تو ان کا مسئلہ مزید بڑھ کر کئی مسلے بن گئے۔

موجودہ دنیا میں سب کچھ کسی کی مرضی کے مطابق ہونا ممکن نہیں، یہاں زندگی نقصان پر راضی ہونے کا نام ہے، جو آدمی ایک نقصان پر راضی نہ ہو اس کو آخر کار کئی نقصان پر راضی ہونا پڑے گا۔

مواقع کا استعمال

اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ کا واقع اجتماعی حکمت کی ایک عظیم الشان مثال ہے۔ مکہ کے قریش نے اگر چہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی سخت مخالفت کی۔ مگر شروع ہی سے ان کے درمیان ایک عنصر موجود تھا۔ جو یہ چاہتا تھا کہ ہم براہ راست محمدؐ سے نہ ٹکرائیں۔ بلکہ ان کا رخ دوسرے عرب قبائل کی طرف پھیر دیں۔ پیغمبر اسلام نے اس ذہن کو اپنے حق میں استعمال کیا۔

مکہ کے سرداروں میں ایک ممتاز سردار عتبہ بن ربیعہ تھا، ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے کہ قریش نے ایک بار عتبہ کو اپنا نمائندہ بنا کر رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا، اس ملاقات کا تفصیلی بیان سیرت کی کتابوں میں موجود ہے، عتبہ جب آپ سے گفتگو کر کے واپس آیا تو اس نے قریش سے کہا،:

اے قریش کے لوگوں، میری بات مانو، اور اس آدمی کے درمیان اور جس میں وہ ہے اس کے درمیان حائل نہ ہو۔ اور اسے چھوڑ دو، اگر عرب اس سے نمٹ لیں تو وہ تمہارے لیے کافی ہونگے۔ اور اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہے، اور اس کی عزت تمہاری عزت ہے۔

اس طرح ہجرت کے بعد جب قریش رسول اللہ ﷺ لے خلاف جنگ بدر چھیڑ نے کے لیے نکلے تو راستہ میں آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ اس وقت عتبہ نے قریش کے ایک گروہ کی نمائندگی کرتے ہوئے مکہ والوں سے کہا،

اے قریش کے لوگو، خدا کی قسم محمدؐ اور ان کے اصحاب سے ٹکرا کر تم کچھ بھی حاصل نہ کر سکو گے۔ خدا کی قسم اگر ان سے تمہاری مڈبھیڑ ہوئی تو ہمارے ہر آدمی کے سامنے کسی ایسے آدمی کا چہرہ ہوگا جس کو قتل کرنا اسے پسند نہ ہو، یعنی چچا کا لڑکا، ماموں کا لڑکا، یا اپنے قبیلہ کا کوئی آدمی، اس لیے تم لوٹ چلو، اور محمدؐ اور عرب قبائل کے درمیان سے

ہٹ جاؤ، اگر اہل عرب محمد پر غالب آگئے تو یہ وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو، اور اگر محمد عرب قبائل پر غالب آگئے تو محمدؐ تم کو اس حال میں پائیں گے کہ تم نے ان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی ہوگی۔ موجودہ دنیا امتحان اور مقابلہ کی دنیا ہے، یہاں یہ ممکن نہیں، کہ فریق ثانی کو عین اپنی پسند کی شرطوں پر راضی کرنا پڑتا ہے۔ یہ راضی ہونا سرینڈر نہیں بلکہ حکمت ہے جس سے آدمی اپنے لیے نقطہ آغاز پا لیتا ہے۔ یہی آدمی کی حکمت اور تدبیر کا امتحان ہے، یہاں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ فریق ثانی کی شرطوں میں کہاں وہ گنجائش ہے، کہ جس کو مان کر ہم اپنے لیے مستقبل کی تعمیر کا راستہ نکال سکتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر یہی کیا، آپ نے کمال دانش مندی کے ساتھ مذکورہ ذہن کو سمجھا، اور اس کو انتہائی حکمت کے ساتھ استعمال کیا، چنانچہ حدیبیہ کے مقام پر جب قریش نے آپ کو آگے بڑھنے سے روک دیا تو، اس وقت آپ نے قریش کو جو پیغام بھیجا، اس میں یہ الفاظ بھی شامل تھے۔

ہم کسی سے لڑنے کے لیے نہیں آئے بلکہ ہم عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اور جنگ نے قریش کا برا حال کر رکھا ہے۔ اور ان کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو میں ان کے لیے ایک مدت (صلح) مقرر کر دوں۔ اور وہ میرے اور عرب قبائل کے درمیان سے ہٹ جائیں، اگر میں غالب رہا تو وہ چاہیں تو اس دین میں داخل ہو جائیں گے، اور اگر میں غالب نہ ہوا تو ان کا مدعا حاصل ہے۔

زندگی کا اصول

ایک شخص موٹر کار کس لیے خریدتا ہے، تیز رفتار سفر کے لیے۔ کار کا مقصد چلنے کی رفتار کو دوڑنے کے قابل بنانا ہے۔ مگر وہی کار کار ہے جو دوڑنے کے ساتھ رکنا بھی جانتی ہو، ایک کار بظاہر نہایت عمدہ ہو، مگر اس کے اندر روکنے کا نظام (بریک) نہ ہو تو کوئی بھی شخص ایسی کار کی خریداری قبول نہیں کر سکتا۔

سڑک کے سفر کا جو اصول ہے، وہی زندگی کے سفر کا اصول ہے۔ زندگی کا وسیع تر سفر کامیابی کے ساتھ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو چلنے کے ساتھ رکنا بھی جانتے ہو، جو لوگ صرف چلنے اور اقدام کرنے کی اصطلاحوں میں سوچنا جانیں، رکنے اور ٹھہرنے کا لفظ جن کی لغت میں موجود نہ ہو۔ وہ گویا ایسی موٹر کار کی مانند ہیں۔ جس کے اندر بریک نہیں، اور جس موٹر کار کے اندر بریک کا نظام نہ ہو وہ ہمیشہ کھڈ میں جا گرتی ہے۔ ایسی کار کے لیے منزل پر پہنچنا مقدر نہیں۔

اگر آپ کا مزاج یہ ہو کہ کوئی شخص آپ کے خلاف کوئی بات بول دے تو آپ اس سے لڑ جائیں، کوئی شخص آپ کی امیدوں پر پورا نہ اترے تو آپ اس کو اپنا حریف سمجھ کر اس سے مقابلہ بازی شروع کر دیں تو گویا آپ بغیر بریک کی کار ہیں، آپ کا حال یہ ہے کہ جہاں چپ رہنا چاہیے وہاں آپ بولتے ہیں، جہاں اپنے قدموں کو روک لینا چاہیے، وہاں تیز رفتاری کے ساتھ آپ چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے آدمی کا انجام اس دنیا میں صرف بربادی ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں،

عقلمند آدمی وہ ہے جو اپنی طاقت کو منفی کارروائیوں میں برباد ہونے سے بچائے، جو راہ کے کانٹوں سے الجھے بغیر اپنا سفر جاری رکھے، شریعت کی زبان میں اس کو اعراض کہتے ہیں، اور اعراض بلاشبہ زندگی کا ایک ناگزیر اصول ہے۔

جس شخص کا ایک سوچا سمجھا مقصد ہو، جو اپنے طے کیے ہوئے منصوبہ کی تکمیل میں لگا ہوا

www.urdukitabain.blogspot.com

وہ، وہ لازماً اعراض کرے گا، وہ ہمیشہ اپنے مقصد کو سامنے رکھے گا، البتہ جن لوگوں کے سامنے کوئی متعین مقصد نہ ہو وہ اعراض کی اہمیت کو نہیں سمجھیں گے، وہ معمولی معمولی باتوں پر دوسروں سے لڑ جائیں گے۔ وہ سمجھیں گے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں، حالاں کہ وہ صرف اپنی قوتوں کو ضائع کر رہے ہو نگے۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

باب سوئم

مضامین حکمت

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

طاقت کا خزانہ

انسانی دماغ ایک نا قابل یقین نظام ہے، اس کی جسامت ایک سنگترے سے بھی کم ہوتی ہے، مگر وہ ایک سیکنڈ میں ۸۰۰ یاداشتیں محفوظ کر لیتا ہے، وہ اوسطاً ۷۵ سال تک برابر یہ کام جاری رکھ سکتا ہے،

انسانی دماغ میں جو بات بھی پڑتی ہے، وہ پوری طرح اس کو محفوظ کر لیتا ہے، اور پھر کبھی اس کے کسی جزء کو فراموش نہیں کرتا، خواہ ہم ان تمام معلومات کو شعوری طور پر یاد میں نہ لاسکیں، تاہم ہمارے دماغ کے مستقل فائل میں ہر چیز ہر وقت موجود، رہتی ہے ۔

اگر ایک ایسا کمپیوٹر بنایا جائے جس کے امکانات انسانی دماغ کے برابر ہوں تو اس کا انفرا اسٹرکچر اتنا زیادہ ہوگا، کہ وہ ایمپائر اسٹیٹ جیسی بلڈنگ کو گھیر لے گا، ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ نیو یارک میں ہے۔ اس کی ۱۰۲ منزلیں ہیں، اور اس کی اونچائی ۱۲۵۰ فٹ ہے ۔ ایسا سپر کمپیوٹر اگر بنایا جاسکے تو اس کو چلانے کے لیے ایک ارب واٹ بجلی کی توانائی درکار ہوگی ۔ اس کی لاگت اتنی زیادہ ہوگی، جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے:

یہ دماغ انسان کے لیے اللہ کا ایک انتہائی حیرت ناک تحفہ ہے، تاہم بڑے سے بڑا سائنس دان بھی اس کو صرف جزوئی طور پر استعمال کر پاتا ہے، دماغ کے تمام اعلیٰ امکانات ابھی تک غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں ۔

امریکی میگزین اسپان (span) کے شمارہ سر مبر ۱۹۸۹ میں ایک تحقیقی مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ۔۔۔ ہمارا حیرت ناک دماغ (our amazing Mind)

اس مضمون کے مرتب یو، ایس، نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ کے سینئر اڈیٹر مسٹر ولیم، ایف ال مین (william.F,Allman) ہیں اس میں بتایا گیا ہے، کہ دماغ کی تحقیق کا

کام موجودہ زمانے میں اتنا بڑھ گیا ہے کہ،اب اس کی علیحدہ علمی شاخ وجود میں آچکی ہے۔جس کو دماغ کی سائنس کہا جاتا ہے۔اس سائنس کے تحت جو بے شمار معلومات سامنے آئی ہیں۔وہ ایک قسم کے انفجار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ایک سائنس دان نے داغ کو فکری انجن سے تعبیر کیا ہے۔حالانکہ یہ تعبیر بے حد ناقص ہے۔کیونکہ دماغ کے ایک لاکھ ملین نیوران جس طرح متحدہ طور پر کام کرتے ہیں،اور ایک لمحہ کے اندر اشیا کے مابین تمیز کر لیتے ہیں،وہ کوئی بڑی سے بڑی امکانی مشین بھی نہیں کرسکتی،اپنی حیرت ناک کارکردگی کے لحاظ سے ایک فرد واحد کا دماغ،دنیا کی تمام مشینوں اور تمام کمپیوٹروں پر بھاری ہے۔

اس سلسلہ میں جدید تحقیقات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے آخر میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ اگرچہ بیسویں صدی کے سائنسدانوں نے اس بات کی کافی کوشش کی ہے کہ وہ ایسی مشینیں بنائیں جو انسانی دماغ جیسا کام کر سکیں،مگر انتہائی طاقت ور قسم کا سپر کمپیوٹر بھی ابھی تک انسانی دماغ سے بہت پیچھے ہے۔

انسانی دماغ طاقت کا اتھاہ خزانہ ہے یہ خزانہ ہر آدمی کو پیدائشی طور پر حاصل ہے وہ کسب اور کوشش کے بغیر ہر آدمی کو اپنے آپ ملا ہوا ہے،دماغ کے ہوتے ہوئے کوئی شخص بھی مفلس نہیں۔کوئی بھی شخص دوسروں سے کمزور نہیں،خواہ ظاہری سامان کے اعتبار سے وہ کتنا ہی زیادہ مفلس اور کمزور دکھائی دیتا ہو۔

دماغ کی صورت میں سب سے زیادہ طاقتور مشین آپ کے پاس موجود ہے۔ایسی مشین جس کی مثل کوئی دوسری چیز ساری معلوم کائنات میں کہیں موجود نہیں۔اس طاقتور مشینی خزانہ کو استعمال کیجیے،اس کے اندر چھپے ہوئے امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش کیجیے،اور پھر کبھی آپ کو ناکامیابی کی شکایت نہیں ہوگی۔

دنیا میں کسی بھی شخص نے جو کامیابی حاصل کی ہے۔وہ اس دماغ کی طاقت کو استعمال

کر کے حاصل کی ہے۔ فطرت کی دی ہوئی یہی عظیم طاقت آپ کے پاس بھی موجود ہے۔ امکانی طور پر آپ بھی عین اسی ترقی کے کنارے پر کھڑے ہیں جہاں کوئی بھی شخص کبھی پہنچا ہے۔ پھر مایوسی کیوں اور شکایت کس لیے۔ اپنے امکان کو واقع بنائیے۔ کامیابی کی ہر بلندی اس انتظار میں ہے کہ آپ وہاں پہنچیں۔ اور اپنے آپ کو اس کے اوپر کھڑا کر دیں۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

امکان ختم نہیں ہوتا

ایک امریکی نوجوان ڈیوٹ ویلٹ (Dewitt Wallace) نے ارادہ کیا کہ وہ ایک ماہنامہ ڈائجسٹ نکالے، اپنے والد سے اس نے ابتدائی سرمایہ کے طور پر ۳۰۰ ڈالر مانگا، مگر والد نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ڈیوڈ پیسہ استعمال کرنا نہیں جانتا، وہ اسے ضائع کر دے گا، بمشکل اس نے اپنے بھائی سے کچھ رقم حاصل کی،۔ اور جنوری ۱۹۲۰ میں اس نے نمونہ کا شمارہ چھاپا۔ جو چند سو نسخوں سے زیادہ نہ تھا۔

اب ڈیوٹ کے سامنے دوسرا مسئلہ تھا۔ اس نے اپنا میگزین نیویارک کے پبلیشنگ اداروں کو دکھایا، اور کہا کہ اس کو فروخت کرنے میں وہ اس کے ساتھ تعاون کریں۔ مگر تمام اداروں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ اور کہا کہ یہ میگزین بہت زیادہ سنجیدہ ہے۔ اور اتنے زیادہ سنجیدہ پرچہ کے لیے مارکیٹ موجود نہیں۔

یہ بڑا نازک مسئلہ تھا۔ کیونکہ اخبارات و رسائل پبلشنگ اداروں ہی کے ذریعہ عوام تک پہنچتے ہیں۔ اور پبلشنگ اداروں نے ڈیوٹ کو تعاون دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم ایک امکان بدستور ڈیوٹ کے لیے باقی تھا۔ وہ یہ کہ وہ خریداروں تک براہ راست پہنچے، اس نے بہت سے پتے حاصل کر کے لوگوں کو براہ راست خطوط لکھے۔ اسی کے ساتھ اس نے اخبارات میں اشتہار شائع کیا۔ عام حالات میں ایک نئے اور غیر معروف میگزین کے لیے اس طرح خریدار حاصل کرنا بظاہر ناممکن تھا، مگر ڈیوٹ کی ایک تدبیر نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ اس نے اپنے خطوط اور اپنے اشتہارات میں جو باتیں لکھیں۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی:

قاری اگر میگزین کو پڑھنے کے بعد مطمئن نہ ہوں تو خریداری ختم کر دی جائے گی۔ اور اسے اس کی پوری رقم اسے واپس کر دی جائے گی۔

اس پیش کش کا نتیجہ یہ ہوا، کہ ڈیوٹ کے پاس خریداری کی فرمائش اور منی آرڈر آنا

شروع ہو گئے۔ پہلے ہی مرحلے میں اس نے اتنی رقم حاصل کر لی

جس سے دو ماہ کا شمارہ۔ بہ آسانی چھاپا جا سکے۔

ڈیوٹ کا منصوبہ کامیاب رہا کسی ایک شخص نے بھی اپنی خریداری ختم نہیں کی۔ کسی نے بھی رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا، اس نے عام خریداروں تک پہنچنے کی کوشش کو تیز تر کر دیا۔ فروری ۱۹۲۲ میں اس کا میگزین پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ برابر بڑھتا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۸۷ میں وہ ۲۸ ملین سے زیادہ تعداد میں دنیا کی پندرہ زبانوں میں ۱۳۹، اڈیشن شائع کر رہا ہے۔ یہ وہی ماہنامہ میگزین ہے، جو آج ساری دنیا میں ریڈرز ڈائجسٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اب وہ دنیا کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا میگزین بن چکا ہے۔ ۱۹۸۰ میں ڈیوٹ اور اس کی بیوی پچاس ہزار ڈالر کے مالک تھے،

ڈیوٹ نے اپنے میگزین کے لیے اس طرح خریدار فراہم کی یکہ اس نے اپنے میگزین کو خریداروں کے لیے مفت بنا دیا۔ ہر آدمی پیسہ ڈوب جانے کے اندیشے کے بغیر اس کا خریدار بن سکتا تھا۔ تاہم خود اس تدبیر کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے ایک اور تدبیر ضروری تھی، اگر یہ دوسری تدبیر موجود نہ ہوتی تو صرف پہلی تدبیر اس کی ناکامی میں اضافہ کے سوا، اسے کچھ اور دینے والی ثابت نہ ہوتی،

یہ دوسری تدبیر وہ تھی، جس کو اعلیٰ معیار کہا جاتا ہے۔ یعنی میگزین کو معیار کے اعتبار سے ایسا بنا دینا، کہ پڑھنے کے بعد قاری کو وہ واقعتہً پڑھنے کی چیز نظر آئے، وہ اس کو دیکھنے کے بعد یہ سمجھے کہ اس کی خریداری کے لیے جو رقم اس نے بھیجی ہے۔ وہ صحیح بھیجی ہے ۔اور اس کو اپنی خریداری جاری رکھنی چاہیے۔

اپنے میگزین میں یہ دوسری صفت پیدا کرنے کے لیے ڈیوٹ کو غیر معمولی محنت کرنا پڑی۔ اس کا ماہنامہ ایک ڈائجسٹ تھا، یعنی مختلف مطبوعہ مضامین کا انتخاب۔ ڈیوٹ یہ

منتخب مضامین حاصل کرنے کے لیے روزانہ چالیس سے زیادہ میگزین پڑھتا تھا۔ کچھ خرید کر اور کچھ مختلف لائبریریوں میں جا کر۔ اس پر مشقت عمل کے دوران ڈیوٹ کو طعن و طنز بھی سننے پڑتے۔

مثلاً بہت سے لوگ اس کو محض قینچی اڈیٹر کہنے لگے۔ مگر ہر مخالف بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنا کام جاری رکھا۔

ڈیوٹ عیلس نے (۱۹۸۱-۱۸۸۹) کے سوانح نگار نے اس کی کامیابیکا راز ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

جس چیز نے اس کو غیر معمولی بنایا وہ اس کا گہرا، اور دائمی تجسس تھا، مزید یہ کہ وہ کام کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا، ڈیوٹ ویلس کے ایک دوست نے اس کے بارہ میں کہا کہ وہ جتنا بولتا ہے، اس سے بہت زیادہ وہ سنتا ہے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں مواقع اور امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی فہرست کبھی ختم نہیں ہوتی۔ جب بھی ایک امکان ختم ہو تو فوراً دوسرے امکان کی تلاش میں نکل جانا چاہیے۔ آدمی اگر ایسا کرے گا تو وہ پائے گا۔ کہ جہاں حالات نے بظاہر اس کی ناکامی کا فیصلہ کر دیا تھا، وہیں اس کے لیے ایک نیا شاندار تر امکان موجود تھا۔ جس کو استعمال کر کے دوبارہ کامیابی کی منزل تک پہنچ جائے۔

خدمت کا کرشمہ

ریڈرز ڈائجسٹ (جون ۱۹۸۹) میں ایک چونکا دینے والی نیوز شائع ہوئی ہے۔اس رپورٹ کو مرتب کرنے والے ایک ہندوستانی جرنلسٹ مسٹر اشوک مہادیون ہیں، وہ ہندوستان سے کراچی گئے ،اور وہاں قریب سے مطالعہ کرنے کے بعد اپنی مفصل رپورٹ مرتب کی، جو مذکورہ ریڈرس ڈائجسٹ میں شائع ہوئی ہے۔

یہ کراچی کے ایک شخص کی کہانی ہے۔اس کا نام عبدالستار ایدھی ہے،اس نے اپنے چالیس سالہ خدمات کے نتیجہ میں، اپنے ماحول کے اندر غیر معمولی گرویدگی حاصل کی ہے۔مسٹر مہادیون کے الفاظ میں، کراچی کے مجرم لوگ بھی ان کی عزت اور احترام کرتے ہیں، ایک بار ان کو معلوم ہوا کہ کراچی کے مضافات میں پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان گولی چل رہی ہے۔وہ فوراً ایک ایمبولینس لے کر موقع واردات کی طرف روانہ ہوگئے

جیسے ہی وہ وہاں پہنچے، ڈاکوؤں نے ان کو دیکھ کر فوراً فائرنگ روک دی۔ایدھی اس میں کامیاب ہوگئے۔کہ وہ ایک سب انسپکٹر کی لاش کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں رکھ سکیں۔ڈاکو اس دوران بے تابی سے ایدھی کے جانے کے انتظار کرتے رہے۔اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں جانے کے لیے کہتے رہے۔جیسے ہی وہ وہاں سے روانہ ہوئے ڈاکوؤں نے پھر پولیس کے اوپر فائرنگ شروع کردی۔

ایک شخص کو یہ درجہ کیسے ملا، کہ اس کو دیکھ کر ڈاکو بھی اپنی بندوق نیچی کرلیں۔اس کا نام عبدالستار ایدھی ہے۔اور نہ اس کا سبب احتجاج،اور مطالبہ،یا جلسہ اور تقریر کے ہنگامے تھے،اس کا سبب صرف ایک تھا،اور وہ انسانی خدمت ہے،عبدالستار ایدھی نے اپنے چالیس،سالہ بے لاگ خدمت سے یہ مقام پیدا کیا کہ ڈاکو بھی اس کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جائیں۔

عبدالستار ایدھی (عمر ۵۵ سال) ایک مہاجر ہیں۔ ۱۹۴۷ میں وہ گجرات کو چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ ابتدا میں انھوں نے کپڑے اور دوا کی دکان پر ملازمت کی، ان پر کئی ایسے تجربے گزرے، جب ایک مریض یا حادثہ کا شکار آدمی کو اسپتال پہنچانے کے لیے فوری طور پر ایمبولینس کار کی ضرورت تھی۔ مگر وقت پر ایمبولینس نہ پہنچنے کی وجہ سے آدمی تڑپ، تڑپ کر مر گیا، ان کے دل مین آیا کہ وہ ایمبولینس سروس کا ایک رفاہی ادارہ قائم کریں گے،

۱۹۵۰ میں انھوں نے عطیات کی رقم سے ایک سیکنڈ ہینڈ ٹرک خریدا۔ اور اس کو ایک معمولی قسم کی ایمبولینس میں تبدیل کر کے مریضوں اور زخمیوں کی خدمت شروع کی۔ یہ کام بڑھا، یہاں تک کہ اب ان کے پاس ۲۴۵ ایمبولینس کا دستہ ہے، وہ کراچی کے اندر اور کراچی کے باہر، غریبوں اور معذوروں کی مفت خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کا سماجی خدمت کا ادارہ ہر، روز ہزاروں پاکستانیوں کی خدمت کرتا ہے۔ ایمبولینس کے دستہ کے علاوہ، ان کے تحت زچہ خانے، بلڈ بینک، ایکسرے کلینک، لیبارٹری، نرسنگ سکول، یتیم خانے، معذور خانے، وغیرہ چل رہے ہیں۔ انھوں نے ایتھوپیا (۵۳ ہزار ڈالر،) فلسطین ۲۶ ہزار ڈالر، بنگلہ دیش ۱۰ ہزار ڈالر اور اسی طرح بعض دوسرے ملکوں کے مصیبت زدگان کی خدمت کی ہے۔ اب وہ ایر ایمبولینس سروس اور دوسرے بڑے، بڑے ادارے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً جدید طرز کا اسپتال، حیوانات کا اسپتال وغیرہ۔

ان کا سالانہ بجٹ تقریباً ۱۰ کروڑ روپیہ ہے۔ اور یہ سب عوامی چندوں سے حاصل ہوتا ہے۔ سابق صدر ضیاالحق نے انہیں، ایک بار پانچ لاکھ کا چیک بھیجا۔ مگر عبدالستار ایدھی نے انہیں واپس کر دیا۔ انھوں نے کہا یہ کام عوام کے لیے ہے، اور عام ہی کو اس کی قیمت دینا چاہیے۔ وہ نہایت سادہ طور پر دو کمروں کے ایک فلیٹ میں رہتے

ہیں۔لوگوں کو ان کے اوپر اتنا زیادہ اعتماد ہے کہ بغیر طلب انھیں بڑی ، بڑی رقمیں دیتے رہتے ہیں۔لوگ کہتے

ہیں کہ ہمیں یقین ہے کہ جو رقم ان کو دی جائے گی، وہ ضرور صحیح طور پر استعمال ہوگی۔

۱۹۸۶ میں ان کو خدمت خلق کے لیے (Ramon Magsaysay Award) دیا گیا ہے،عبدالستار ایدھی اس سے پہلے ایک مقامی شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے۔اس انعام نے انہیں بین الاقوامی حیثیت دے دی۔اس طرح وہ انسانی خدمت کی اس ممتاز فہرست میں آگئے ہیں۔جس میں اب تک صرف مدر ٹریسا کو شہرت حاصل تھی۔اگر چہ مدر ٹریسا کا کام بہت بڑا ہے۔ان کو نوبل انعام بھی مل چکا ہے۔تاہم عبدالستار ایدھی غالباً مسلمانوں میں پہلے شخص ہیں،جنھوں نے اس میدان میں نمایاں خدمات کا ایسا ثبوت دیا ہے کہ عالمی سطح پر ان کا اعتراف کیا گیا۔

اس طرح کا کام پیشہ وارانہ طور پر نہیں کیا جا سکتا۔اس کے لیے خدا کی خلقت سے گہری شفقت کا تعلق ہونا ضروری ہے۔اور یہ چیز عبدالستار اور مدر ٹریسا میں مشترک ہے۔مدر ٹریسا کا کہنا ہے کہ میں ہر انسان کے اندر خدا کو دیکھتی ہوں۔

یہی معاملہ عبدالستار ایدھی کا ہے۔چنانچہ مسٹر اشوک مہادیون کے ایک سوال کے جواب میں عبدالستار ایدھی نے کہا،میں ان کے اندر خدا کو دیکھتا ہوں۔

خدمت کی برکت

انسان کی خدمت کا معاوضہ انسان کی محبت ہے۔ یہ اصول کسی ایک ملک کے لیے نہیں۔ بلکہ ساری دنیا کے لیے ہے، جو لوگ انسانوں کی خدمت کریں، ان کو اس سے ایک طرف بے پناہ قلبی سکون ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسروں کے اندر انھیں عزت اور محبوبیت کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ کہ ان کے دشمن بھی ان کے دوست بن جائیں۔ خطرناک ڈاکو بھی ان کو دیکھ کر اپنے ہتھیاروں کا استعمال ترک کر دیں۔

ٹالرنس: فطرت کا اصول

ٹالرنس (رواداری)، برداشت فطرت کا ایک عالمی اصول ہے۔ شیر اور ہاتھی دونوں انتہائی بڑے جانور ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر بھی دونوں ایک ساتھ جنگل میں رہتے ہیں۔ یہ صرف ٹالرنس کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ جنگلون میں دیکھا گیا ہے کہ ایک طرف سے ہاتھی آ رہا ہو، اور دوسری طرف سے شیر چل رہا ہو تو دونوں ایک دوسرے سے الجھے بغیر خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے راستے پر گزر جاتے ہیں۔ اگر دونوں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ نہ کریں تو دونوں آپس میں لڑنے لگیں۔ یہاں تک کہ دونوں لڑ، لڑ کر تباہ ہو جائیں۔

شیر اور ہاتھی ک و یہ طریقہ فطرت نے سکھایا ہے، اسی طرح انسان کے جسم میں فطرت نے ٹالرنس کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ میڈیکل سائنس میں اس کو حیاتیاتی ٹالرنس کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد ایک جسم حیوانی کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایک چیز سے برے اثر لیے بغیر اس سے ربط کو یا اس چیز کو جسم میں داخل کیے جانے کو برداشت کرے۔

جسم کی اسی صلاحیت پر امراض کے علاج کا پورا نظام قائم ہے۔ بیماری کے وقت جسم کے اندر ایسی دوائیں ڈالی جاتی ہیں، جو مجموعی حیثیت سے جسم کے لیے مضر ہیں، مگر جسم خارجی چیزوں کے معاملہ میں اپنی ساری حساسیت کے باوجود، ایسی دواؤں کو برداشت کرتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ کرتا ہے۔ اسی حیاتیاتی ٹالرنس کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ یہ دوائیں جسم میں داخل ہو کر اپنا، اثر دکھائیں۔ وہ جسم کے دوسرے اعضاء پر برا اثر ڈالے بغیر اس کے بیمار عضو پر عمل کر کے اس کو اچھا کر سکیں۔

ٹالرنس کا یہی طریقہ انسانی سماج میں بھی مطلوب ہے، جنگل کے جانور جو کچھ اپنی

جبلت کے تحت کرتے ہیں، اور انسانی جسم جو کچھ اپنی فطرت کے تحت کرتا ہے، وہ عمل انسان کو اپنے شعور کے تحت کرنا ہے، اس کو اپنے سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت ٹالرنس کا طریقہ اختیار کر کے دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔

جب بھی زیادہ لوگ مل کر زندگی گزاریں گے تو ان کے درمیان اختلافات اور شکایت کے واقعات بھی ضرور پیدا ہونگے، ایسا ایک گھر کے اندر ہو گا ایک سماج کے اندر ہو گا۔ پورے ملک میں ہو گا، اور اسی طرح بین الاقوامی زندگی میں بھی ہو گا۔ انسان خواہ جس سطح پر بھی ایک دوسرے کو ملیں۔ اور تعلقات قائم کریں۔ ان کے درمیان ناخوشگوار واقعات کا پیش آنا لازمی ہے۔

ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔ ٹالرنس اسی سوال کا جواب ہے، ایسی حالت میں ایک شخص دوسرے شخص کے ساتھ اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ رواداری اور برداشت کا معاملہ کرے۔ مل جل کر زندگی گزارنے اور مل جل کر ترقی کرنے کی۔ یہی واحد قابل عمل صورت ہے۔ اس سپرٹ کے بغیر انسانی تمدن کی تعمیر اور اس کی ترقی ممکن نہیں۔

ٹالرنس کوئی انفعالی رویہ نہیں۔ وہ عین حقیقت پسندی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی ک یلیے زیادہ بہتر چوائس لینے کا موقع تھا۔ اور اس نے کم ہمتی کی بنا پر ایک کمتر چوائس کو اختیار کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہمارے لیے اس سے بہتر چوائس ممکن ہی نہیں۔ ٹالرنس ہماری ایک عملی ضرورت ہے۔ نہ کہ کسی قسم کی اخلاقی کمزوری۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک صورت حال کو اپنے لیے ناخوشگوار پا کر اس سے لڑنے لگتا ہے۔ اور بالآخر تباہی سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی نے اپنی کوتاہ نظری کی بنا پر یہ سمجھا کہ اس کے لیے انتخاب خوشگوار اور نا

خوشگوار کے درمیان ہے وہ ناخوشگوار سے لڑ گیا تاکہ خوشگوار کو حاصل کر سکے۔

حالانکہ نتیجہ نے بتایا کہ اس کے لیے انتخاب خوشگوار اور ناخوشگوار کے درمیان نہیں تھا بلکہ اس کے لیے انتخاب ناخوشگوار اور تباہی کے درمیان تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ک یلیے انتخاب خوشگوار اور ناخوشگوار کے درمیان ہو ،زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے لیے انتخاب کم ناگوار اور زیادہ ناخوشگوار کے درمیان ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ آدمی زیادہ ناخوشگوار سے بچنے کے لیے کم ناخوشگوار پر راضی ہو جائے۔

بیشتر انسان اسی غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنے آپ کو برباد کرتے رہتے ہیں، وہ ایک اقدام کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان کا اقدام ناپسندیدہ صورت کو ہٹا کر پسندیدہ صورت حال کو لانے کے لیے ہے، مگر جب موجودہ ،صورت حال ختم ہو جاتی ہے، تو ان کو معلوم ہو جاتا ہے، کہ نئ صورت حال میں وہی ناخوشگواری زیاد بڑی مقدار میں موجود ہے۔ جس کی کم مقدار کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے انھوں نے اپنا اقدام کیا تھا،

ٹالرنس اسی حکمت عملی کا نام ہے، اس دنیا میں برداشت کرنا آدمی کو زندگی کی طرف لے جاتا ہے، اور بے برداشت ہونا صرف موت کی طرف،

ٹالرنس کا طریقہ ہم کو فرصت عمل دیتا ہے، اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے، کہ ہم ناموافق حالات سے اڈجسٹ کر کے اپنے لیے وہ مواقع حاصل کرلیں۔ جس سے ہم زندگی کا سفر معتدل طور پر جاری رکھ سکیں، اس کے برعکس اگر ہم ٹالرنس کو چھوڑ دیں اور جو چیز بھی ہم کو ناموافق نظر آئے اس سے لڑنے لگیں، تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ، ہم ایک چیز کو ببرائی ک ینام سے ختم کریں گے، صرف اس لیے کہ اس کے بعد ایک اور شدید تر برائی میں اپنے آپ کو بتلا کرلیں۔

شیر اور ہاتھی اگر ایک دوسرے کو برداشت نہ کریں تو دونوں اپنی موت کو دعوت دیں

گے۔ مگر جب وہ ایک دوسرے کو گوارہ کرتے ہیں تو دونوں اپنے لیے زندگی کا موقع پا لیتے ہیں، یہ ٹالرنس کا سب سے بڑا فائدہ ہے، ٹالرنس آپ کو فرصت عمل دیتا ہے، وہ آپ کو کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے، اور اس دنیا میں بلاشبہ سب سے بڑی چیز فرصت عمل ہے۔ فرصت عمل سے محرومی ہی کا نام بربادی ہے۔ اور فرصت عمل کو پا کر اس کو استعمال کرنے ہی کا نام کامیابی ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net
WWW.
All rights reserved.
©2002-2006

ایک غلطی بھی

ایک بار میں ایک دیہات میں گیا ہوا تھا، وہاں میں نے دیکھا کہ ایک شخص نے نیم کا درخت کاٹا اور اس کے بعد اس کے، تنہ کا چھلکا اتارنے لگا۔

آپ اس کا چھلکا کیوں اتار رہے ہیں، میں نے اس دیہاتی سے پوچھا۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا، اگر چھلکا نہ اتارا جائے تو اس کے اندر کیڑے لگ جائیں گے۔ اور لکڑی کو خراب کر دیں گے۔

یہ ۱۹۶۵ کی بات ہے، اگست ۱۹۵۷ میں دوبارہ مجھے ایک اور دیہات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ نیم کا تنہ کٹا ہوا پڑا ہے۔ ایک شخص نے اپنے گھر کے پاس نیم کا ایک درخت کاٹ دیا تھا، مگر اس کا چھلکا نہیں اتارا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے دس سال پہلے والی بات یاد آ گئی۔ میں نے سوچا کہ تجربہ کر کے دیکھوں، کہ اس کی بات صحیح تھی یا نہیں۔ میں نے اس کے گھر کے ایک آدمی سے کہا کہ کوئی اوزار لاؤ۔ اور اس کا چھلکا اتارو۔ جب اس نے چھلکا اتارا تو میں نے دیکھا کہ چھلکے کے نیچے ایک انچ کے موٹے، موٹے کیڑے ہیں۔ یہ کیڑے نہایت نرم تھے، مگر انھوں نے تنہ کی سطح کو جگہ، جگہ اس طرح کاٹ ڈالا تھا، جیسے اس کے اوپر نالیاں بنائی گئی ہوں۔

یہ قدرت کا نظام ہے، قدرت اس طرح سبق دیتی ہے، کہ اس دنیا میں تم کو نہایت محتاط رہ کر زندگی گزارنا ہے۔ کیونکہ دونی اکا نظام اس طرح بنایا گیا ہے۔ کہ یہاں ایک غلطی تمہاری ساری خوبیوں پر پانی پھیر سکتی ہے۔ ایک غفلت تمہارے سارے امکانات کو برباد کرنے کے لیے کافی ہے۔ قدرت یہ کر سکتی تھی کہ چھلکا اتارے بغیر نیم کے تنہ کو محفوظ رکھتی، مگر اس نے یہ قانون بنا دیا کہ اس کا مالک اس کا چھلکا اتارے، اس کے بعد ہی اس کا تنہ اس دنیا میں محفوظ رہ سکے گا۔

اس قانون قدرت کا انطباق اب انسانی زندگی میں دیکھیے۔ کیونکہ انسان کی دنیا میں

www.urdukitabain.blogspot.com

بھی وہی قانون رائج ہے، جو فطرت کی دنیا میں پایا جاتا ہے۔

۱۹۴۴ میں جون پور (یو، پی) کے دو آدمیوں نے مل کر کاروبار شروع کیا، ابتدائی سرمایہ ان لوگوں کے پاس چند سو سے زیادہ نہیں تھا، مگر ان کے مشترکہ کاروبار میں خدا نے برکت دی۔ اور چھ سال میں ان کے کاروبار کی حیثیت ۳۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ اب دونوں میں اختلاف شروع ہو گیا، اور نتیجہ علیحدگی تک پہنچا، ایک ثالث کے مشورے سے طے ہوا کہ کاروبار تقسیم نہ کیا جائے۔ بلکہ اس کی مالیت کا اندازہ کر کے بٹوارہ اس طرح ہو کہ، ایک شخص نصف کے بقدر رقم لے لے۔ اور دوسرے کو اثاثہ سونپ دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور ایک شخص کو مال و اسباب اور دوسرے کو نقد پندرہ ہزار دیے گیے۔ ۱۹۴۹ میں پندرہ ہزار روپے آج کی قیمت کے لحاظ سے کئی لاکھ کے برابر تھے۔ جس شخص نے نقد رقم لی تھی، اس نے جون پور کے بازار میں ایک دکان کھول لی، انھیں شروع ہی سے بڑا اچھا میدان ملا،

اور ایک سال میں ان کا سرمایہ دوگنا ہو گیا، اپنے کاروبار کے دوسرے سال میں وہ اس طرح داخل ہوئے کہ ان کے سامنے ترقی اور کامیابی کا ایک اور دروازہ کھل ہوا تھا۔

مگر اب ایک کمزوری نہایت آہستگی سے ان کے اندر داخل ہو گئی، وہ خرچ کے بارے میں لاپرواہ ہو گئے۔ اپنی ذات پر بیوی بچوں اور دوستوں پر ان کا خرچ بے حساب بڑھ گیا۔ وہ بھول گئے کہ دن بھر کی بکری سے ایک ہزار روپے جو ان کے گلہ میں آئے ہیں۔ ان میں سے صرف دس فی صد ان کا ہے۔ باقی ۹۰ فی صد مہاجن کا ہے۔ وہ اپنے گلہ کی رقم اس طرح خرچ کرنے لگے۔ گویا یہ سارا روپیہ ان کی آمدنی ہے، ٹھیک ویسے ہی، جیسے وکیل کی جیب میں فیس کی جو رقم آتی ہے۔ وہ سب اس کی آمدنی ہوتی ہے۔

دکان داری کے ساتھ اس قسم کی شاہ خرچی نہیں چل سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال میں وہ

دیوالیہ ہو گئے، ان کے پاس پندرہ ہزار میں سے ایک روپیہ بھی باقی نہ رہا۔

اس واقعہ کے بعد وہ تقریباً پندرہ سال تک زندہ رہے۔ مگر دوبارہ کوئی کام نہ کر سکے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ تم ایک چلہ دے دو، تو تمہارا کام بن جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کیا۔ مگر قانون قدرت کی تلافی چلہ سے نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ان کی حالت بگڑتی رہی، یہاں تک کہ پریشانی کے عالم میں وہ ۱۹۷۱ میں ایک جیپ سے ٹکرا گئے، اور سڑک پر ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

زندگی میں ایک غلطی بھی سارے امکان کو برباد کر دیتی ہے۔ اور آدمی کو تباہی کے آخری کنارے تک پہنچا دیتی ہے۔

یہی قاعدہ زندگی کے تمام معاملات کا ہے۔ یہاں ہر نیم کے ساتھ ایک کیڑا ہے، یہاں ہر معاملہ کے ساتھ ایک کمزوری لگی ہوئی ہے۔ آدمی کو ان کمزوریوں سے آخری حد تک محتاط رہنا ہے۔ وہ جس معاملہ میں بھی غفلت برتے گا، اس کی کمزوری اپنا کام کرے گی، اور اس کے سارے معاملہ کو بگاڑ کر رکھ دے گی،

نیم کے درخت کا مالک اگر کیڑے کے خلاف احتجاج کرے تو کبھی ایسا ہونے والا نہیں، کہ نیم کے تنہ میں کیڑے نہ لگیں۔ اس کیڑے کا وجود قانون قدرت کے اذن کے تحت ہے، اور جس چیز کے پیچھے، قانون قدرت کا اذن شامل ہو، اس کو ختم کرنا کسی بھی طرح ممکن۔

اسی طرح انسانی زندگی کے معاملات میں جو کیڑے لگتے ہیں، وہ بھی قانون قدرت کی بنا پر ہیں۔ وہ بہر حال باقی رہیں گے۔ ان کے خلاف احتجاج اور شکایت کا طوفان برپا کرنا سراسر لا حاصل ہے۔ ان کے مقابلہ میں ہم کو بچاؤ کی تدبیر تلاش کرنا ہے۔ نہ کہ ان کے خلاف احتجاجی نعرے لگانا،

بچاؤ یا تحفظ اس دنیا کا ایک مستقل اصول ہے۔ اس دنیا میں وہی لوگ زندہ رہ سکتے

ہیں۔ جو اپنے بچاؤ کا اہتمام کرتے ہوں۔ جو لوگ اپنے بچاؤ کی طرف سے غافل ہو جائیں، ان کے لیے خدا کی اس دنیا میں ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

اتھاہ امکانات

افغانستان کے سفر اکتوبر ۱۹۸۸ میں ایک دلچسپ چیز دیکھنے کو ملی، جو اس سے پہلے دیکھنے کو نہیں ملی تھی، اس کو عام زبان میں فش کہا جاتا ہے۔ یہ امریکی ساخت کے اس خطرناک ہتھیار کا توڑ ہے، جس کو اسٹنگر کا نام دیا گیا ہے،(Stinger) فش کا حربہ استعمال کرنے کو فشنگ کہتے ہیں،

افغانستان میں روسی فوجوں کے داخلہ کے بعد رسیوں اور افغان مجاہدین کے درمیان مستقل جنگ شروع ہو گئی ، افغان مجاہدین صرف زمینی طاقت کی حیثیت رکھتے تھے ،جب کہ روسیوں کا حال یہ تھا، کہ وہ ہیلی کاپٹر پر اڑ کر ان کے ٹھکانوں کو بم کا نشانہ بناتے تھے،

یہ بے حد نازک صورت حال تھی ، افغانی مجاہدین اگر چہ گن کے ذریعہ جہازوں کو مارنے کی کوشش کرتے تھے، مگر گن سے نکلی ہوئی گولی بالکل سیدھی جاتی تھی، اس لیے ایک ایسی چیز جو تیز رفتاری کے ساتھ فضا میں متحرک ہو، اس کو گولی کا نشانہ بنانا بے حد، دشوار ہے۔ چنانچہ افغانی مجاہدین کوشش کے باوجود روس کے بمبار جہازوں کو مارگرانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔

اس وقت امریکہ نے افغانی مجاہدین کو جدید قسم کا ایر کرافٹ میزائل سپلائی کیا، جس کو سٹنگر کہا جاتا ہے ، اب افغان مجاہدین کو روس کے بمبار جہازوں پر واضح بالا دستی حاصل ہوگئی، وہ جب بھی فضا میں روسی جہاز دیکھتے تو اس پر سٹنگر داغ دیتے ،اور سٹنگر پیچھا کر کے جہاز کو مارتا، کیونکہ اسٹنگر عام گولے کی طرح بالکل سیدھا نہیں جاتا۔ وہ جہاز کے رخ پر اپنا رخ بدلتا ہوا جاتا ہے۔ اور اس کو بہر حال مار کر رہتا ہے۔

پہلے اگر افغان مجاہدین دفاعی حیثیت میں تھے تو اب روسی فضایہ دفاعی حیثیت میں آگیا۔ مگر اس دنیا میں امکانات اتنے زیادہ ہیں، کہ کوئی بھی بڑی ایجاد اگلی زیادہ بڑی

ایجاد کے امکان کو ختم نہیں کرتی۔ چنانچہ روسیوں نے بہت جلد سٹنگر کا توڑ دریافت کر لیا، اسی توڑ کا نام فش ہے۔ روسیوں نے معلوم کیا کہ اسٹنگر کی تکنیک یہ ہے کہ وہ گرمی کی طرف بھاگتا ہے۔ چونکہ اسوقت فضا میں سب سے زیادہ چیز ہوائی جہاز کا انجن ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اس کا پیچھا کر کے انجن سے ٹکرا جاتا ہے۔ اس طرح وہ جہاز کو برباد کر دیتا ہے۔

روسیوں نے سٹنگر کے توڑ میں فش کو دریافت کیا۔ یہ خاص قسم کا کمیائی مادہ ہوتا ہے۔ جو ہوائی جہاز سے باہر آتے ہی جل اٹھتا ہے۔ اور تیز شعلہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس شعلہ کی گرمی ہوئی جہاز کے انجن کی گرمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے ہوائی جہاز کی طرف چلایا ہوا اسٹنگر ہوائی جہاز سے ٹکرانے کی بجائے شعلہ (فش) کی طرف جا گرتا ہے۔ اس طرح ہوائی جہاز اس کی زد سے بچ جاتا ہے۔

اس واقعہ میں ایک بےحد اہم نکتہ ہے، اور وہ ہے فریق ثانی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا ، مقابلہ کی اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں، جو فریق ثانی کی کمزوری کو دریافت کر سکیں، اور اس سے فائدہ اٹھانے والی، اہلیت کا ثبوت دیں۔

روسیوں نے اس معاملہ میں اسی اہلیت کا ثبوت دیا، انھوں نے اسٹنگر کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا، کہ وہ اپنے اندر انسانی عقل نہیں رکھتا، اس کی ضرب شعوری ضرب نہیں، وہ ایک میکانکی ضرب ہے، وہ ایک مادی چیز ہونے کی وجہ سے ہوائی جہاز کو نہیں جانتا، وہ گرمی کو نشانہ بنانا جانتا ہے، نہ کہ ہوائی جہاز کو، روسیوں نے جیسے ہی اس راز کو دریافت کیا، انھوں نے گویا آدھی جنگ جیت لی، اسٹنگر کے مقابلہ میں فش کا ستعمال اسی تدبیر کی ایک کامیاب مثال ہے،

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز کا توڑ ہے، یہاں خطرات کے مقابلہ میں ہمیشہ امکانات کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ بشرطیکہ مسائل پیش آنے کے بعد آدمی اپنی ہمت

نہ کھوئے، وہ خدا کی دی ہوئی عقل کو استعمال کرکے خطرہ کا توڑ دریافت کرسکے،

یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے۔ کہ ایک مشکل دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہیں آسکتی، یعنی اس دنیا میں اگر عسر (مشکل) ایک ہے تو اس کے مقابلہ میں یسر (آسانی) کی مقدار دوگنا ہے۔ یہاں اگر ایک راستہ میں رکاوٹ حائل ہوتی ہے۔ تو وہیں دوسرا راستہ آگے بڑھنے کے لیے کھلا ہوا ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں فریاد اور احتجاج نہ صرف بے فائدہ ہے، بلکہ وہ خود خدا کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ یہ خدا کی خدائی کی تصغیر ہے۔ فریاد و احتجاج کرنے والا شخص بیک وقت دو نقصان کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنی ناکامی کو دوبارہ کامیابی بنانے کے امکان کو استعمال کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ خدا کی نظر میں اس بات کا مجرم قرار پاتا ہے۔ کہ اس نے ایک کامل دنیا کو ناقص دنیا بنانے کی جسارت کی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا اتھاہ امکانات کی دنیا ہے۔ ماضی کی کوئی کوتاہی مستقبل کے مواقع کو برباد نہیں کرتی۔ دشمن کی کوئی کاروائی ایک نئی برتر کاروائی کے امکان کو ختم نہیں کرتی ہر نقصان کے بعد یہ موقع باقی رہ رہتا ہے۔ کہ آدمی ازسرنو کوشش کرکے، دوبارہ اپنے آپ کو کامیاب بنائے۔ آدمی کو چاہیے کہ پیچھے کی طرف دیکھنے کی بجائے آگے کی طرف دیکھے۔ وہ ہر کھونے کے بعد دوبارہ پانے کی کوشش کرے۔ وہ ہاری ہوئی بازی کو محنت اور عمل کے ذریعہ ازسرنو جیت لے۔

نمونہ کی اقلیت

ایشیای ملکوں کے جو لوگ امریکہ میں ہیں۔ان کو ایشیائی امریکی کہا جاتا ہے،یہ لوگ ۱۹۶۵ سے آ کر یہاں آباد ہونا شروع ہوئے۔وہ زیادہ تر چین کوریا،انڈو چائنہ،وغیرہ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ لوگ جب یہاں آئے تو ان کا یہ حال تھا کہ ان میں سے بہت سے لوگ انگریزی میں معمولی گفتگو بھی نہیں کر سکتے تھے۔آج وہ ریڈرس ڈائجسٹ کے مطابق

،امریکہ کے بہترین انگلش سکولوں میں اعلیٰ ترین طالب علم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ان کی تعداد اگر چہ مجموعی آبادی میں صرف دو فی صد ہے،مگر مختلف امریکی اداروں میں انھوں نے ۲۰ فی صد تک جگہ لینے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔وہ ہر جگہ زیادہ لائق ثابت ہو رہے ہیں۔

اس سورت حال نے امریکی دماغوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔چنانچہ اس پر باقاعدہ ریسرچ کی گئی،اس ریسرچ کی رپورٹ مختلف امریکی اور غیر امریکی جرائد میں شائع ہوئی ہے۔چند حوالے یہ ہیں۔

1,New YorkTimes ,August3,1986

2.Why Asian Americansare doingSo Well

Time .Magazine,New York,August 31,1987

3.Why Asian AmerIcans Students excel

Readers digest,August,1987

4.Why Asians Succ eed in AmerIca

spaln Momthly,Deccmber,1987

5.Among ,the,top ,6 sclence.of the united States

6. The Hindustan Times, New Delhi, August, 30, 1987,

عام امریکی نوجوانوں کے مقابلہ میں ایشیائی امریکی تعلیم کے ہر شعبہ میں آگے کیوں ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کوشش کی مقدار امریکی نوجوانوں سے بڑھی ہوئی ہے ۔ہارورڈ یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر جیروم کاگن سے پوچھا گیا، کہ کیا سبب ہے کہ ایشیائی امریکی طلبا اصل امریکی طلبا کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہیں۔ٹائم رپورٹ کے مطابق، انھوں نے کہا۔اس کا سیدھا سادا جواب ہے کہ وہ زیادہ محنت کرتے ہیں۔

یہ لوگ تعلیم کو اپنے لیے کامیابی کا ٹکٹ سمجھتے ہیں۔اور واقعی ہی امریکہ کا تعلیمی نظام ان کے لیے کامیابی کا یقینی ٹکٹ ثابت ہوا ہے۔اس ٹکٹ کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جو قیمت ادا کی ہے، وہ ایک لفظ میں امتیاز ہے۔

اپنے اس عمل میں انھوں نے امریکہ میں نمونہ کی اقلیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔تاہم امریکہ میں ان کے لیے راستہ بالکل کھلا ہوا نہ تھا ان کو نسلی امتیاز اور حقارت آمیز سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔امریکی نوجوان ان کا مذاق اڑاتے اور ان کو زرد خطرہ کہتے۔حتیٰ کہ جسمانی طور پر ان کو مارنے پیٹنے کے واقعات بھی ہوتے رہے۔مگر ایشیائی امریکنوں نے اس کے مقابلہ میں کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا، وہ شکایت اور احتجاج کے طریقے سے مکمل پرہیز کرتے رہے۔اس کے جواب میں انھوں نے جو کچھ کیا، وہ صرف یہ تھا کہ انھون نے اپنی محنت کی مقدار بڑھا دی۔ان کے والدین نے ان کے جذبات کو جوابی اشتعال سے بچایا، اور اس کو جوابی محنت کے رخ پر ڈال دیا۔ایشیائی خاندانوں میں تعلیم ایک قسم کا بوس بن کر چھا گئی، ایشائی امریکنوں کے گھروں کی فضا یہ ہوگئی کہ اگر ان کا لڑکا ۸۰ فی صد نمبر لائے تو وہ کہیں گے کہ تم ۸۵ فی صد کیوں نہیں لائے، اور

اگر لڑکا ۸۵ فی صد نمبر لائے تو اس کا باپ کہے گا، کہ تم ۹۰ فی صد بھی تو لا سکتے تھے۔

کسی گروہ کو مسائل کا سامنا ہو تو اس کے لیے اپنے مسائل کو حل کرنے کی دو صورتیں ہو نگی۔ایک وہ جس کا نمونہ ہم کو ہندوستان میں نظر آتا ہے۔یعنی مطالبہ اور احتجاج، اس طریق کار پر چلنے میں بیک وقت دو نقصانات ہیں۔ایک یہ کہ اصل مسئلہ حل ہونے کی بجائے اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔اس دنیا میں ہر چیز عمل کے ذریعہ ملتی ہے۔نہ کہ مطالبہ کے زریعہ، اور جو چیز عمل کے ذریعہ ملتی ہو اس کو مطالبہ کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا اس کو دور سے دور تر کر دینا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ ایسا گروہ دوسروں کی نظر میں بے عزت ہو جاتا ہے۔مطالبہ اور احتجاج کا مطلب اپنے مسائل کا بوجھ دوسروں پر ڈالنا ہے۔اور کون ہے جو اپنے مسائل کا بوجھ دوسروں کے اوپر ڈالنے کے بعد دوسروں کی نظر میں حقیر اور بے عزت نہ ہو جائے۔

اس کے بر عکس مثال امریکہ کے ایشیائی گروہ کی ہے، انھوں نے اپنے مسئلہ کا حل یہ دریافت کیا کہ وہ اس کی ساری ذمہ داری خود قبول کریں۔وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔اور آخری حد تک پر امن رہتے ہوئے دوسروں سے زیادہ محنت کریں۔ان کا تجربہ بتاتا ہے، کہ اس طرح عمل کرنیکے نتیجہ میں ان کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو گیا۔بلکہ انھوں نے اپنے عددی تناسب سے زیادہ بڑا، حصہ اپنے لیے پا لیا۔

منفی رویہ اختیار کرنا گویا اپنے مسئلہ کا بوجھ دوسروں کے سر پر ڈالنا ہے۔اور مثبت رویہ کا مطلب اپنے مسئلہ کی ذمہ داری خود قبول کرنا ہے۔اس لی یمثبت رویہا ختیار کرنے کا مزید یہ فائدہ ہوتا ہے کہ، ایسے لوگ سماج میں کوئی پیچیدگی پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتے، چنانچہ ایشیائی امریکنوں نے جب مثبت انداز سے اپنے مسئلہ کو حل کرنے کی راہ نکالی۔تو وہ امریکی سماج میں مزید فائدوں کو ظہور میں لانے کا سبب بن گئے۔

اول یہ کہ انھوں نے امریکی نوجوانوں کے درمیان مقابلہ و مسابقت کی فضا پیدا کی۔وہ

امریکی نوجوان جو اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کر محنت میں کمی کرنے لگے تھے ان کے اندر یہ جذبہ ابھر آیا کہ اگر انھیں زندہ رہنا ہے اور ترقی کرنا ہے تو ان کو بھی ایشیائیوں کی طرح زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔

ٹائم کی رپورٹ کے مطابق ،خود امریکی دانشوروں کو اعتراف کرنا پڑا، کہ ایشیائی امریکیوں نے ہمارے نوجوانوں کی سستی ختم کر دی ہے۔اور ان کو ازسر نو چست بنا دیا ہے۔ہمارے سماج میں ان کی موجودگی ہمارے لیے ایک عظیم رحمت ہے:

اسپان (دسمبر ۱۹۸۷) کی رپورٹ کے مطابق،نیویارک کے ایک درمیانی عمر کے آدمی نے کہا، کہ ایشیائی امریکنوں کے لیے خدا کا شکریہ،وہ ہمارے سکولوں میں دوبارہ معیار کو واپس لا رہے ہیں۔

Thank God for the Asian.They are Bringing,backStandards to our,School.(p,32)

2۔ایشیائی امریکی گروہ کو دوسرا فائدہ یہ ملا کہ جب انھوں نے معاشی عزت حاصل کی تو ان کی تہذیب بھی لوگوں کی نظر میں باعزت بن گئی۔ان کی قومی روایات امریکیوں کی نظر مین محترم بن گئیں۔یہ ایشیائی لوگ کنفیوشش کو اپنا مذہبی پیشوا مانتے ہیں۔جب ایشیائی امریکیوں کی ایک قابل تعریف خصوصیت امریکہ والوں کے سامنے آئی تو انھون نے ان کی اس خصوصیت کو ان کے قومی بزرگ کنفیوشش سے جوڑ دیا۔ایشیائی امریکیوں کے ممتاز عمل نے امریکیوں کی نظر میں ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو قابل توجہ بنا دیا۔اسپان کی رپورٹ کے مطابق ،نیو یارک یونیورسٹی کے پریسیڈنٹ نے کہا، کہ جب میں اپنے ایشیائی طلبہ کو دیکھتا ہوں،تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ ان کی زیادہ تر کامیابی کنفیوشش کی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔

ایشیائی مہاجرین کا مقابلہ جہاں عام امریکیوں سے پیش آتا ہے۔وہ ان کے مقابلہ

میں زیادہ لائق ثابت ہوتے ہیں۔اس طرح وہ عام امریکیوں کے لیے ایک مہمیز یا چیلنج بن گئے۔وہ امریکی نوجوانوں میں محنتکانی اجذبہ ابھارنے کا ذریعہ ثابت ہورہے ہیں۔ایشیائی مہاجرین نے مثبت طور پر اپنا ذاتی مسئلہ حل کیا تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی سماج کا اپنا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔

ایشیائی مہاجرین نے امریکہ میں صرف ایک نسل کے اندروہ کامیابی حاصل کی ہے ،جس کو عام طور پر لوگ تین نسلوں میں حاصل کرتے ہیں۔ان کی اس غیر معمولی کامیابی نے امریکہ میں ایک نئی اصطلاح پیدا کی ہے۔جس کوایشیائی اخلاقیات عمل کہا جاتا ہے۔اب وہاں کہا جانے لگا ہے کہ اگر اعلیٰ ترقی حاصل کرنا ہو ہےتو ایشیائی اخلاقیات عمل کواختیار کرو۔

یہی دروازہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بھی زیادہ بڑے پیانے پرکھلا ہوا ہے۔مسلمان اگران قومی جھگڑوں کوچھوڑ دیں۔جن میں ان کے سطحی لیڈروں نے انھیں بے فائدہ طور پر الجھارکھا ہے۔اوروہ اسلام کے دیئے ہوئے ابدی اصولوں پر اپنی زندگی کی مثبت تعمیر شروع کردیں تواس ملک میں وہ ایک نئے انقلاب کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔اس طرح مسلمان نہ صرف اپنا مسئلہ حل کریں گے بلکہ وہ اس ملک کونیا معیاردیں گے۔جس کوایک لفظ میں مسلم اخلاقیات عمل کہا جاسکتا ہے۔اور جب ایسا ہوگا تو مسلمان اس ملک میں سرمایہ بن جائیں گے۔جو کہ اس وقت ملک کےلیے صرف ایک بوجھ بنے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان ابھی تک تہذیبی تشخص حاصل کرنے کے لیے مطالباتی تحریک چلانے میں مشغول رہے ہیں۔میرے نزدیک اس قسم کی تمام کوششیں سراسر بے فائدہ ہیں۔کیونکہ تہذیبی تشخص اپنی داخلی قوت سے حاصل ہوتا ہے۔وہ مطالبہ کرکے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مسلمان اخلاقی تشخص کو اپنا نشانہ بنائیں۔ وہ اسلامی اخلاق اختیار کرنے کو اپنا نشان امتیاز قرار دیں۔ مسلمان اگر اخلاقی حیثیت سے بھی اپنے آپ اپنا تشخص پالیں گے۔ جس کے لیے وہ بے فائدہ طور پر مطالباتی مہم چلانے میں مشغول ہیں۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

حل رخی پالیسی

موجودہ سال کا غالباً سب سے اہم واقعہ سویت روس اور امریکہ کی وہ مفاہمت ہے۔جس کو ٹائم نے بجا طور پر عظیم اتحاد کا نام دیا ہے۔سویت روس اور امریکہ دونوں دنیا کی سب سے بڑی طاقت شمار ہوتے ہیں۔پچھلے ۷۰ سال سے دونوں کے درمیان سخت رقابت جاری تھی۔دونوں ایک دوسرے کے خلاف ٹکراؤ کی پالسی پر قائم تھے۔دونوں ملکوں کے پریس اور میڈیا کا یہ کام تھا کہ ایک دوسرے پر الزام لگائیں۔اور ایک دوسرے کی مذمت کرتے رہیں۔مگر لمبے تجربے کے بعد، اب دونوں ٹکراؤ کے بجائے صلح کی باتیں کر رہے ہیں۔وہ ہتھیاروں کی دوڑ کی بجائے بات چیت کی دور پر اپنی توجہ لگائے ہوئے ہیں۔وہ رقابت کے طریقہ کو چھوڑ کر مفاہمت کے طریقہ کو اپنا رہے ہیں۔

سویت روس کے ایک ذمہ دار نے اس نئی پالیسی کو حل رخی پالیسی کا نام دیا ہے، اس سے پہلے دونوں کی توجہ اگر اس پر جمی ہوئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو غلط ثابت کریں تو اب انھوں نے اس قسم کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ اس پر لگا دی ہے کہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔یہ واقعہ جو سویت روس اور امریکہ کے درمیان پیش آیا ہے۔اس میں دوسری قوموں کے لیے ایک بہت بڑا سبق ہے۔موجودہ زمانے میں اختلاف اور ٹکراؤ کی پالیسی اتنا مہنگا سودا بن چکی ہے کہ بڑی طاقتیں بھی اس کا تحمل نہیں کر سکیں۔پھر چھوٹی قومیں کیوں کر اس تباہ کن مشغلہ کا تحمل کر سکتی ہیں۔

حقیقت پسندی کی طرف

نکیتا خروشچوف ۱۹۵۸۔۱۹۶۴) تک روس کے وزیر اعظم تھے، انھوں نے سرمایہ دار دنیا کو خطاب کرتے ہوئے کہا (ہندوستان ٹائمس ۲۸ جون ۱۹۸۸) ہم تم کو دفن کر دیں گے:

اسی طرح امریکہ کے پریزیڈنٹ رونالڈ ریگن نے ۱۹۸۳ میں سویت روس کو شیطانی سلطنت قرار دیا تھا۔ امریکی افسروں کا کہنا تھا کہ ہم اشتراکی روس کو سمندر میں دھکیل دیں گے۔ مگر اشتراکی انقلاب کے ستر سال بعد ۱۹۸۸ میں آخر کار دونوں ملکوں کو اپنا ذہن بدلنا پڑا روس کے لیڈروں نے گفت وشنید کے لیے امریکہ جانا شروع کیا۔ رونالڈ ریگن نے خود ماسکو کا دورہ کیا، (۲۸ جون تا ۲ جولائی ۱۹۸۸) جس کو وہ اس سے پہلے خارج از امکان سمجھتے تھے۔ دورے سے پہلے واشنگٹن میں انھوں نے کہا (ہندوستان ٹائمس ۲۶ مئی ۱۹۸۸) کہ ماسکو کے ساتھ امریکہ کا تعلق حقیقت پسندی کے تحت قائم ہونا چاہیے۔

چالیس سال سے دونوں ملکوں کے درمیان ہتھیاروں کی دوڑ جاری تھی، دونوں ملک ایک دوسرے کو برباد کرنے کے لیے تاریخ کے خطرناک ترین ہتھیار بنانے میں مشغول تھے مگر آج وہ اپنے بنائے ہوئے ہتھیاروں پر خود ہی پابندی لگا رہے ہیں حتیٰ کہ اس کو ضائع کر رہے ہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۳، اگست، ۱۹۸۸) سکشن ۲، صفحہ ۱ پر خبر ہے جس کی سرخی یہ ہے۔

(سویت روس اپنے چار میزائل کو خود برباد کرتا ہے۔) خبر میں بتایا گیا ہے کہ ۲ اگست ۱۹۸۸ کو سویت روس نے سریوزیک میں چار چھوٹی رینج کے میزائل برباد کر دیئے۔ یہ واقعی مختلف ملکوں کی موجودگی میں ہوا۔ جن میں ہندوستان اور امریکہ کے مشاہدین بھی شامل تھے۔ میزائل کے خاتمہ کا یہ عمل اس معاہدہ کے تحت کیا گیا۔ جو ریگن اور گوربا

چوف کے درمیان ہوا۔

معاہدہ کے تحت سویت روس اگلے تین سال میں اپنے ۱۷۵۲ میزائل کو ضائع کرے گا، جن کا رینج ۵۰۰ کلومیٹر سے لے کر ۵۵۰۰ کیلومیٹر تک ہے۔ امریکہ حسب معاہدہ اپنے اسی قسم کے ۸۹۵ میزائل کو ضائع کرے گا،

روس اور امریکہ کی پالیسی میں اس ڈرامائی تبدیلی کا راز یہ ہے کہ ہتھیار سازی اور عسکری فوقیت حاصل کرنے کی کوشش میں دونوں ملکوں کی ترقی رک گئی۔ ایک دوسرے کے خلاف ہتھیاروں کی دوڑ اور ایک دوسرے کے خلاف مذمت رخی پالیسی میں نصف صدی کی مدت گزارنے کے بعد ان پر کھلا کہ اس منفی طریق کار سے وہ کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔

جب کہ دوسرے کی کاٹ کی کوشش میں دونوں نے خود اپنے آپ کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا۔ چنانچہ اب انھوں نے سابقہ پالیسی کو ترک کرکے حل رخی پالیسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

امریکہ اور روس

امریکہ نے اپنی ساری طاقت جنگی مشین تیار کرنے میں لگا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے اقتصادی میدان میں خود اپنے مفتوحہ ملک جاپان سے بھی پیچھے ہو گیا۔ امریکہ آج سب سے بڑا قرض دار ملک ہے۔ اس کے اوپر ۴۰۰ بلین ڈالر کا خارجی قرضہ ہے۔ جب کہ جاپان آج سب سے بڑا دائن ملک ہے۔ اس نے دنیا کو ۲۴۰ بلین ڈالر قرض دے رکھا ہے۔ امریکی ڈالر جو پچھلی نصف صدی سے اقتصادی دنیا کا شہنشاہ بنا ہوا تھا۔ اس کی یہ حیثیت بری طرح مجروح ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ یہ سوال اٹھایا جانے لگا کہ کیا امریکہ اپنی بڑی طاقت کی حیثیت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ تفصیل کے لیے: ٹائم ۴ جولائی ۱۹۸۸)

ڈاکٹر ہنری کسینجر نے ایک انٹرویو میں کہا کہ نئی بنیادی حقیقت یہ ہے کہ عالمی سطح پر کچھ نئی طاقتیں ابھری ہیں۔ مثلاً چین اور ہندوستان، جاپان دن بدن زیادہ سے زیادہ طاقت ور ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں امریکہ کو دوسرے ملکوں کو نظر انداز کرنے کی پالیسی کو چھوڑنا پڑے گا۔ امریکہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ نئے طاقتی مراکز کے ساتھ موافقت کرے:

۱۹ ویں آل سویت روس پارٹی کانفرنس جون ۱۹۸۸ کے آخری ہفتہ میں ماسکو میں ہوئی۔ جس میں پورے ملک سے پانچ ہزار ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ اس موقع پر روسی وزیر اعظم گورباچوف نے ساڑھے تین گھنٹے کی تقریر کی۔ اس طویل تقریر میں انھوں نے شدت سے خود تنقیدی کی وکالت کی۔ ان کی اس تقریر کا متن ٹائمس آف انڈیا ۲۹ جون ۱۹۸۸ کے صفحہ ۱۱ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

مسٹر کونٹن پیل ایک اخبار نویس کی حیثیت سے خود ماسکو کی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ انھوں نے روسی لیڈروں کی تقریریں سنیں اور ان سے ملاقاتیں کیں۔

انھوں نے روسی وزیر اعظم مسٹر گوربا چوف کی ساڑھے تین گھنٹے کی تقریر کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

پیغام بظاہر بالکل سادہ تھا کمیونسٹ پارٹی کو انتظامیہ اور اقتصادیات اور ملک کے اوپر اپنے سخت کنٹرول کو چھوڑنا ہوگا۔ طاقت اور استحقاق پر پابندی لگانا ہوگی۔ سائنس اور محرک کو آگے بڑھانا ہوگا، اگر سویت یونین کو بقیہ دنیا کا مقابلہ کرنا ہے، سپر پاور کی حیثیت و برقرار رکھنا تو درکنار۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

پرسترائیکا

ان حالت نے روسی وزیر اعظم مسٹر میخائل گورباچوف کو مجبور کیا کہ وہ حقیقت کا اعتراف کریں۔انھوں نے اشتراکی برتری کا نظام ترک کرتے ہوئے روس میں تبدیلیاں لانے کی ایک نئ مہم شروع کر دی۔جس کو وہ دو لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ایک گلاس ناسٹ (Glass nost)یہ ایک روسی لفظ ہے جس کے معنے کشادگی کے ہیں۔دوسرے پرسترائیکا۔اس کا مطلب روسی زبان میں تنظیم نو ہے۔پرسترائیکا ک ینام سے مسٹر گورباچوف کی ایک کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔جس کا نام انگریزن زبان میں اس طرح ہے (Perestroika New Thinking (For our Country and the world.

اس تحریک کے تحت روس کے سابق اشتراکی ڈھانچہ میں انقلابی تبدیلیاں لائی جارہی ہیں۔اس میں مذہبی آزادی سے لے کر اپنے روائتی دشمن امریکہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات تک شامل ہیں۔اس سلسلہ میں نہایت سبق آموز رپوورٹیں اخبارات میں شائع ہوئیں۔ان میں سے ایک رپورٹ وہ ہے جو لاس اینجلس اور واشنگٹن نیوز سروس کے تحت اخبرات میں آئی ہ ے۔ہندوستان ٹائمس (۱۶ جنوری ۱۹۸۸) نے اس کو مسٹر رائے گٹ مین کے نام سے شائع کیا گیا ہے اس کا عنوان حسب ذیل ہے:((Kremlin White House now realistic P.20

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ حالیہ واقعات کے بعد روس اور امریکہ کے تعلقات میں ا یک تاریخی تغیر آیا ہے۔دونوں ملکوں میں نئ سوچ پیدا ہوئی ہے۔کریملن اور وائیٹ ہا ؤس دونوں ایک دوسرے کے معاملے میں حقیقت پسند بن رہے ہیں۔یہ رپورٹ ہم یہاں علحیدہ صفحہ پر نقل کر رہے ہیں۔

روس کے ڈپٹی وزیر خارجہ جو اپنے ملک کے سفیر کی حیثیت سے ۱۲ سال تک امریکہ میں

رہ چکے ہیں۔ انھوں نے نیوز ڈے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا، کہ دونوں ملکوں میں نئی سوچ پیدا ہوئی ہے۔ دونوں کے تعلقات میں ڈرامائی تبدیلی اور تاریخی فرق آرہا ہے۔ امریکی ذمہ دار اس سے پہلے کہا کرتے تھے کہ ہم کمیونزم کے پھیلاؤ کو روک دیں گے۔ ہم ان کو سمندر میں غرق کردیں گے۔ مگر اب انھوں نے جان لیا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ اس سے پہلے یہ دونوں ملک ایک دوسرے کی مذمت اور کاٹ میں لگے رہتے تھے۔ مگر یہ پالیسی سراسر بے فائدہ رہی۔ اب دونوں طرف سے لوگ حقیقت پسند بن رہے ہیں۔ اب ہماری ٹیم اور ان کی ٹیم دونوں حل رخی ذہن رکھنے والے ہیں۔

پروسترائیکا کے مقاصد اور نشانے کیا ہیں۔ اس کی وضاحت مسٹر گورباچوف نے مخصوص اشتراکی زبان میں اس طرح کی ہے۔ اور زیادہ جمہوریت، اور زیادہ سوشلزم، محنت کش انسان کے لیے، اور زیادہ بہتر زندگی قوم کے لیے اور زیادہ عظمت و رفعت، اور ثروت، مگر حقیقت یہ ہے کہ پرسترویکا، سوشلزم سے واپسی ہے، نہ کہ سوشلزم کی طرف اگلا قدم۔ کیونکہ مارکس اور لینن کی تشریح کے مطابق سوشلزم کی ترقی سرمایہ داری کی موت پر ہونے والی تھی۔ سوشلزم کی ہر پیش قدم سرمایہ دارانہ نظام کی پسپائی کے ہم معنی تھی۔ مگر آج سویت روس، گورباچوف کی قیادت میں سرمایہ دارانہ نظام سے مفاہمت کر رہا ہے۔ بلکہ وہ اس کی قدروں کو اپنے یہاں رائج کرنے میں ترقی اور خوش حالی کا خواب دیکھ رہا ہے۔

پرستویکا سوشلزم کے اصولوں کی صداقت کا ثبوت نہیں ہے۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دنیا میں کامیابی حقیقتوں کے اعتراف کے بغیر ممکن نہیں۔ ریگن کے الفاظ میں، اس زمین پر ہمیں تمام اچھے اور برے لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔ حقیقت پسندی اور مفاہمت ہی اس دنیا میں ترقی اور کامیابی کا راز ہے۔

نتیجہ بحث

روس اور امریکہ کے تعلقات میں یہ تبدیلی بلا شبہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ جدید تاریخ کے اس واقعہ میں بہت بڑا اسبق ہے۔ یہ واقعہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ موجودہ زمانے میں ٹکراؤ کی پالیسی آخری حد تک اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔ اپنے حریف پر الزام لگانا، اس کی کاٹ میں لگے رہنا، اس کے ساتھ مقابلہ آرائی کرنا، روس اور امریکہ جیسی طاقتوں کے لیے بھی سراسر بے فائدہ ہے۔ کجا کہ دوسری کمزور قومیں اس قسم کی منفی پالیسی اختیار کرکے کسی واقعی نتیجہ کی امید رکھیں۔

خواہ فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا معاملہ، دونوں کے لیے مسئلہ کا حل اسی طریق کار میں ہے۔ اس دنیا میں عقل مندی اسی میں ہے کہ آدمی دوسرے کی تخریب کرنے کی بجائے، اپنی تعمیر میں لگ جائے۔ مسئلہ کو لے کر اس کے نام پر چیخ و پکار کرنا۔ یا حریف کے مقابلہ میں لڑائی چھیڑنا، صرف اپنے وقت اور قوت کو ضائع کرنا ہے۔ اس کے سوا اس کا کوئی انجام نہیں، ایک لفظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی اور کامیابی کا راز، حل رخی پالیسی میں ہے۔ نہ کہ مذمت رخی پالیسی میں۔

یہ اسلام نہیں

ایک مقام پر رمضان کے زمانہ میں فساد ہو گیا۔وہاں کے ایک صاحب سے میری ملاقات ہوئی میں نے اس واقعہ کی تفصیل پوچھی۔انھوں نے بتایا کہ رات کا وقت تھا،مسلمان مسجد میں تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے۔اتنے میں سڑک سے شوروغل سنائی دیا۔معلوم ہوا کہ دوسری قوم کے لوگوں کی شادی پارٹی گزر رہی ہے۔اور جگہ ،جگہ رک کر گاتی بجاتی ہے۔

اس وقت کچھ مسلمان مسجد سے نکل کر باہر سڑک پر آئے ،اور جلوس والوں سے کہا کہ آپ مسجد کے پاس شور نہ کریں،کیونکہ مسجد کے اندر ہماری نماز ہو رہی ہے۔مگر وہ لوگ نہیں مانے۔اس پر تکرار شروع ہوئی،یہاں تک کہ بڑھتے ،بڑھتے فساد ہو گیا۔

میں نے کہا کہ یہ تو آپ لوگوں کا طریقہ ہے۔اب میں آپ کو بتاتا ہوں۔کہ اس معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کا طریقہ کیا تھا۔میں نے کہا آپ جانتے ہیں کہ ابتدائی زمانہ میں مکہ اور بیت اللہ پر مشرکین کا قبضہ تھا۔وہ لوگ رسول اللہ اور آپ کے اصحاب کو طرح ،طرح سے ستاتے تھے۔اسی میں سے ایک یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب جب بیت اللہ میں جاتے تو وہ لوگ وہاں آکر شوروغل کرتے،وہ سیٹی بجاتے اور تالیاں پیٹتے،اور کہتے کہ یہ ہماری عبادت کا طریقہ ہے۔قرآن میں بتایا گیا ہے۔

اور بیت اللہ کے پاس ان کی نماز،اس کے سوا کچھ نہ تھی ،کہ سیٹی بجانا اور تالی پیٹنا،تو اب عذاب چکھو اپنے انکار کی وجہ سے۔

اس آیت کی تشریح میں چند مفسروں کے حوالے یہ ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا کہ مکہ کے مشرکین اپنے رخسار زمین پر رکھتے ،اور تالی بجاتے ،اور سیٹی بجاتے۔وہ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کو گڈمڈ کر

www.urdukitabain.blogspot.com

دیں۔ اور زھری نے کہا کہ وہ مسلمانوں کا مذاق اڑانے کے لیے ایسا کرتے تھے۔ وہ بیت اللہ کا ننگے طواف کرتے۔ اور وہ انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر سیٹی بجاتے اور تالیاں بجاتے تھے، وہ ایسا اس وقت کرتے تھے جب کہ مسلمان نماز پڑھتے ،تا کہ ان کی نماز کو گڑبڑ کردیں۔

حضرت سعید نے کہا کہ قریش طواف کے وقت رسول اللہ ﷺ کے سامنے آتے۔ وہ آپ کا مذاق اڑاتے وہ سیٹی بجاتے، اور تالی بجاتے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مسجد حرام میں نماز پڑھتے تو آپ کے دائیں طرف دو آدمی کھڑے ہو جاتے، اور دونوں سیٹی بجاتے، اور دو آدمی آپ کے بائیں طرف کھڑے ہو جاتے اور تالیاں بجاتے ،تا کہ آپ کی نماز کو گڈمڈ کردیں۔

رسول اللہ ﷺ مکہ میں تیرہ سال رہے، وہاں مسلسل آپکے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا رہا۔ جس کا ذکر اوپر کے اقتباسات میں آیا ہے۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ اس کے خلاف کوئی احتجاج کرتے۔ یا کوئی جوابی کاروائی کرتے، آپ اس قسم کی باتوں پر یک طرفہ طور پر صبر کرتے رہے، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس زمانہ میں اہل ایمان کی ایک تعداد جمع ہوگئی تھی۔ یہ لوگ نہایت بہادر اور جانثار تھے۔ مگر ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں کو لے کر مشرکوں پر ہجوم کریں، یا ان کو شوروغل سے روکنے کے لیے کوئی جوابی عملی کاروائی کریں،

مشرکوں کے شوروغل پر آپ کا چپ رہنا، خوف کے تحت نہیں تھا، بلکہ منصوبہ کے تحت تھا۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ یہاں ایک کام کو کرنے کے لیے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ آپ خدا کے پیغام کی پیغام رسانی کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے آپ نے ضروری سمجھا کہ لڑائی جھگڑے اور ٹکراؤ والی باتوں سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ مشرکین کی ان تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف دعوت و تبلیغ کی

محنت میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ نے حالات میں تبدیلی فرمائی۔ اس کے بعد مشرکین کا شور ختم ہو گیا اور خود مشرکین بھی۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مسجد کے اندر گھس کر شور وغل کیا جاتا تھا۔ تب بھی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب نیاس کے خلاف کوئی جوابی کاروائی نہیں کی۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ مسجد کے قریب کوئی جلوس شور وغل کرتا ہوئے گزرے تو وہاں سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، اگر اسلام وہ ہے جو رسول اللہ نے کیا تو مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں وہ اسلام نہیں، اور اگر اسلام وہ ہے جو آج کل کے مسلمان کر رہے ہیں۔ تو رسول اللہ نے جو کچھ کیا، وہ اسلام نہیں تھا۔ اب مسلمانوں کو اختیار ہے۔ کہ وہ دونوں میں سے جس بات کو اپنے لیے چاہیں اپنے لیے پسند کر لیں۔

حقیقت پسندی

ٹائم میگزین (۱۳ فروری ۱۹۸۹) کے سر ورق پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ دوبارہ ساتھی :۔ جیسا کہ معلوم ہے، چین اور روس اگر چہ دونوں کمیونسٹ ملک ہیں ، مگر ان کے درمیان کم از کم تیس سال سے باہمی رقابت چلی آرہی تھی ۔ اب دونوں ملک ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ ٹائم کے مذکورہ شمارہ میں اسی کو کور سٹوری بنایا گیا ہے۔ اندر مضمون کے اوپر اس کی سرخی یہ ہے کہ ایک شگاف کی مرمت، عدوات کا دور ختم ہو رہا ہے ۔

چین اور روس کے درمیان ۴۵۰۰ سو میل کی مشترک سرحد ہے ۔ مگر پچھلے تین دہوں سے دونوں کے درمیان تعلقات خراب تھے ۔ سابق روسی وزیر اعظم نیکتا خروشچیف نے ۱۹۵۹ میں امریکہ سے واپس ہوتے ہوئے چین میں مختصر قیام کیا تھا۔ اور ماوزی تنگ سے ملاقات کی تھی جو نا خوشگواری پر ختم ہوئی تھی ۔ اس کے بعد دونوں ملکوں کا کوئی ذمہ دار شخص ایک ملک سے دوسرے ملک میں نہیں گیا۔ شدید دشمنی کے لمبے وقفہ کے بعد فروری ۱۹۸۹ میں پہلی بار سوویت روس کے وزیر خارجہ نے چینی راجدھانی بیجنگ کا سفر کیا۔ اس سفر کا مقصد امن اور ترقی بتایا گیا تھا۔ اس سفر میں جو باتیں ہوئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ روسی وزیر اعظم میخائل گوربا چوف جلد ہی چین کا دورہ کریں گے ۔ (ٹائم آف انڈیا ۱۳ فروری ۱۹۸۸) ۔

دو حریف ملکوں میں اس خلاف توقع تبدیلی کے بارہ میں ایک چینی آفیسر نے کہا کہ بیجنگ اور ماسکو کو اس وقت جن مشکلات کا سامنا ہے ، اس نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے ۔

ایک روسی افسر نے یہی بات زیادہ کھل کر ان لفظوں میں کہی ۔ کہ ہم اس مشترک سوچ کے بہت قریب آچکے ہیں، کہ کس طرح دونوں ملکوں میں نئے تعلقات قائم کیے

جائیں۔ ہم دونوں ہی نے ماضی میں غلطیاں کی ہیں۔

چین اور روس نے جب دیکھا کہ ان کی باہمی دشمنی ایک دوسرے کو نقصان پہنچا رہی ہے تو دونوں نے طے کیا کہ وہ بے فائدہ دشمنی کو ختم کر کے آپس میں دوستانہ تعلقات قائم کر لیں۔ اس نئے فیصلہ تک پہنچنے کے لیے انھیں اپنی ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف اپنے مطالبات کو چھوڑ دینے پر راضی ہوئے۔ انھوں نے ایک ناقابل برداشت چیز کو برداشت کیا۔ تاکہ اپنے لیے زیادہ بہتر مستقبل کی تعمیر کر سکیں۔ اسی کا نام حقیقت پسندی ہے۔ اس حقیقت پسندی کے بغیر موجودہ دنیا میں کامیابی تک پہنچنا ممکن نہیں۔

امریکہ اور روس اور چین موجودہ دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور قومیں ہیں۔ جب طاقتور قوموں کا یہ حال ہے، کہ حقیقت پسندی اور مفاہمت کے سوا ان کے لیے زندگانی کا کوئی طریقہ نہیں۔ تو کمزور قومیں کیوں کر ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کر کے زندہ رہ سکتی ہیں۔ ایسی حالت میں کمزور قوموں کے لیے حقیقت پسندی اور مفاہمت کا طریقہ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ جتنا طاقتور قوموں کے لیے۔

ایک تقابل

لارڈ میکالے (T.B Macaulay) ۱۸۳۴ میں ہندوستان آیا۔ سپریم کونسل آف انڈیا کے ایک اہم ممبر کی حیثیت سے اس نے وہ تعلیمی نظام شروع کیا جو بالآخر، انگریزی نظام تعلیم کے نام سے پورے ملک میں رائج ہو گیا، اس نظام تعلیم کا مقصد میکالے کے الفاظ میں یہ تھا کہ اس کے ذریعہ سے ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو پیدائش کے اعتبار سے ہندوستانی مگر خیالات کے اعتبار سے انگریز ہو:

مسلمانوں کے تمام بے ریش اور باریش لیڈر (سرسید کے واحد استثنا کو چھوڑ کر) اس نظام تعلیم کے خلاف ہو گئے۔ وہ اس کی مخالفت میں تقریریں کرنے لگے۔ کسی نے اس کو قتل گاہ کہا۔ کسی نے اس کے اوپر یہ شعر چسپاں کیا:

بچوں کے کبھی قتل سے بدنام نہ ہوتا۔۔۔ افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی۔

بیشتر لوگوں نے اس تعلیمی نظام میں شرکت نہیں کی، جو لوگ اس میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ درمیان ہی میں اس کو چھوڑ کر اس سے الگ ہو گئے۔ اس مخالفانہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسری قوموں سے کم از کم دو سو سال پیچھے رہ گئے۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ ان کی یہی پسماندگی ہے۔ کیونکہ تعلیم سے محرومی انسان کو بے شعور بناتی ہے۔ اور جو لوگ بے شعور ہوں ان کے لیے اس دنیا میں بربادی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

اب ایک اور تصویر دیکھئے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ۱۹۴۵ میں جاپان کو امریکہ کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اس کے بعد امریکہ سیاسی، فوجی، انتظامی، ہر اعتبار سے جاپان پر قابض ہو گیا۔ اس شکست کے بعد جاپان نے اپنے آپ کو مکمل طور پر امریکہ کی ماتحتی میں پایا۔ امریکہ نے اس کے بعد جاپان کو جبری طور پر غیر مسلح کر دیا۔ جاپان کے نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں۔ دسمبر ۱۹۴۵ میں امریکی جنرل میکارتھ

www.urdukitabain.blogspot.com

رنے تعلیمی انتظام کے متعلق وہ بنیادی ہدایات جاری کیں۔ جن کا خاص مقصد جاپان میں عسکریت کو اور جاپانی عوام کے قوم پرستانہ جذبہ کو ختم کرنا تھا،

جنگ کے زمانے میں بہت سے ٹیچر ملازمت سے سبکدوش کردیے گئے، مذہب اور سیاست کو مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا، شنٹو تعلیمات کو نصاب سے مکمل طور پر خارج کر دیا گیا، ان تبدیلیوں کا مقصد یہ تھا کہ جاپان کی جدید نسل کو امریکہ کی پسند کے مطابق بنائی جائے ۱۹۴۶ میں امریکہ کے تعلیمی ماہرین کی ایک ٹیم باقاعدہ منصوبہ کے تحت جاپان پہنچی، اس امریکی ٹیم نے ایک رپورٹ تیار کی جس کا نام حسب ذیل تھا۔

یہ رپورٹ گویا ان ہدایات کی عملی تفصیل تھی، جن کو جنرل میکارتھر نے جاپان کی وزرات تعلیم کے نام جاپان کے مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے جاری کیا تھا۔ ۱۹۴۷ میں جاپان کا بنیادی تعلیمی قانون اور اسکولی تعلیم کا قانون اسی کی مطابقت میں واضع کیا گیا، ۱۹۴۸ میں جاپان کا تعلیم بورڈ بنایا گیا جس کا کام گویا اس بات کی نگرانی کرنا تھا کہ جاپان کا تعلیمی نظام امریکہ کی پسند کے مطابق جاری رہے۔ اس طرح جاپان میں سکول، کالج، اور یونیورسٹیوں کی سطحوں پر جو نظام تعلیم رائج ہوا وہ مکمل طور پر اس نظام کی نقل تھا، جو امریکہ میں پہلے سے چل رہا تھا۔

جاپانیوں نے ہندوستان کے مسلم رہنماؤں کے برعکس امریکہ کے اس منصوبہ کو تعلیمی استعمار بتاکر اس کے خلاف احتجاج اور بائیکاٹ کی تحریک نہیں چلائی۔ انھوں نے ایک دن ضائع کیے بغیر اپنی پوری نسل کو اس امریکی تعلیمی نظام میں داخل کر دیا۔

اب اس واقعہ پر تقریباً نصف صدی پوری ہو رہی ہے، اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ امریکہ کے اس تعلیمی نظام میں جو لوگ پڑھ کر نکلے۔ وہ پورے معنوں میں جاپانی تھے، وہ کسی بھی اعتبار سے جاپانی نہ بن سکے، جیسا کہ امریکہ انھیں

بنانا چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ انھوں نے امریکہ کی تمام امیدوں کے خلاف جاپان میں ایک نیا انقلاب پیدا کردیا۔ انھوں نے جاپان کی ایک نئی تاریخ پیدا کردی۔ انھوں نے ترقی کا ایک ایسا سیلاب جاری کیا جس کے بہاؤ میں خود امریکہ بھی ٹھہر نہ سکا، انھوں نے جاپان کو قوموں کے درمیان اعلیٰ ترین صفوں میں کھڑا کردیا۔

یہی موجودہ دنیا میں ترقی کا راز ہے، یہاں کامیابی اور ترقی اس کے لیے ہے جو ناموافق صورت حال کو موافق صورت میں تبدیل کر سکے۔ جو دشمن کے مخالفانہ منصوبوں کو اپنے لیے مفید خوراک بنا لے، جو اپنے نہیں کو اپنے ہے میں تبدیل کرنے کی اہلیت کا ثبوت دے۔ جو لوگ اس برتر صلاحیت کے حامل ہوں۔ وہی مقابلہ کی اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جو لوگ اس امتحان میں ناکام ہو جائیں۔ ان کے لیے اس دنیا میں اس کے سوا اور کچھ مقدر نہیں کہ تاریخ کے کوڑا خانہ میں پڑے ہوئے دوسروں کے خلاف

احتجاج کرتے رہیں۔ ایسا احتجاج جس کو سننے کے لیے کوئی دوسرا وہاں موجود نہ ہو

اس معاملہ میں جس طرح ہمارے ملک کا سیکولر طبقہ ناکام ثابت ہوا ہے۔ اسی طرح اسلام پسند طبقہ بھی ناکام ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اکبر الہ آبادی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، جیسے لوگوں نے انگریزی دور کی تعلیم گاہوں کو قتل گاہ بتایا، اور ایک پوری نسل کو اس سے روکنے کی کوشش کی،

یہ احمقانہ حد تک بے معنی بات تھی۔ اسلام پسند رہنماؤں کے کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ وہ مسلم نوجوانوں میں یہ شعور پیدا کریں، کہ وہ انگریزی تعلیم گاہوں سے تعلیم کو لیں اور اس کی انگریزیت کو چھوڑ دیں۔ مگر اپنی سطحی فکر کی بنا پر انھوں نے منفی انداز اختیار کیا ۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی ایک پوری نسل تعلیمی اعتبار سے تباہ ہو گئی۔ اس معاملہ میں جاپان کے اہل کفر ہندوستان کے اہل ایمان سے زیادہ عقلمند ثابت ہوئے۔

اعلیٰ کامیابی

۷۸۔۱۹۸۶ کے سول سروس کے امتحانات میں ابتدائی جانچ میں پورے ملک سے تقریباً ۹۴ ہزار امیدوار شریک ہوئے، ان میں سے صرف دس ہزار، امیدواروں کو تحریری امتحان میں حصہ لینے کا اہل قرار دیا گیا، اس مرحلہ کے بعد سترہ سو امیدواروں کو انٹرویو کے لیے چنا گیا۔ انٹرویو کے بعد جن امیدواروں کو آخری طور پر اعلیٰ ملکی ملازمتوں کا اہل قرار دیا گیا۔ ان کی تعداد ۸۵۵ تھی۔

ان امتحانات کے آخری نتیجہ کا اعلان ۸ جون ۱۹۷۸ کے اخبارات میں شائع ہوا۔ اس کے ساتھ کامیاب ہونے والوں کی فہرست بھی شامل تھی، اس وقت لوگوں نے دیکھا کہ اتنی لمبی فہرست، اور اتنی طویل جانچ کے بعد سارے ملک سے جو لوگ سول سروسز کے اہل قرار دیئے گئے۔ ان میں سب سے پہلا نام عامر سبحانی کا ہے۔ اس اعلیٰ ملکی امتحان میں عامر سبحانی نے ٹاپ کیا تھا، یہ تنہا واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس ملک میں اعلیٰ ترین کامیابی کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ کوئی تعصب یا کوئی جانبداری ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔

ہندوستان کی کل آبادی میں مسلمان تقریباً ۱۲ فی صد ہیں۔ اس نسبت سے ۸۵۵ کی فہرست میں کم از کم ایک سو مسلمانوں کا نام ہونا چاہیے تھا، مگر عملاً صرف گیارہ مسلمان کامیاب ہونے والوں کی فہرست میں شامل ہو سکے ہیں۔ عام طور پر مسلمان یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اس کی وجہ تعصب ہے، مگر سول سروس کے امتحانات کے طریقے پر غور کریں۔ تو یہ بات بالکل بے بنیاد ثابت ہوگی۔

سول سروس کے تحریری امتحانات میں جواب کی کاپیوں پر امیدواروں کے نام لکھے ہوئے نہیں ہوتے، بلکہ صرف کوڈ نمبر درج ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں ممتحن کے لیے یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں کہ امیدوار کا تعلق کس فرقہ سے ہے۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ

www.urdukitabain.blogspot.com

انٹرویو کا ہے۔ انٹرویو بورڈ پانچ سے سات ممبران پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر ممبر اپنے مضمون کا اکسپرٹ ہوتا ہے۔ اگر یہ ممبر متعصب اور تنگ نظر ہوں تو کوئی مسلمان نہ آئی ،اے،ایس میں چنا جائے اور نہ ٹاپ کر سکے۔

تاہم اگر بالفرض ان میں کسی درجہ میں تعصب کا وجود فرض کیا جائے۔ تب بھی ان کا تعصّب اس معاملہ میں فیصلہ کن نہیں بن سکتا۔

اس کی وجہ ان امتحانات کا نظام ہے۔ تحریری امتحانات پورے ۱۸۰۰ سو نمبر کے ہوتے ہیں۔ جب کہ انٹرویو میں صرف ۲۵۰ نمبر ہوتے ہیں۔ اب اگر بالفرض تعصب کی بنیاد پر کسی امیدوار کے ساتھ انٹرویو میں زیادتی ہوتی ہے تو محض انٹرویو میں اچھے نمبر نہ لینے پر اس کو نا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بشرطیکہ اس نے تحریری امتحان کے پرچوں میں اچھے نمبر حاصل کیے ہوں۔ کیونکہ جب امیدواروں کی آخری فہرست بنائی جاتی ہے۔ تو تحریری امتحانات اور انٹرویو دونوں میں حاصل کردہ نمبروں کو یکجا کر کے شمار کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ صرف انٹرویو میں حاصل کردہ نمبر کی بنیاد پر فیصلہ کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک سبق آموز بات یہ ہے کہ عامر سبحانی نے تحریری امتحانات میں مجموعی طور پر ۶۴ فی صد نمبر حاصل کیے ہیں۔ جب کہ انٹرویو میں ان کو ۷۴ فی صد نمبر ملے ہیں۔ یعنی انٹرویو میں دس فی صد زیادہ۔

مسٹر سبحانی سے پوچھا گیا، کہ انھوں نے سول سروس کے امتحان کے لیے کس طرح تیاری کی تھی۔ اس کے بارے میں بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ چھ مہینہ تک وہ روزانہ ۱۲ سے ۱۴ گھنٹے تک مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ اس سے پہلے بھی انہیں آدھی رات تک پڑھنے کی عادت تھی۔ وہ نصابی کتابوں کے علاوہ، انڈین اینڈ فارن، ریویو، یوجنا، اور انڈیا ٹوڈے کا برابر مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے علاوہ، وہ دہلی سے نکلنے والے کئی انگریزی اخبارات کو پوری طرح روزانہ پڑھتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر سبحانی کی غیر معمولی کامیابی کا راز غیر معمولی محنت ہے۔ وہ اپنی محنت کی وجہ سے میٹرک سے لے کر ایم، اے تک ہمیشہ امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے۔ ان سے پوچھا گیا، کہ وہ اپنے تجربہ کی روشنی میں آئی، اے، ایس، کے امتحان میں شریک ہونے والے نوجوانوں کو کیا مشورہ دیتے ہیں، انھوں نے کہا سخت محنت اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی پوری جدوجہد۔ (۸ جون ۱۹۸۷ کے انگریزی اخبارات، نئی دنیا، ۳۰ جون ۱۹۸۷ بلٹز ۱۵، اگست ۱۹۸۷ء)

ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے عمل کے دو میدان ہیں۔ ایک مطالبہ اور احتجاج کا میدان، دوسرا محنت اور جدوجہد کا میدان۔ ہمارے لیڈر پہلے میدان میں سرگرمی کی علامت ہیں۔ اور عامر سبحانی جیسے دوسرے میدان میں سرگرمی کی علامت ہیں۔ ہمارے تمام لیڈر پچھلی نصف صدی سے ٹکراو کے راستے پر چل رہے ہیں۔ وہ فریق ثانی کو ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف لامتناہی احتجاج کی مہم جاری کیے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہماری قوم میں عامر سبحانی جیسے افراد بھی ہیں۔ جنھوں نے فریق ثانی سے نظریں ہٹا کر اپنی محنت پر بھروسہ کیا، وہ اپنے ذاتی امکانات کو بروے کار ، لانے میں منہمک ہو گئے۔

اب عملی نتیجہ کے اعتبار سے دیکھیے تو لیڈر صاحبان کا طریقہ امت مسلمہ کے لیے سراسر بے نتیجہ ثابت ہو رہا ہے۔ اس راستہ سے ملت کو ایک فی صد بھی کوئی مثبت فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اس کے برعکس جو لوگ عامر سبحانی کے طریقہ پر چلے، وہ ہمیشہ کامیاب رہے۔ ان کی کوششوں سے ہمیشہ مثبت نتیجہ برآمد ہوا۔

یہ دو قسم کی مثالیں واضح طور پر بتا رہی ہیں۔ کہ مسلمانوں کو اس ملک میں کیا کرنا چاہیے ،انھیں لیڈروں کے بتائے ہوئے طریقہ کو بالکل چھوڑ دینا چاہیے۔ اور عامر سبحانی والے طریقہ کو مکمل طور پر اختیار کرنا چاہیے۔ یہی واحد راستہ ہے جس پر چل کر مسلمان

کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

اس سبق میں کیا ہے

مولانا اکرام الدین قاسمی (پیدائش ۱۹۳۸) ڈمرواں ضلع بھاگل پور کے رہنے والے ہیں۔ ۷ فروری ۱۹۹۰ کی ملاقات میں انھوں نے اپنے کچھ واقعات بتائے ہیں۔ جن میں بہت بڑا سبق ہے،

۱۹۶۶ کا واقعہ ہے، مولان اکرام الدین صاحب نے سٹیمر سے گنگا کو پار کیا۔ وہ برابری ریلوے اسٹیشن پر بھاگل پور جانے والی پسنجر ٹرین پر سوار ہو گئے۔ ٹرین میں بھیڑ تھی، ایک جگہ سیٹ پر ڈالڈا کا ڈبہ رکھا ہوا تھا، وہ ڈبہ کو کھسکا کر وہاں بیٹھ گئے۔

تھوڑی دی ربعد ایک ہندو نوجوان وہاں آیا۔ یہ ڈبہ اسی کا تھا، وہ اس کو سیٹ پر رکھ کر باہر چلا گیا تھا، جب اس کو اندازہ ہوا کہ ڈبہ اپنی جگہ سے ہٹایا گیا ہے تو اس نے پوچھا کہ اس کو کس نے ہٹایا ہے۔ مولانا اکرام الدین نے کہا کہ میں نے ہٹایا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ سخت غصہ ہو گیا۔ کیونکہ اس کے عقیدہ کے مطابق ایک مسلمان نے اس کو چھو کر گندہ کر دیا تھا، اس نے کہا کہ اس ڈبہ میں گنگا جل تھا، اس کو لے کر میں دیو گھر جا رہا تھا، اس کو تم نے اپوتر کر دیا ہے۔ اب وہ لے جانے کے قابل نہیں رہا۔

وہ غصے میں آپے سے باہر تھا، اور نہایت گرم اور اشتعال انگیز لہجہ میں بار، بار کہہ رہا تھا۔ کہ تم نے میرے گنگا جل کو اپوتر کر دیا ہے۔ مولانا اکرام الدین صاحب نیان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا، وہ خاموشی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور سیٹ نوجوان کے لیے خالی کر دی۔ انھوں نے کہا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ اس میں گنگا جل ہے۔ اور وہ میرے چھونے سے اپوتر ہو جائے گا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی مجھے معاف کر دو۔

ہندو نوجوانان کے خلاف برستا رہا اور وہ خاموشی سے کسی ردعمل کے بغیر اس کو سنتے رہے۔ یہ منظر دیکھ کر ڈبے کے تمام ہندو اس نوجوان کے خلاف ہو گئے۔ اور مولانا اکرام الدین صاحب کی حمایت کرنے لگے۔ انھوں نے نوجوان سے کہا کہ مولانا

جب چپ ہیں، اور اپنی غلطی مان رہے ہیں تو تم کیوں ان کے خلاف اتنا زیادہ چیخ رہے ہو۔ انھوں نے مولانا سے کہا کہ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ یہ آپ کا کچھ نہیں کر سکتا۔

آخر کار ہندو نوجوان چپ ہو گیا۔ مولانا صاحب اپنی جگہ برابر کھڑے رہے۔ کچھ دیر کے بعد نوجوان نے بے رخی سے پوچھا، کہ آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کھڑک بازار سے، اس وقت مولانا اسی مقام پر رہتے تھے۔ نوجوان نے کہا کہ کھڑک بازار میں ایک مولانا اکرام الدین صاحب رہتے ہیں، کیا آپ ان کو جانتے ہیں۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میری ماں ان کے پاس گئی تھی اور ان سے ایک تعویذ لائی تھی۔ اس تعویذ سے بہت فائدہ ہوا۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔

مولانا اکرام الدین نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ابھی تو وہ سفر میں ہیں کل تک پہنچ جائیں گے۔ اس وقت ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ ہندو نوجوان نے پوچھا آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ سفر میں ہیں۔ انھوں نے جواب دیا جس مسافر سے تم بات کر رہے ہو،،،،،، وہی مولانا اکرام الدین ہیں۔ یہ سنتے ہی ہندو نوجوان نے مولانا کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس نے کہا مجھے چھما کر دیجیے۔ مجھ سے بہت بھاری غلطی ہو گئی، اس غلطی پر جی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو مار لوں، وہ نوجوان اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اصرار کر کے مولانا کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا، اس کے بعد وہ آخری اسٹیشن تک کھڑا رہا، اگلے اسٹیشن پر جب دونوں اترے تو نوجوان نے اصرار کر کے مولانا کو ناشتہ کرایا۔

مولانا صاحب نے اس طرح کیا ور کئی واقعات سنائے، اور کہا کہ ہندوں میں ہم نے جو اخلاق پایا ہے۔ وہ اخلاق ہم نے موجودہ مسلمانوں میں نہیں پایا۔

مولانا اکرام الدین نے اس طرح اور کئی واقعات سنائے، اور کہا ہندوں میں ہم نے

جو اخلاق پایا ہے وہ اخلاق ہمنے موجودہ مسلمانوں میں نہیں پایا۔

اسی طرح انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۲ میں، میں تراویح پڑھانے کے لیے بنگلور گیا ہوا تھا، ایک روز میں ہگنو ریکورم ہی بذریعہ اسکوٹر جا رہا تھا۔ راستہ میں میرے اسکوٹر کا پٹرول ختم ہوگیا۔ کچھ دیر تک میں اسکوٹر کو دھکیل کر لے گیا۔ پھر سڑک کے کنارے ایک ناریل کا باغ دکھائی دیا۔ جس کے اندر ایک کار کھڑی تھی، باغ کے اندر ایک ہندو بیٹھا تھا، مجھے دیکھتے ہی اپنے نوکر سے کہا کہ کرسی لاؤ۔ مجھے کرسی پر بیٹھا کر پوچھا حضرت کیا کام ہے۔ میں نے کہا میری گاڑی میں پٹرول ختم ہوگیا ہے۔ یہاں سے آٹھ کلومیٹر دور جانے پر مجھے پٹرول مل سکے گا۔ میں کار دیکھ کر یہاں آگیا کہ شائد یہاں سے مجھے پٹرول مل جائے۔

مذکورہ ہندو نے فوراً اپنے ڈرائیور سے کہا کہ دیکھو اگر باہر پٹرول ہو تو اس کو حضرت کی گاڑی میں ڈال دو اور اگر باہر نہ ہو تو اپنی گاڑی سے پٹرول نکال کر ان کو پٹرول دے دو۔ پٹرول لینے کے بعد میں نے اپنی جیب سے بیس روپے کا نوٹ نکالا۔ تاکہ پٹرول کی قیمت ادا کروں۔ اب ہندو فوراً ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا، اس نے کہا ہم کو معاف کیجیے، پیسہ کی ضرورت نہیں ہم کو صرف آپ کی دعا چاہیے۔

انسان کو ناراض نہ کیجیے، اور اگر کسی وجہ سے وہ غصہ ہو جائے تو جوابی غصہ نہ کر کے اس کو ٹھنڈا کر دیجیے، اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ جس کو آپ اپنا دشمن سمجھ رہے تھے، وہ آپ کے لئے ایسا ہوگیا جیسے کہ وہ آپ کا قریبی دوست ہو۔

ہر آدمی خدا کا بنایا ہوا ہے، اس دنیا میں کوئی آدمی ایسا نہیں جس کو خدا کے علاوہ کسی اور نے پیدا کیا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر وہی فطرت ہے جو کسی دوسرے کے اندر ہے ہر آدمیکے اندر اچھے برے کی وہی تمیز ہے جو کسی دوسرے کے اندر پائی جاتی ہے۔

تاہم ہر آدمی کے اندر انا (ایگو) بھی موجود ہے۔یہی انا ساری خرابیاں پیدا کرتا ہے ۔مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے ہر آدمی کی انانیت کو اس کے اندر سلا، رکھا ہے ۔ہر آدمی کی انا ابتدائی طور پر حالت خواب میں ہے۔آپ کی عقلمندی یہی ہے کہ اس انا کو سویا رہنے دیں۔اس کو کبھی بیدار نہ کریں۔

جب آدمی کی انا سو رہی ہو تو وہ حالت فطری میں ہوتا ہے۔اس وقت وہ وہی کرتا ہے جو سچی انسانیت کا تقاضا ہے،کوئی آدمی صرف اس وقت برا بنتا ہے جب اس کی انانیت کو جگا دیا جائے۔عقل مند آدمی کو چاہیے کہ وہ دوسروں کی انا کو جگانے سے آخری حد تک پرہیز کرے۔اور بالفرض اگر کسی کی انا جاگ جائے تو پہلی فرصت میں اپنے حکیمانہ رویہ سے اس آگ کو بجھا دے۔

جو لوگ عقلمندی کی اس روش کو اختیار کرلیں،ان کو کبھی دوسرے سے شکایت نہ ہوگی،خواہ وہ ایک ملک میں رہتے ہوں یا کسی دوسرے ملک میں۔

راز حیات

جاپان کے لوگ اپنے آپ کو سورج دیوتا کی اولاد سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی نسل دوسر نسلوں سے برتر ہے۔ انھیں حق ہے کہ وہ دوسری قوموں پر برتری حاصل کریں۔ اس ذہن نے ان کے لیے یہاں اس نعرے کی صورت اختیار کی، کہ مشرقی ایشیا جاپان کے لیے:

جاپانی قوم کا یہ ذہن اس کی قدیم تاریخ میں اس کو متشدد بنائے ہوئے تھا۔ خاص طور پر ۱۹۳۷ سے لے کر ۱۹۴۵ تک وہ اپنے اس خود ساختہ حق کے لیے دوسری قوموں سے لڑتے رہے۔ اس جنگ میں انھیں ابتداً کامیابی بھی ہوئی، مثلاً انھوں نے ۱۹۴۲ میں منیلا پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح سنگاپور، نیدرمینڈ اور رنگون ان کے قبضہ میں آ گیا۔ مگر آخر کار انھیں زبردست شکست ہوئی۔ مزید پانے کی کوشش میں انھوں نے ملے ہوئے کو بھی کھو دیا۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکہ اور جاپان ایک دوسرے کے حریف تھے۔

جاپان ک یپاس سادہ بم تھے، امریکہ نے اس کے مقابلہ میں جوہری بم تیار کر لیا۔ اب دونوں کے درمیان طاقت کا توازن ٹوٹ گیا، جولائی ۱۹۴۵ میں امریکہ نے جاپان کے اوپر دو ایٹم بم گرائے، جاپان کی فوجی طاقت تہس نہس ہو گئی۔ امریکہ کو جیت ہوئی اور جاپان کے لیے اس کے سوا کوئی صورت باقی نہ رہی کہ وہ اپنے لیے اس حیثیت کو قبول کر لے، جس کو ایک مبصر نے ذلت آمیز ہتھیار ڈالنے سے تعبیر کیا تھا۔ (ٹائم ۱۳، اپریل ۱۹۸۷ صفحہ ۱۵)

اب جاپان نے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا۔ ۱۴، اگست ۱۹۴۵ کو شاہ جاپان ہیرو ہیٹو نے قوم کے نام ایک ریڈیائی پیغام نشر کیا۔ جس میں کہا گیا تھا، کہ ہم نے طے کیا ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے عظیم امن کی بنیاد رکھیں گے۔ اور اس مقصد کے لیے

www.urdukitabain.blogspot.com

نا قابل برداشت کو برداشت کریں، اور اس چیز کو سہیں جو سہنے کے قابل نہیں۔

اس فیصلے کے مطابق جاپان نے ۲ ستمبر ۱۹۴۵ کو اپنی شکست کے کاغذات پر دستخط کر دیے۔ اس نے جاپان کے اوپر امریکہ کی بالادستی قبول کر لی۔

جاپان کے لیے یہ فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ جاپانی قوم اب تک ذاتی برتری کے احساس پر کھڑی تھی۔ اب اس کو حقیقت پسندی کے احساس پر کھڑا ہونا پڑا۔ اب تک وہ بیرونی مخالف جذبات میں جی رہی تھی۔ اب اس کو خود احتسابی کے جذبات میں اپنے لیے زندگی کا راز دریافت کرنا تھا۔ اس وقت جاپان کی صورت حال یہ تھی کہ اس کی صنعتیں برباد ہو چکی تھیں۔ جنگی مجرم جنرل میکارتھر کو معاہدہ کے خلاف جاپان پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ کوریا، برما، سنگاپور، تائیوان، اور دوسرے بیرونی مقبوضات کے علاوہ، خود اپنے ملک کے کئی علاقے اس نے کھو دیے تھے، مثلاً جزیرہ کرافوتو، اوکی ناوا وغیرہ۔ ۱۹۴۶ میں میکارتھر، کانسٹیٹیوشن جاپان میں نافذ کیا گیا۔ جو بیرونی طاقت کی طرف سے ایک مفتوح قوم کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں رکھنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

یہ سب چیزیں بلاشبہ نا قابل برداشت کو برداشت کرنے کے ہم معنی میں تھیں۔ چنانچہ جاپان کے بہت سے لوگ اس کو برداشت نہ کر سکے، اور اس غم میں انھوں نے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ فوجی انتہاپسندوں نے اس بات کی کوشش کی۔ کہ قوم کے نام شاہ جاپان کے ریڈیائی پیغام کو نشر نہ ہونے دیں۔ اور جب وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے تو متعدد قوم پرستوں اور فوجی افسروں نے بے عزتی کے احساس کے تحت خود کشی کر لی۔

جاپان نے حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے لیے نمبر ۲ کی حیثیت کو قبول کر لیا، تاہم اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے دوسری حیثیت پر راضی ہو

گئے۔اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ طاقتور فریق سے ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے اپنے لیے تعمیر نو کا وقفہ حاصل کرنا۔اس پالیسی کے تحت جاپان نے یہ کیا کہ اس نے سیاسی اور معاشی اعتبار سے امریکہ کی بالادستی کو تسلیم کرلیا۔

اوراپنی تمام توجہات سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں موڑ دیں۔یہ عمل جاری رہا ۔یہاں تک کہ تیس سال میں تاریخ بدل گئی۔فوجی اعتبار سے زیردست جاپان نے اقتصادی اعتبار سے بالادست جاپان کی حیثیت حاصل کرلی۔جاپان نے الیکٹرانکس اور دوسرے شعبوں میں اتنی اعلیٰ درجہ کی مصنوعات تیار کیں۔کہ خود امریکہ کے لوگ اپنے ملک کی چیزیں چھوڑ کر جاپان کی چیزیں خریدنے لگے۔کیونکہ وہ کوالٹی میں امریکہ سے بہتر تھیں۔اور قیمت میں امریکہ سے کم،اس صورت حال نے امریکی مدبرین کو سخت پریشان کردیا۔امریکہ کے ایک سیاسی مدبر مسٹر پیٹ ولسن،نے کہا کہ جاپان کے الیکٹرک سامان ٹوکیو کے سوا ہر ایک کو برباد کررہے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان امریکہ کا مقروض ہوگیا تھا،اب خود امریکہ جاپان کا مقروض بننے لگا۔۱۹۸۶ میں امریکہ کا جو سامان جاپان میں آیا،اس کی قیمت ۲۶ بلین ڈالر تھی،اس کے مقابلہ میں جاپان کا جو سامان امریکہ گیا۔اس کی قیمت ۸۵ بلین ڈالر ہے۔اس طرح امریکہ اور جاپان کے درمیان تجارتی توازن ٹوٹ گیا۔۱۹۸۶ میں جاپان کا ٹریڈ پلس ۸۵ بلین ڈالر سے زیادہ تک پہنچ گیا تھا۔امریکہ آج دنیا کا سب سے بڑا مقروض ملک ہے اور جاپان دنیا کا سب سے بڑا مہاجن ملک ہے۔(ٹائم ۱۳ ،اپریل،۲۶اپریل ۱۹۸۷)

اس صورت حال پر آج کل کثرت سے کتابیں شائع ہورہی ہیں۔امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے جاپان نمبر ایک،یہ کتاب اس وقت امریکہ میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب بنی ہوئی ہے۔۱۹۴۵ میں جاپان نے امریکہ کے مقابلہ میں

نمبر ۲ کی حیثیت منظور کر لی تھی۔ ۴۰ سال بعد خود امریکہ کو اعتراف کرنا پڑا کہ جاپان دوبارہ نمبر ایک کا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

جاپانیوں نے اپنے ہاتھ سے جاپان نمبر ۲ کی کتاب لکھی۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ دوسرے لوگ ان کے بارہ میں ایسی کتاب لکھیں، جس کا نام جاپان نمبر ایک ہو۔ یہی موجودہ دنیا کا قانون ہے، یہاں جو لوگ ہار مان لیں، وہی جیتتے ہیں۔ یہاں جو لوگ پیچھے ہٹنے پر راضی ہو جائیں۔ وہی دوبارہ اگلی صف میں جگہ پاتے ہیں۔

تعمیر کی طاقت

مئی ۱۹۹۰ کا واقعہ ہے۔ کراچی کی ایک سڑک پر دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ زخمی ہو رہے ہیں۔ لاشیں زمین پر پڑی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ کلاشنکوف کے ذریعہ مہاجرین اور سندھیوں میں فائرنگ کے تبادلے ہو رہے ہیں، پولیس کے افراد بھی خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔

اتنے میں سائرن کی آواز آتی ہے۔ جلد ہی ایک ایمبولینس گاڑی سڑک پر دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے، جیسے ہی ایمبولینس گاڑی سامنے آتی ہے دونوں طرف کے لوگ اپنی، اپنی فائرنگ روک دیتے ہیں، ایمبولینس کھڑی ہوتی ہے۔ اس کے آدمی مردہ لاشوں کو اور زخمیوں کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں رکھتے ہیں۔ اس پوری کاروائی کے دوران لڑائی بند رہتی ہے۔ جب ایمبولینس چلی جاتی ہے تو دوبارہ وہی لوگ اس طرح لڑنا شروع کر دیتے ہیں، جیسے کہ وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوں۔

یہ کراچی کے عبدالستار ایدھی (۶۱ سال) ہیں انھوں نے اپنی ۳۰ سالہ بے غرضانہ خدمت سے لوگوں کے اندر اتنا احترام پیدا کیا کہ جہاں وہ پہنچ جائیں، وہاں لوگوں کے سر ان کے آگے جھکنے پر مجبور، ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ لوگ فسادی اور دہشت گرد، کیوں نہ ہوں،

عبدالستار ایدھی کی تعلیم صرف چھٹے درجہ تک ہو سکی، ۱۹۴۷ میں وہ جونا گڑھ سے نقل وطن کر کے پاکستان چلے گئے۔ وہاں وہ حصول معاش کے لے معمولی کام کرتے رہے، پھر انھوں نے دیکھا کہ پاکستان میں ایمبولینس سروس بہت کمزور ہے۔ ان کے اندر خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہوا۔ انھوں نے قرض اور چندہ کی مدد سے ایک پرانا ٹرک خریدا، اور اس کے اوپر پردہ لگا کر ایمبولینس کے طور پر استعمال کرنے لگے۔

زخمیوں اور مریضوں کو اسپتال لے جانا اور لاوارث لاشوں کو قبرستان پہنچانا، اس قسم

www.urdukitabain.blogspot.com

کے رفاہی کاموں میں وہ سرگرم ہو گئے۔ان کے خلوص اور محنت کو دیکھ کر لوگوں نے تعاون کرنا شروع کیا۔انھوں نے مزید ایمبولینس گاڑیاں خریدیں، یہاں تک کہ اب ان کے پاس ۴۵۰ گاڑیوں کا دستہ ہے۔جو سب کی سب سائرن وائرلیس، گیس سلنڈر وغیرہ سے آراستہ ہیں۔ان کے علاوہ انھوں نے دو ہیلی کاپٹر خریدے تاکہ دور تک ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کر سکیں۔

اسی کے ساتھ انھوں نیا ہسپتال، زچہ گھر، یتیم خانے اور مختلف قسم کے رفاہی ادارے قائم کیے۔اب انھوں نے گیارہ ایکڑ کی ایک زمین حاصل کی ہے۔یہاں وہ اپنے تمام شعبے قائم کریں گے۔اسی کے ساتھ اس کے اندر ہیلی کاپٹر کو ٹھہر انے اور اتارنے کا میدان بھی بنایا جائے گا۔

۳۰ سال پہلے عبدالستار ایدھی کی مفلسی کا یہ عالم تھا کہ ان کی ماں بیمار ہوئی تو ان کے پاس نہ دوا لانے کے پیسے تھے نہ اہسپتال لے جانے کا دھن، ان کی ماں نہایت تکلیف کی حالت میں مرگئی۔مگر ماں کی موت نے ان کو ایک نئی زندگی دے دی۔اس سے ان کو سخت جھٹکا لگا۔انھوں نے سوچا کہ اسی طرح کتنے غریب ہوں گے جو تکلیف میں تڑپتے ہوں گے مگر کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔

انھون نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرورت مندوں کی مدد کے لیے خدمت خلق کا ایک ادارہ قائم کریں گے، ۳۰ سال پہلے انھوں نے یہ ادارہ نہایت معمولی حالت سے شروع کیا، آج وہ اتنا بڑھ چکا ہے۔کہ اس کا سالانہ بجٹ بارہ کروڑ روپیہ ہے۔جس شخص کا حال یہ تھا کہ مرض الموت میں مبتلا اپنی ماں کی دوا خریدنے کے لیے، اس کے پاس پیسے نہ تھے، وہ آج اپنے مرکز میں ۷۰۰ سو آدمیوں کے لیے کھانا اور کپڑا فراہم کر رہا ہے۔

عبدالستار ایدھی کو عالمی انعام دیا گیا، امریکہ کے کثیر الاشاعت ماہنامہ ریڈرس

ڈائجسٹ (جون ۱۹۸۹) نے ان کے بارہ میں ایک تعریفی مضمون شائع کیا۔جس کا خلاصہ الرسالہ (فروری ۱۹۹۰) میں آچکا ہے۔نئی دہلی کے انڈیا ٹوڈے نے سات صفحہ کی ایک باتصویر رپورٹ شائع کی، ہے ان کا عنوان یہ ہے۔۔پاکستان کا فادر ٹریسا:

تعمیری کام اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔اگر آپ واقعی معنوں میں کسی تعمیری کام کا نمونہ پیش کر دیں تو تمام لوگ آپ کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔حتیٰ کہ آپ کے کٹر مخالفین بھی،

عبدالستار ایدھی کے لیے ایک نمونہ وہ بھی تھا، جو سطحی لیڈروں نے ہندوستاں اور پاکستان دونوں جگہ پیش کیا۔یعنی نظام کے خلاف نعرہ، اور جھنڈا کی سیاست لے کر کھڑے ہو جانا۔وہ تیسرے درجہ کا ایک اخبار نکالتے اور موٹی، موٹی سرخیوں کے ساتھ عوام کی مصیبت کی داستانیں چھاپنا شروع کر دیتے۔وہ حکومتی اداروں سے مطالبات کی مہم چلاتے۔وہ غصہ میں بھرے ہوئے نوجوانوں کی ایک بھیڑ جمع کرتے جو احتجاج کے نام پر بسیں جلاتا۔اور ہسپتالوں میں آگ لگاتا۔

اسی طرح عبدالستار ایدھی کے لیے ایک نمونہ وہ تھا، جو نام نہاد اسلام پسندوں نے پیش کیا ہے۔وہ اسلامی نظام قائم کرو کے نعرہ کے ساتھ سڑکوں پر نکل آتے۔وہ عوام اور حکومت کے درمیان نفرت اور کشاکش کا ماحول بناتے جو موجودہ اسلام پسندوں نے مجرمانہ طور پر ہر جگہ بنا رکھا ہے۔

عبدالستار ایدھی اگر اس قسم کے طریقے اختیار کرتے، تو وہ اپنے ملک کے مسائل کو حل کرنے کے نام پر صرف اس کے مسائل میں اضافہ کرتے۔اس کے برعکس انھوں نے فیصلہ کیا، کہ وہ خود اس مسلہ کو حل کرنے کی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ان کا کام خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو، مگر وہ خود اپنے آپ سے عمل کا آغاز کریں گے۔

عبدالستار ایدھی کے اس فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۰ برس بعد انھوں نے پاکستان میں ایک

ایسی تعمیری تاریخ بنائی، جس کا ہندوستان سے لے کر امریکہ تک اعتراف کیا جا رہا ہے۔ جب کہ اسی مدت میں اسی ملک کے رہنما بربادی اور تاریخ کے سوا کوئی اور تاریخ نہ بنا سکے۔

THE END---ختم شد---

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

www.urdukitabain.blogspot.com

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006